کتاب نما کا خصوصی شمارہ

ڈاکٹر خلیق انجم

شخصیت اور ادبی خدمات

مرتب : ایم حبیب خان

ماہنامہ کتاب نما، جامعہ نگر، نئی دھلی

Title By : Ghulam Mustafa Daaim
PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

ڈاکٹر خلیق انجم

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ

ایم۔ حبیب خاں

ماہنامہ کتاب نما، جامعہ نگر۔ نئی دلّی

مدیر: شاہد علی خاں
مہمان مدیر: ایم۔ حبیب خاں
قیمت سالانہ: 55/- روپے
فی پرچہ: 6/- روپے
غیر ممالک کے لیے: 320/- روپے

اس شمارے کی قیمت: 90/=

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

تیسری بار جولائی ۹۵ء

قیمت 90/=

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

فہرست

ایم. حبیب خاں (مہمان مدیر)
(اسسٹنٹ سکریٹری، انجمن ترقی اردو ہند)

اداریہ

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں خلیق انجم صاحب کی شخصیت اور فن پر کتاب نما کا یہ خصوصی شمارہ ترتیب دے رہا ہوں پچھلے تقریباً ۱۶ سال سے انجم صاحب کے ساتھ انجمن میں کام کر رہا ہوں۔ میں نے ان کے ساتھ افسری اور ماتحتی کے آداب کو ہمیشہ ملحوظ رکھا مگر یہ ان کی بڑائی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ میرے ساتھ مساویانہ برتاؤ رکھا اور ہمیشہ دفتری معاملات میں مجھ پر اعتماد کیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے کچھ عرصے ہمارے تعلقات میں کشیدگی رہی لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ غلط فہمیاں بہت جلد دور ہو گئیں۔

انجم صاحب اردو کے مشہور و ممتاز ادیب ہیں۔ صف اوّل کے محقق ہیں، انھوں نے بڑی تعداد میں تحقیقی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ نقاد ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے مقتدر رسالوں میں ان کے بے شمار تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ متنی تنقید کے فن پر اردو میں پہلی کتاب لکھنے کا شرف اُن ہی کو حاصل ہے۔ چار جلدوں میں "غالب کے خطوط" اور تین جلدوں میں "آثار الصنادید" کے تنقیدی اڈیشن تیار کر کے انھوں نے متنی تنقید کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔ ان کی کچھ کتابیں ہندوستان اور پاکستان کی کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ انجم صاحب نے فارسی اور انگریزی کی کئی کتابیں اردو میں ترجمہ کی ہیں۔ انھیں فارسی پر اتنی قدرت حاصل ہے کہ چار پانچ سال تک آل انڈیا ریڈیو کے دری یونٹ میں فارسی کے مترجم اور براڈ کاسٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔ بہت سے پیشہ ور فوٹو گرافروں سے بہتر فوٹو کھینچتے ہیں۔ ان کے پاس کئی قیمتی کیمرے ہیں "آثار الصنادید" میں شامل ڈیڑھ سو کے قریب تصویریں ان کے اپنے کیمرے سے کھینچی ہوئی ہیں۔ انجمن میں بھی تقریباً ساڑھے تین سو ادیبوں کی ان کی کھینچی ہوئی تصویریں محفوظ ہیں۔ انجم صاحب کو ہومیو پیتھی کا بھی بہت شوق ہے باقاعدہ گورنمنٹ سے آر۔ ایم۔ پی کی سند حاصل کیے ہوئے ہیں۔ تعمیرات میں بھی غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ دلچسپی اردو گھر کی تعمیر کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ جدید طرز کی تعمیر کا ان کو بہت اچھا تجربہ ہو گیا تھا۔ غالب ہاؤسنگ سوسائٹی، جس میں تین سو سے زاید فلیٹ ہیں، کے دس سال تک صدر رہے۔ دلی کے ذاکر حسین کالج کی نئی عمارت کا ایک حصہ تعمیر ہوا تھا جس میں بہت سی خامیاں رہ گئی تھیں ذاکر حسین ٹرسٹ نے تعمیر کے سلسلے میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کو منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد ذاکر حسین کالج کی باقی عمارت ڈاکٹر صاحب کی نگرانی ہی میں تیار ہوئی۔ غالباً تعمیر کی اس دلچسپی کی بنا پر انھیں دلی کے آثار قدیمہ میں دلچسپی پیدا ہوئی اور یہ دلچسپی اتنی بڑھی کہ اس موضوع پر ان کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) دلی کی درگاہ شاہ مرداں (۲) دلی کے آثار قدیمہ (۳) آثار الصنادید (تین جلدوں میں)۔

آج کل انجم صاحب غیر معروف آثار قدیمہ پر کام کر رہے ہیں۔ خلیق انجم صاحب نے اپنا باقاعدہ کیریئر کروڑی مل کالج میں اردو کے استاد کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ ۱۴-۱۵ سال تک انھوں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طلبہ

پڑھایا اور پی. ایچ. ڈی کے طلبہ کی رہنمائی کی۔

۱۹۷۴ء میں جب خلیق انجم صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے تو انجمن کا دفتر علی گڑھ کی ایک پرانی اور بوسیدہ سی عمارت میں تھا۔ انجمن کی آمدنی تقریباً چھ ہزار روپے ماہانہ تھی اور اردو گھر کی تعمیر شروع ہو کر تھوڑے سے کام کے بعد ہی رک گئی تھی۔ خلیق انجم صاحب اور ان کی رہنمائی میں کام کرنے والے انجمن کے کارکنوں کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے کہ اردو گھر کی شاندار عمارت مکمل ہو چکی ہے انجمن کا دفتر بالکل جدید انداز پر ہے۔ اور خود اپنے وسائل سے ایک لاکھ تیس ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہے۔ انجم صاحب اردو میں اور کچھ بھی نہ کرتے تب بھی اس عظیم الشان کارنامے کی وجہ سے اردو تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں دو باتیں تو لکھنا ہی بھول گیا اور وہ یہ کہ اگر وہ ادیب اور محقق نہ ہوتے تو انجینئر ہوتے اور اگر انجینئر نہ ہو سکتے تو موٹر میکنک ضرور ہوتے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انھیں پرانی کاروں کی مرمت کا بہت شوق رہا ہے اور ان کے پاس ہمیشہ پرانی گاڑی رہی ہے۔ انھیں کار کی مرمت کرنے میں بہت مزا آتا ہے۔

انجم صاحب این سی سی میں بھی رہے ہیں ان کی تربیت ۱۹۶۳ء میں ہوئی تھی اور حکومت کا خیال تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو ان لوگوں کو فوری طور پر لڑائی پر بھیجنا پڑے گا۔ اس لیے ان کی تربیت عام فوجیوں کی طرح کی گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو سیکنڈ لفٹنٹ کے طور پر کمیشن ملا۔ لفٹنٹ ہوئے کیپٹن ہوئے۔ چوں کہ این سی سی کی مصروفیات کی وجہ سے انھیں ادبی اور تدریسی کاموں کے کرنے میں وقت بہت کم ملتا تھا، اس لیے انھوں نے این سی سی سے استعفیٰ دے دیا۔

غرض یہ ہے کہ ایسی مثال کم ملے گی کہ ایک شخص اتنے مختلف میدانوں میں کام کرے اور بیشتر میدانوں میں صف اول کا آدمی شمار ہو۔

جیسا کہ میں اپنے مضمون "انجمن صاحب" میں تحریر کر چکا ہوں کہ انھوں نے غالب کے خطوط کو پہلی بار سائیٹفک طریقے سے مرتب کیا ہے۔ خلیق انجم صاحب نے یہ خطوط چار جلدوں میں مرتب کیے ہیں۔ انھوں نے غالب پر اس پائے کا کام کیا ہے کہ اس وقت انھیں ماہر غالبیات کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ غالب پر کوئی کتاب لکھی جائے اور ان کی کتابوں کا حوالہ نہ دیا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ غالب کے ان اردو خطوط کو بنیاد بنا کر دیگر مشاہیر کے خطوط مرتب کیے جا رہے ہیں۔

خلیق انجم صاحب نے ایک اور معرکے کا کام ابھی حال میں انجام دیا ہے، یعنی انھوں نے حسرت موہانی کی سوانح حیات لکھی ہے جسے پبلی کیشنز ڈویژن نئی دلّی نے شائع کیا ہے۔ حسرت پر اتنی ضخیم اور معتبر کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی۔ پرنسپل عبدالشکور نے حسرت پر کتاب لکھی، اس کے بعد ڈاکٹر احمر لاری نے تحقیقی مقالہ لکھا جس میں سوانحی حصہ مختصر ہے اور میں نے حسرت کی سوانح حیات پر جو مختصر کتاب لکھی اسے ساہتیہ اکیڈمی نئی دلّی نے شائع کیا ہے۔ اس کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس میں بعض واقعات بڑے اہم بیان کیے گئے ہیں جن سے حسرت کی نجی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ میں اس بات کا عینی شاہد ہوں کہ خلیق انجم صاحب نے حسرت پر کتاب لکھنے میں دلّی اور بیرونِ دلّی کی لائبریریوں میں جا کر پرانے ریکارڈز کو کھنگالا اور اس میں سے سوانحی مواد

تلاش کر کے کتاب کو ہر طرح سے وقیع اور معتبر بنانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بیگم حسرت موہانی کی تصویر دریافت کی اور اسے سب سے پہلے ''ہماری زبان'' میں شائع کیا۔ بعد میں انجم صاحب نے بیگم حسرت کی تصویر کو اپنی کتاب کی زینت بنایا۔ کتاب میں اس کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ بیگم حسرت کا کردار سمجھے بغیر ہم حسرت موہانی کی شخصیت کے خدوخال پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے۔

میں اس سے قبل یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ انجمن میں سمینار اور استقبالیہ پروگرام منعقد کرنے کی روایت ڈاکٹر خلیق انجم نے قائم کی۔ اس کا نام اور اس کی شہرت اخباروں، ریڈیو اور ٹی۔وی کے ذریعہ دور دراز مقامات تک پہنچی۔ سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، علامہ اقبال، حسرت موہانی، قاضی عبدالغفار اور علامہ شبلی جیسی عظیم ترین شخصیتوں پر سمینار منعقد کر کے انجمن کی شہرت اور اردو کے فروغ میں ان کا اہم کارنامہ ہے۔ اردو کا اس سے قدیم علمی، تہذیبی اور ادبی ادارہ پورے برصغیر میں نہیں ہے اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ ڈاکٹر خلیق انجم کا نام انجمن کی تشکیل جدید میں یقیناً لیا جائے گا۔

ہمیں بے حد مسرت ہے کہ اس کتاب کے دو اڈیشن ہماری توقع سے کہیں زیادہ فروخت ہوئے اور اب اس کا تیسرا اڈیشن پیش ہے۔ اس اڈیشن میں عبداللطیف اعظمی، علی جواد زیدی، ڈاکٹر شان الحق حقی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر کامل قریشی مرحوم، ڈاکٹر اکبر رحمانی، جمیل اختر اور ابوالفیض سحر کے وقیع مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ایک مضمون ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے بارے میں ''کچھ اپنی مدح'' کے عنوان سے ''نیا دور'' لکھنؤ کے لیے لکھا تھا، اسے بھی اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

اس اڈیشن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ڈاکٹر خلیق انجم کی تصویریں جو دوسرے اہل قلم اور دوستوں کے ساتھ اردو کے مختلف پروگراموں میں لی گئی تھیں ان کو شریک اشاعت کیا گیا ہے۔ ان تصویروں سے خلیق انجم صاحب کی نجی، علمی اور ادبی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

خلیق انجم ـــــ ایک عملی انسان

ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک مضمون میں اپنے متعلق کچھ اس طرح کی بات لکھی ہے کہ میں سڑک کا آدمی ہوں . . . . جامع مسجد کے قریب ڈاک خانے کے نیچے بیٹھ کر خط لکھا کرتا تھا . . . . ۱۹۴۷ء میں بارہ برس کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا . . . کسرِ نفسی یقیناً ایک خوبی ہے لیکن ڈاک خانے کے نیچے بیٹھ کر خط لکھنے سے کوئی شخص سڑک کا آدمی نہیں بن جاتا۔ خدا کی رحمتوں کے پہلو حدو شمار سے باہر ہیں۔ کسی فرد کی تخلیقی صلاحیتوں کے سرچشمے کہاں کہاں واقع ہیں اس کا بعض اوقات ان سرچشموں سے مستفید ہونے والی شخصیتوں کو علم بھی نہیں ہوتا۔ بزرگوں کی دعائیں یا اپنے بزرگانِ خاندان میں کسی عالم کی موجودگی کس طرح ہمیں متاثر کرتی ہے اور کس طرح بعد میں آنے والے بچوں کی علمی یا ادبی یا خالص تخلیقی صلاحیتوں پر اثر انداز ہوتی ہے یہ خدائی راز ہیں جو ہم لوگوں کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، ایک زندہ و پائندہ حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم کے نانا پروفیسر عزیز الرحمٰن ایک مستند عالم تھے۔ اردو انگریزی دونوں زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ اردو میں انھوں نے سات جلدوں پر مشتمل "علم مجلسی" نام کی کتاب لکھی۔ اور انگریزی میں دہلی کی جامع مسجد پر ایک کتاب تحریر کی جسے اس موضوع پر آج بھی استناد کا درجہ حاصل ہے۔ خلیق انجم کے والد ریلوے میں انجینئر تھے۔ گویا خاندان میں ادب اور علم (لٹریچر اور سائنس) دونوں موجود تھے۔ خاندان میں آنے والی نئی نسل کا ان سے متاثر ہونا یا نئی نسل کے ایک فرد یا زیادہ افراد کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ادب اور علم کی اس موجودگی کا مثبت رول ادا کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔

ڈاک خانے کے نیچے بیٹھ کر خط لکھنا بھی مصلحتِ ایزدی سے خالی نہیں رہا ہوگا۔ ممکن ہے قدرت خطوط نویسی کی جانب خلیق انجم کے اس رجحانِ طبع کی نشان دہی کر رہی ہو جس کا ایک پہلو بعد میں آ کے "غالب کے خطوط" کی صورت میں نمودار ہوا اور جس کی تین جلدیں اس وقت اہلِ نظر کے سامنے آچکی ہیں اور چوتھی جلد زیرِ طبع ہے۔ "غالب کے خطوط" ڈاکٹر خلیق انجم کا ایک ایسا شاہکار ہے جس نے ہندوپاکستان کے تمام بالغ نظر نقادوں کو متوجہ کیا ہے۔ اور انھوں نے اس کام کو ایک عظیم تدوینی اور تحقیقی کام قرار دیا ہے۔ جمیل الدین عالی نے اس کے متعلق مجو ایک کتاب العلوم کی حیثیت رکھتی ہے، لکھا ہے کہ "غالب کے خطوط" ایک مثالی نوعیت کا کام ہے اور اس معیار کا کام ہمیں جرمن ادب میں نظر آتا ہے۔" جب اس کتاب کی پہلی جلد شائع ہوئی اور راقم التحریر نے اس کا مطالعہ کیا تو اس سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس کے متعلق اس نے انگریزی میں ایک مضمون لکھا جو "اقبال ریویو لاہور" اور "کشمیر ٹائمز، جموں" میں شائع ہوا۔

"غالب کے خطوط" پر تو کام ڈاکٹر خلیق انجم نے خیر بہت بعد میں آ کے کیا۔ تصنیف و تالیف کا کام انھوں نے ۱۹۵۷ء

یں شروع کر دیا تھا جب کہ وہ ابھی ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ نکولائی گوگول کے ناول "تاراس بلبا" کا انھوں نے ۱۹۵۰ء میں ہی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی کی جانب سے شائع ہوا تھا۔ کچھ مدت بعد انھوں نے مرزا مظہر جان جاناں کے فارسی خطوط مرتب کیے۔ اور اردو میں ان کا ترجمہ کیا۔ یہ کتاب ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی "غالب کی نادر تحریریں"، غالبیات کے سلسلے میں خلیق انجم کی ایک اور کتاب ہے جو ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آئی۔ ۱۹۶۵ء میں "مرزا محمد رفیع سودا" انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ نے شایع کی۔ اس کتاب کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے لکھا تھا کہ اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو کہ اردو میں تحقیق کس اعلا معیار پر پہنچ گئی ہے تو اس کتاب کا مطالعہ کیجیے"۔

یہاں اس مضمون میں ڈاکٹر خلیق انجم کی تمام تصنیفات اور تالیفات کا ذکر کرنا میرا مقصد نہیں ہے۔ اگرچہ ان تصنیفات و تالیفات کی تعداد تیس اکتیس تک پہنچتی ہے لیکن یہاں کتابوں کا ذکر محض ضمنی طور پر آگیا ہے۔ کہنا تو میں یہ چاہتا تھا کہ نکولائی گوگول کے ناول "تاراس بلبا" کے ترجمے سے بھی بہت پہلے علم و ادب خلیق انجم کا اوڑھنا بچھونا بن چکا تھا۔

۵۵-۱۹۵۴ء کی بات ہے یا شاید اس سے بھی کچھ پہلے کی انجمن تعمیر اردو کے ایک جلسے میں خلیق انجم نے اصغر گونڈوی کی شاعری پر ایک مقالہ پڑھا چند روز قبل مولانا آزاد پر ان کا ایک مضمون دیکھ چکا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم پر اس تحریر سے خاصا مایوس ہوا تھا اور اب جو چند روز بعد اصغر گونڈوی کی شاعری پر اتنا مدلل اور متوازن مقالہ سنا تو میری مسرت کی انتہا نہ رہی۔ اور میں نے غالباً دس بارہ روز تک اس مضمون سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

خلیق انجم کے ساتھ اگرچہ ملاقاتیں اس سے قبل بھی انجمن تعمیر اردو کے جلسے میں ہو چکی تھیں اور غالباً انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ دہلی کے اجلاس میں بھی۔ لیکن اس جلسے نے یا دوسرے لفظوں میں خلیق انجم کے مقالے نے ہمیں ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا۔ اور عمر میں ۱۷، ۱۸ برس کا فرق ہونے کے باوجود دونوں میں دوستی کا ایک ایسا رشتہ قائم ہوا جو خدا کے فضل سے آج تک برقرار چلا آرہا ہے۔

ان دونوں انجمنوں میں مقالات، نظموں، غزلوں اور کہانیوں کے بعد کبھی کبھار بحث و مباحثہ شروع ہو جایا کرتا تھا۔ بحث میں حصہ لینے والے حضرات علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی، محمد اجمل خاں، گوپی ناتھ امن، اور مالک رام بھی تھے۔ گوپال متل، غلام ربانی تاباں اور غلام احمد فرقت اور ان کے بعد کی نسل کے بھی جن میں شمیم کرہانی، عنور جالندھری، نکر تونسوی، پرکاش پنڈت، نریش کمار شاد اور راقم التحریر کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے بعد کی نسل لڑکوں پر مشتمل تھی اور اس age group میں خلیق انجم بھی شامل تھے۔ خلیق انجم کی بحث تمام اہل بزم اور اہل قلم حضرات کو متاثر کرتی تھی۔ ان کے انداز بحث کی خوبی یہ ہوتی تھی کہ وہ مختصر لفظوں میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دینے پر قادر تھے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی وجہ سے دو حضرات کی نوک جھونک تلخی کی صورت اختیار کر لیتی تھی اس وقت خلیق انجم اپنے طنز و مزاح کے چھینٹوں سے کام لے کر محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے اور صورت حال سنبھل جاتی تھی۔ خلیق انجم کی یہ شگفتہ مزاجی آج بھی باقی ہے اور میں نے اکثر علمی اور ادبی محفلوں میں اور بعض دفعہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جلسوں میں بھی یہ دیکھا ہے کہ اگر کسی وجہ سے ماحول میں بدمزگی پیدا ہوئی ہے تو خلیق انجم کی شگفتہ بیانی نے بگڑتی ہوئی بات کو بنا لیا ہے۔ یہ رکھ رکھاؤ خلیق انجم کے مزاج کا ایک حصہ ہے۔ اس کا جزو لاینفک ہے اور ظاہر ہے کہ

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اور یہ اسی سعادت ہی کے باعث ہے کہ یہ شگفتہ دماغی کسی مصنوعی یا بناوٹی طرز بیان کا حصہ نہیں ہے بلکہ خود ایک وضع

زندگی ہے جس کا خمیر صاف دلی اور بے تکلفی کے اجزا سے اٹھا ہے۔ چناں چہ یہ بات اکثر میرے دیکھنے میں آئی ہے کہ خلیق انجم کا رویہ ہر ایک کے ساتھ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا تکلفات کی آلائش سے پاک ہے۔ یہ بات بظاہر حیرت انگیز نظر آتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ خلیق اپنے دفتر کے چپراسیوں کو بھی وہی عزت دیتے ہیں جو ایک انسان کو دوسرے انسان کو دینا چاہیے۔ میں نے انھیں انجمن کے بعض ملازمین سے ناراض ہوتے بھی دیکھا ہے انھیں غصے کے عالم میں بھی دیکھا ہے لیکن جتنی تیزی سے انھیں غصہ آتا ہے اسی تیزی سے فرو بھی ہوجاتا ہے اور اسے ظاہر و باطن کی یکسانیت کی دلیل کہنا غلط نہیں ہوگا۔ پٹھان کا ظاہر و باطن تو یکساں ہونا ہی چاہیے۔ ویسے بھی ان کے انداز گل افشانی گفتار کے بارے میں قرۃ العین حیدر کا کہنا ہے کہ خلیق انجم بڑی سے بڑی بات کو بھی اس طرح informal انداز میں کہتا ہے کہ بات دل میں اتر جاتی ہے دراصل خلیق انجم ٹھیٹھ دتی والا ہے۔ دلی والے کی خوبی یہ ہے کہ منہ پھٹ ہوتا ہے۔ بات دل میں نہیں رکھتا جو کچھ کہنا ہو سامنے کہہ دیتا ہے۔ اور خلیق انجم تو پٹھان بھی ہے گویا کریلا اور پھر نیم چڑھا۔ اور ہاں، خلیق انجم نوجوانوں میں جو ہر قابل کی حوصلہ افزائی اور ادب و زندگی کے میدان میں ان کی رہنمائی کو بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ انجمن کے سیمناروں میں وہ ہمیشہ دو یا تین طلبہ کو سامنے لاتے ہیں اور ان نئے طلبہ میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا شمار دیکھتے ہی دیکھتے اہل قلم میں ہونے لگا ہے۔

ہاں! تو میں خلیق انجم کے اس مقالے کی بات کر رہا تھا جو انھوں نے انجمن تعمیر اردو کے اجلاس میں پڑھا جب اجلاس ختم ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ کبھی وقت آپ کے پاس ہو تو کبھی کبھار ملاقات ہونا چاہیے۔ چناں چہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے بچوں سے آگاہ کیا۔ خلیق انجم اس زمانے میں دریا گنج والے مکان میں رہتے تھے۔ میں پل بنگش والے مکان میں۔ دفتر میرا اولڈ سیکریٹریٹ میں تھا پبلی کیشنز ڈویژن میں۔

ہمارے پل بنگش والے مکان کی کہانی یہ ہے کہ یہ کسی رئیس کا مکان تھا جو ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مکان اور اس کے ساتھ اپنے وطن کو چھوڑ کے مہاجر کی حیثیت سے پاکستان چلا گیا تھا۔ ۴۸ء میں جب حضرت جوش ملیح آبادی پبلی کیشنز ڈویژن میں اڈیٹر اردو بن کر آئے تو اسی مکان میں فروکش ہوئے۔ یہ مکان انھیں کسٹوڈین نے ساٹھ روپے ماہوار کرایے پر دیا تھا۔ غالباً ۵۰ء یا ۵۱ء میں جوش صاحب یہ مکان چھوڑ کر اولڈ سیکریٹریٹ کے قریب گورنمنٹ کے الاٹ کردہ کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ اور میرے والد محترم مرحوم صاحب کے ساتھ اپنے وعدے کے مطابق یہ مکان ہمارے حوالے کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ سال ڈیڑھ سال کا کرایہ اور بجلی کا بل ادا کیے بغیر ہی جوش صاحب چلے گئے تھے۔ لیکن ہمارے نام بھی چوں کہ دس بارہ کروں پر مشتمل مکان ساٹھ روپے ماہانہ ہی پر الاٹ ہونا تھا۔ اس لیے ہم نے اس پر اپنے کرایہ دارانہ حقوق کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے حکومت کے دفاتر سے کسی مطالبے کے بغیر جوش صاحب کا باقی ماندہ کرایہ اور بجلی کا بل ادا کر دیا تھا تاکہ یہ عدم ادائیگی کہیں ہم لوگوں کی بے دخلی کا باعث نہ بن جائے۔ ہم اس وقت پانچ افراد تھے اتنا اچھا مکان چھوڑ کر کہاں جاتے۔

مکان چوں کہ بہت بڑا تھا اس لیے نہ صرف یہ کہ ہم لوگ اس میں بہت آرام سے رہتے تھے بلکہ جب مہمان آجاتے تھے تب بھی ہمارے آرام میں کوئی خلل نہیں پڑتا تھا۔ اور مہمان بھی آرام سے رہتے تھے۔ فراق صاحب جب دلی آتے تھے ان کا مستقل ٹھکانہ یہی مکان ہوتا تھا۔ جب تک ہم لوگ اس مکان میں رہے ڈاکٹر محی الدین زور بھی ہمارے یہاں قیام کرتے رہے۔ ان کا اس مکان میں قیام کرنے کا سلسلہ ۱۹۵۰ء تک رہا۔ جب ہم لوگ موتی باغ نئی دہلی کے ایک مکان میں منتقل ہو گئے تو ڈاکٹر زور کا قیام مختلف جگہوں پر ہونے لگا، کبھی آندھرا پردیش گیسٹ ہاؤس میں اور کبھی کسی اور گیسٹ ہاؤس میں۔ اس وقت موتی باغ کو پرانی دلی سے اور نئی دلی کے بعض علاقوں سے بہت دور تصور کیا جاتا تھا اور باہر سے

آنے والوں کو یہ خیال رہتا تھا کہ اگر ہم موتی باغ میں رہیں گے تو شہر سے بہت دور ہو جائیں گے۔ آنے جانے کی بھی سہولیات اس وقت نہیں تھیں جو آج دہلی میں میسر ہیں۔

بل بنگش والے مکان کا ذکر یوں تو اس مضمون میں جملہ معترضہ ہی کے طور پر نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً اس مکان کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ ڈاکٹر زور خلیق انجم کو بہت چاہتے تھے اور ڈاکٹر زور جب تک دلی میں مقیم رہتے تھے خلیق انجم ہر روز ان سے ملنے آتے تھے۔ ان کے مکان سے ہمارے مکان کا فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ اب جب ہر روز وہ زور صاحب سے ملنے غریب خانے پر آتے تھے تو ظاہر ہے کہ ہم دونوں کے باہمی مراسم بلکہ دوستی بھی پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اکثر ان کے ساتھ اسلم پرویز بھی ہوتے تھے۔ اسلم پرویز بھی شگفتہ بیانی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اور جب دونوں محفل میں موجود ہوتے تھے تو سے

تب دیکھیے انداز گل افشانی گفتار

کا عالم ہوتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسلم پرویز لڑکیوں میں کہاں تک مقبول ہیں اور اس کا سبب کیا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ خلیق انجم کی صنف نازک میں مقبولیت کا سبب ان کی شگفتہ بیانی ہے۔

خلیق انجم کہتے ہیں کہ وہ شاعر نہیں ہیں لیکن ہزاروں خراب شعر کہنے والا کوئی شخص اگر شاعر کہلا سکتا ہے تو ایک شعر اچھا کہنے والا شاعر ہونے سے کیسے انکار کر سکتا ہے بالخصوص جب اس نے دو چار ہی شعر کہے ہوں اس صورت میں اس پر خراب شعر کہنے کا الزام بھی تو نہیں آسکتا۔

مدت کی بات ہے خلیق انجم اپنے چند دوستوں کے ساتھ چنڈو خانے میں بیٹھے تھے۔ وہاں ایک ایسے دوست کا ذکر آگیا جو ایک مدت سے غائب تھا۔ اور چنڈو خانے کے آس پاس کہیں نظر نہ آیا تھا۔ بات یہ تھی کہ ادھار چائے پینے کا بہت روپیہ اس کے ذمے نکلتا تھا۔ چنڈو خانے کے مالک نے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ شخص ایک مدت سے نظر نہیں آرہا ہے۔ کسی نے کہا لڑکی کے عشق میں تباہ ہو گیا ہے اور مارا مارا پھر رہا ہے۔ بے ساختہ خلیق انجم کی زبان سے نکلا۔

ایسا تو کم ہوا ہے محبت میں ہار کے
عشاق نے چکائے ہوں پیسے ادھار کے

جامع مسجد پر مولانا سمیع اللہ کی دوکان پر کچھ ادیب اور شاعر بیٹھے تھے فراق کا ذکر ہو رہا تھا کسی نے کہا کہ فراق کا پورا نام رگھوپتی سہائے ہے۔ خلیق انجم نے فوراً چار مصرع کہے۔

کب وہ دل کو جلائے تھا یارو
کب وہ آنسو بہائے تھا یارو
اس کو اردو نے کر دیا ہے فراق
ورنہ وہ تو سہائے تھا یارو

خلیق ایک دن کنور مہندر سنگھ بیدی سے کہنے لگے کہ آپ نے شعرا اور شاعرات کو ڈائس پر ایسے بیٹھایا ہے کہ شاعرات آپ کے قریب ہیں اور شعرا دور۔ اور جب آپ کسی شاعر کو داد دیتے ہیں تو کسی خاتون شاعر کی پیٹھ پر تھپکی دے کر۔ اول تو یہی بات داد طلب ہے۔ اور بلکہ اس سے بھی زیادہ داد طلب فعل آپ کی تھپکی دینے کا انداز ہے۔ آپ کا ہاتھ ہوا میں کم دیر اور کمر پر زیادہ دیر رہتا ہے۔

ایک سازش کرنے والے ادیب نے دعویٰ کیا کہ میں پٹھان ہوں خلیق انجم نے کہا کہ یہ بات غلط ہے۔ تم پٹھان نہیں ہو سکتے۔ اس نے کہا ہمارا محلہ ہی پٹھانوں کا ہے اس میں سب پٹھان رہتے ہیں۔ خلیق انجم نے جواب میں کہا تمہارے محلے میں کوئی غیر پٹھان بھی رہتا ہوگا۔

ایک دفعہ خلیق انجم نے غلطی سے ایک شاعرہ کے مکان پر دستک دی۔ اندر سے شاعرہ کی گرج دار آواز آئی۔ کون ہے اس وقت دستک دینے والا۔ انھوں نے فوراً اپنے حواس جمع کرتے ہوئے کہا لالا جی نے بھیجا ہے شاعرہ نے اسی غصے بھری آواز میں کہا۔ کون لالا جی۔ انھوں نے بہت اطمینان سے جواب دیا ہار کی قیمت لانے کے لیے۔ آپ کے شوہر نے ہار کی قیمت ابھی تک نہیں بھجوائی۔ دو ماہ قبل جھمکوں کی قیمت تو بھجوادی تھی لیکن ہار کے دام ابھی تک نہیں بھجوائے۔ اب شاعرہ حیران کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ گھر میں نہ تو جھمکے آئے ہیں اور نہ ہار خلیق انجم تو لالا جی کا پیغام دے کر وہاں سے چل دیے۔ لیکن جب شوہر صاحب گھر واپس آئے ہوں گے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خلیق انجم کے ایک دوست شیر کے شکار کے بہت شوقین تھے۔ لیکن شیر ہاتھ نہیں آتا تھا۔ یہ دوسرے جانور مار لاتے تھے لیکن شیر کا شکار ان کے مقدر میں نہیں تھا۔ ایک دفعہ ان کے مقدر نے یاوری کی اور مدھیہ پردیش میں ایک شیر کا شکار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے خوشی میں گھر تار دیا LION KILLED اتفاق کی بات ہے کہ جب تار والا تار دینے کے لیے ان کے گھر پہونچا تو خلیق انجم دروازے پر موجود تھے۔ انھوں نے تار والے سے تار لے کر پڑھا اور اسے جیب میں رکھ لیا۔ دوسرے دن ایک شخص کو ان دوست کے گھر بھیجا کہ مدھیہ پردیش میں آپ کے صاحب خانہ نے دو ہزار روپے میں ہم سے پنجرے میں بند شیر خریدا تھا۔ ایک ہزار روپیہ دے دیا تھا اور ایک ہزار روپیہ باقی ہے وہ ادا کیجیے۔ وہ شخص تو یہ جواب سن کر کہ ابھی صاحب خانہ واپس نہیں آئے لوٹ گیا۔ لیکن دو چار روز بعد جب صاحب خانہ شیر کی لاش لیے ہوئے اس توقع پر گھر پہونچے کہ مبارک باد ملے گی تو گھر والوں نے ان کا خوب مذاق اڑایا کہ پنجرے میں بند شیر کو گولی مار دی جا کر فلاں شخص کو باقی ایک ہزار ادا کرو۔ وہ سٹ پٹا کر رہ گئے۔ لگے اس شخص کو گالیاں دینے جس نے ان پر یہ بہتان لگایا تھا اور گالیوں کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ خلیق انجم بھی ہمدردی کے طور پر ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور جس شخص نے بہتان لگایا تھا اسے برا بھلا کہتے رہے۔

ایک دوست کے گھر میں محفل جمی تھی۔ تصدق حسین خالد کا ذکر آیا کسی نے کہا کہ فلاں سنہ میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ مالک رام صاحب بھی محفل میں موجود تھے۔ انھوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا کہ اس سنہ سے پہلے میں نے وفیات کا سلسلہ شروع کیا تھا میری تحریر کی وفیات میں تو ان کا ذکر نہیں ہے خلیق نے چھوٹتے ہی کہا وہ آپ کی زد سے نکل گئے تھے۔ وہ وفیات کے شروع ہونے سے ایک سال قبل ہی دنیا سے فرار ہو گئے۔

خلیق انجم ایک انٹرویو میں پیش ہوئے۔ شیخ چاند کا ذکر آ گیا ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم اکسپرٹ کی حیثیت سے بورڈ آف انٹرویو کے رکن تھے۔ انھوں نے شیخ چاند کے ذکر پر کہا کہ شیخ چاند تو بہت معمولی مصنف تھے۔ اس پر خلیق نے جواب دیا، جی ہاں، لیکن انھوں نے جو شاگرد پیدا کیے ہیں وہ بڑے مصنف تھے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

کروڑی مل کالج میں ہندی کے ایک لکچرر تھے وشوا ناتھ ترپاٹھی۔ بہت اچھی اردو جانتے تھے۔ انھوں نے اپنی ہندی کی کلاس میں طلبہ کو اردو پڑھانے کا انتظام اس خیال سے کر رکھا تھا کہ اچھی ہندی جاننے کے لیے اردو کا جاننا ضروری ہے۔ ایک دن خلیق انجم مصروف تھے۔ انھوں نے ترپاٹھی جی سے کہا کہ آج میری اردو کلاس آپ لے لیں۔

ترپاٹھی جی بولے۔ لیکن میں تو اردو نہیں جانتا، اس لیے یہ جرم ہے کہ میں اردو پڑھاؤں۔ خلیق نے فوراً کہا کہ لیکن آپ ہندی بھی تو پڑھاتے ہیں۔

پاکستان کے ایک سفر میں خلیق انجم اور میں اکٹھے تھے۔ دراصل ہم دونوں اردو مصنفین کے ایک ڈیلی گیشن کے رکن تھے۔ جو پاکستان اکیڈمی آف لنگویجز کی دعوت پر پاکستان گیا تھا۔ ہلٹن ہوٹل میں ہمارا قیام تھا۔ ڈاکٹر وحید عشرت مجھ سے ملنے آئے۔ خلیق انجم نیچے لابی میں تھے۔ ان سے انھوں نے پوچھا کہ آزاد کس کمرے میں ہیں۔ خلیق نے کمرے کا نمبر بتایا تو وہ میرے یہاں تشریف لائے۔ وہ میرے لیے میرے ان مضامین کا آنریریم بھی لائے تھے جو "اقبال ریویو" اور "اقبالیات" میں شائع ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہمارے ڈیلی گیشن کو پروگرام کے مطابق ایک جگہ جانا تھا۔ میں، خلیق انجم اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ہم تینوں ایک ہی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ خلیق نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر وحید عشرت آپ کے کمرے کا نمبر پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتا دیا تھا۔ میں نے کہا یار تم نے بہت اچھی بات کی وہ میرے لیے میرے مضامین کی رائلٹی لائے تھے۔ اب یہاں شاپنگ میرے لیے آسان ہوگئی۔

رفیعہ آپا کہنے لگیں میری کتاب کا بھی ایک پبلشر یہاں ہے۔ اس سے ملاقات ہو جاتی تو رائلٹی مل جاتی خلیق انجم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ رفیعہ آپا آپ اپنے پبلشر کی بات مت کیجیے۔ وہ یہاں آیا تھا بہت غصے میں تھا اور آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ رفیعہ آپا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ کیا مطلب؟ غصے میں اور مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ خلیق نے کہا کہ جی ہاں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی کتاب چھاپی اور نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب چھپنے کے چند دن بعد طلبہ نے مجھے گھیر لیا اور بھرے بازار میں میری پٹائی کر دی۔ رفیعہ آپا نے خلیق انجم کی بات کا یقین کرتے ہوئے کہا۔ میں نے تھوڑا ہی اسے کتاب چھاپنے کے لیے کہا تھا اس نے خود ہی چھاپی تھی۔

خلیق انجم کی بزلہ سنجی اور شگفتہ بیانی کا ذکر چل نکلا تو کچھ اور دلچسپ واقعات سن لیجیے۔ کچھ سال ہوئے ایک ادیب کو ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ ملا جس پر بعض لوگوں کو اختلاف تھا۔ خود خلیق انجم بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ادیب انعام کے مستحق نہیں ہیں یہ انعام اسے دے کر ساہتیہ اکادمی کے وقار میں کمی آئی ہے۔ اب لطیفہ سنیے۔

خلیق انجم کی ایک ایسے ادیب سے بحث ہو گئی جس نے ان کی ایک کتاب پر بے جا تنقید کی تھی، اور اس بحث میں نوبت چیخ و پکار کو پہنچ گئی۔ خلیق انجم نے بہت اونچی آواز میں غصے ہو کر کہا کہ آپ نے میرے خلاف جو کچھ لکھا ہے میں اس کا بدلہ ایسا چکاتا کہ آپ تو کیا آپ کا پورا خاندان کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ آنے والی نسلیں آپ کے نام سے شرماتیں۔ ان صاحب نے انتہائی غصے میں کہا کہ آپ میرا کیا کر لیتے۔ خلیق انجم نے اسی غصے کے لہجے میں جواب دیا کہ میں آپ کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دلوا دیتا۔ اس فقرے پر بڑے زور کا قہقہہ لگا اور محفل زعفران زار ہو گئی۔

حال ہی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام قاضی عبدالغفار پر سمینار منعقد ہوا۔ خلیق صاحب نے مقالے پڑھنے کے لیے جن لوگوں کو دعوت دی تھی ان میں دلی کی ایک خاتون بھی تھیں۔ ان خاتون کو قاضی صاحب کی "لیلیٰ کے خطوط" اور مجنوں کی ڈائری" کے موضوع پر مقالہ لکھنا تھا۔ ایک دن ہم لوگ "اردو گھر" میں خلیق صاحب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ خاتون آگئیں۔ اور انھوں نے بیٹھتے ہی کہا کہ آپ نے مجھے "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" پر مقالہ لکھنے کے لیے کہا ہے۔ یہ دونوں کتابیں کسی لائبریری میں نہیں ملتیں۔ آپ نے مجھے لیلیٰ مجنوں کے چکر میں کیوں ڈال دیا۔ خلیق انجم نے برجستہ جواب دیا کہ "دل کی بات کہنے کا اور کیا طریقہ ہو سکتا تھا۔"

تین چار سال کی بات ہے کہ ایک ایمبیسی میں بوفے ڈنر تھا۔ لوگ ہاتھوں میں پلیٹیں لیے چار چار پانچ پانچ کے

گروہ بنائے کھانا کھا رہے تھے۔ خلیق انجم ایک گروہ میں کھڑے حسبِ عادت اپنی شگفتہ بیانی سے لوگوں کو ہنسا رہے تھے۔ اچانک ایک اجنبی صاحب ہاتھ میں پلیٹ لیے اس گروہ میں شریک ہو گئے۔ ایک دو منٹ تو خاموش رہے اور پھر جو انھوں نے بولنا شروع کیا ہے تو خاموش ہونے کا نام نہیں لیا۔ ایک دفعہ سانس لینے کے لیے رکے تو خلیق انجم نے ان صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا معاف کیجیے گا میں آپ سے واقف نہیں ہوں لیکن ایسا لگتا ہے کہ آپ ممبر آف پارلیمنٹ ہیں۔ ان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ کا خیال صحیح ہے لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ خلیق انجم نے جواب دیا کہ آپ اتنی دیر سے ایسی باتیں کر رہے ہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں، پھر آپ اپنا کہے جا رہے ہیں اور کسی کی نہیں سن رہے ہیں۔ اس پر بڑے زور کا قہقہہ لگا اور وہ صاحب شرمندہ ہو کر چلے گئے۔

ڈیڑھ دو سال پہلے ڈاکٹر خلیق انجم کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور جس کی وجہ سے پاؤں کی ہڈی میں فریکچر ہو گیا جب پلاسٹر بندھ گیا تو ڈاکٹر نے ہدایت دی کہ آپ پاؤں زمین پر نہ رکھیں۔ پلاسٹر بندھنے کی وجہ سے خلیق کو بہت تکلیف ہو رہی تھی اور وہ تھوڑی دیر میں کراہ رہے تھے۔ لیکن حسِ مزاح اب بھی برقرار تھی۔ کہنے لگے ڈاکٹر صاحب دشمنوں اور دوستوں کو ہمیشہ مجھ سے یہی شکایت رہی ہے کہ میں پاؤں زمین پر نہیں رکھتا۔ اتنی تکلیف میں بھی دوسروں کو ہنسانے کے لیے بہت بڑا دل گردہ چاہیے۔

بس ایک واقعہ اور سن لیجیے۔ ایک ادبی جلسے میں ایک ادیب نے کسی موضوع پر تقریر کرتے ہوئے بے وجہ انجمن ترقی اردو (ہند) پر الزام کی بوچھار کر دی۔ وہ صاحب تقریر کر کے بیٹھے تو خلیق انجم جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے کہنے لگے حضرات آپ کے علم میں ہو گا کہ جامع مسجد سے حوض قاضی تک سواری کی رکشائیں چلتی ہیں۔ کسی زمانے میں رکشا والے چار آنے فی سواری لیتے تھے۔ ایک دن میرے ایک دوست کو جلدی تھی وہ رکشا میں بیٹھ گئے اور دوسری سواری کا انتظار کیے بغیر انھوں نے رکشا والے سے چلنے کے لیے کہا۔ جب رکشا حوض قاضی پہنچی۔ اور وہ میرے دوست رکشا سے اترے تو رکشا والے نے سواری کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ کالی شیروانی، سفید براق چوڑی دار پاجامہ، پالش کیے ہوئے چمکتے ہوئے جوتے، چوں کہ وہ رکشا میں اکیلے آئے تھے اس لیے انھیں دو سواریوں کے آٹھ آنے دینے تھے۔ رکشا والے نے ان صاحب کو دیکھ کر دو روپے مانگے۔ انھوں نے آٹھ آنے دینا چاہا۔ رکشا والا نہیں مانا دونوں میں تکرار ہو گئی۔ میرے دوست کو غصہ آگیا۔ انھوں نے شیروانی اتار کر رکشا پر ڈال دی اور غصے میں کہا کہ "ابے اگر ہم نے شیروانی پہن لی ہے تو تو سمجھتا ہے کہ ہم شریف آدمی ہیں"۔ رکشا والا ڈر گیا اور آٹھ آنے لے کر خاموشی سے چلا گیا۔ یہ واقعہ سنا کر خلیق انجم نے کہا کہ حضرات میں اب اپنی شیروانی رکشا پر ڈالتا ہوں اور عرض کرتا ہوں۔ ہال قہقہوں سے گونج اٹھا لیکن خلیق انجم تو غصے میں تھے۔ انھوں نے پندرہ بیس منٹ تک اپنے شعلہ نوائی کے جوہر دکھائے۔

میں نے اس مضمون کے شروع میں خلیق انجم کی چند کتابوں کا ذکر کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان کی چند اور کتابوں کے متعلق بھی لکھوں گا۔ لیکن ان کی خوش بیانی اور خوش مزاجی کی باتیں شروع ہو گئیں۔ خلیق انجم کے اس طرح کے لطیف جملوں اور خوش بیانی پر مشتمل پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے اور اقبال کے الفاظ میں ان کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ

کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

سید قدرت نقوی (کراچی)

عودِ ہندی اور خلیق انجم

غالب کے خطوط کا اولین مجموعہ "عودِ ہندی" کے نام سے پہلی مرتبہ محمد ممتاز علی خاں کی کوششوں سے مرتب ہو کر انہی کے زیرِ اہتمام مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوا۔ اس زمانے میں جیسا بھی چھپا بہر حال یہ چھپ گیا۔ متن میں کافی غلطیاں ہیں۔ کاتب کے تصرفات جداگانہ ہیں لیکن اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اگر یہ کوشش بروئے کار نہ آتی اور خطوط کی طباعت و اشاعت کی یہ کوشش اور تحریک نہ ہوتی تو شاید غالب کے خطوط اتنے جلد منظرِ عام پر نہ آتے۔ اسی لیے "عودِ ہندی" کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ متنی تنقید کے اعتبار سے بھی اولیت حاصل ہے کہ بحث کا آغاز اسی سے کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے "غالب کے خطوط" میں خطوطِ غالب کی از سرِ نو ترتیب کی ہے اور ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی کوشش محمد منیر نیر کی ہے جنھوں نے غالب کے خطوط کی ترتیب کے سلسلے میں ایک اہم قدم اٹھایا اور وہ اس طرح کہ اردوئے معلیٰ مطبوعہ مطبع مجیدی کانپور ۱۹۲۲ء میں اس طرح مرتب کی کہ تمام مکتوب الیہم کے جملہ منتشر خطوط کو یکجا کیا مکتوب الیہم کی فہرست اور ان کے نام کے خطوط کی تعداد درج کر دی اس کے بعد مولوی مہیش پرشاد نے تاریخی ترتیب سے خطوطِ غالب مرتب کیے اور "عودِ ہندی" اور اردوئے معلیٰ کی تفریق کو ختم کیا، کچھ نئے خطوط شامل کیے۔ اسی نام و انداز سے مولانا غلام رسول مہر نے خطوطِ غالب کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا جسے غلام علی اینڈ سنز نے چھاپا مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے غالب کے خطوط بنام والیانِ رام پور وغیرہ کو نہایت محنت و جاں فشانی سے مرتب کر کے طبع کرایا۔ نادراتِ غالب کو سید آفاق حسین آفاق دہلوی نے مولانا عرشی کے مکاتیبِ غالب کو سامنے رکھ کر مرتب کیا۔

"عودِ ہندی" میرٹھ کے بعد دہلی اور لکھنؤ وغیرہ سے متعدد بار چھپی مگر اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ آخری مرتبہ اسے مجلس ترقی ادب لاہور سے سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے مرتب کر کے چھپوایا مگر متن کی ترتیب وہی قدیم رکھی۔ البتہ حواشی وغیرہ لکھ کر اس کو مفید بنانے کی کوشش کی گئی ہے متنی نقد کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ ماخذات کی نشان دہی کی گئی مگر ان کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔

ڈاکٹر خلیق انجم کے پیشِ نظر یہ تمام کوششیں ہیں۔ میں "عودِ ہندی" کے سلسلے میں یہ مختصر سی گزارش پیش کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے عودِ ہندی کی بہ یک وقت دو طباعتوں کا سراغ لگا کر اپنی انتہائی بالغ نظری، باریک بینی اور ذہنی رسائی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اس دریافت کی داستان وہ "عودِ ہندی" کے بارے میں ایک

اہم انکشاف کے زیرعنوان اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"بہت عرصہ ہوا میں نے غالب کے وہ خطوط مرتب کر لیے تھے جن کے متن کی بنیاد "عود ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" کے پہلے ایڈیشنوں پر تھی . . . . جب میں نے دوبارہ کام شروع کیا تو انجمن ترقی اردو کی لائبریری سے "عود ہندی" کا پہلا ایڈیشن لے لیا، مرتب کیے ہوئے خطوط کا جب "عود ہندی" سے موازنہ کیا تو بہت زیادہ اختلافات نسخ نکلے . . . . اتفاق سے انجمن کی لائبریری میں "عود ہندی" کا ایک اور پہلا ایڈیشن نکل آیا۔ میں نے دونوں ایڈیشنوں کے سرورق اور ترقیمے کی عبارتوں کا موازنہ کیا تو ایک حیرت انگیز اور دلچسپ انکشاف ہوا . . . . اگرچہ ترقیمے میں تاریخ اشاعت دونوں میں ایک ہی ہے یعنی ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ درج ہے۔ لیکن سرورق کی عبارت میں معمولی سا فرق ہے۔ ایک ایڈیشن کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

خداوند بے نسبت بندگی۔ نہ پری درونہ پراگندگی۔ بفضل واہب العطیات خالق الخیر والحسنات انشاء اردو لاجواب موسومہ عود ہندی من تصنیف جناب استاد زماں علامہ عصر اسداللہ خاں المتخلص بہ غالب حسب فرمائش مجمع خوبی باجہاں میاں ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ۔

در مطبع مجتبائی میرٹھ طبع گردید۔

دوسرے ایڈیشن میں دوسری سطر میں "انشاء اردو" کے بجائے "انشاء اردو" اور آخری سطر اس طرح ہے:

"در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ باہتمام محمد ممتاز علی طبع شد"

دونوں ایڈیشنوں کے سرورق کی عبارت میں اختلاف کا صاف مطلب ہے کہ دونوں الگ الگ ایڈیشن ہیں۔"

ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ انکشاف یقیناً بہت اہم ہے۔ یہ پڑھ کر میں نے اپنی "عود ہندی" نکالی اور اس کے سرورق کا مجلس ترقی ادب کی مطبوعہ "عود ہندی" میں بعنوان "عود ہندی کا پہلا صفحہ" جو سرورق کا عکس ہے نکال کر مقابلہ و موازنہ کیا تو نہ صرف ڈاکٹر خلیق انجم کے بیان کو درست پایا بلکہ دونوں میں خطی اختلاف بھی پایا اور نقش و نگار میں بھی کافی فرق نظر آیا میرے پاس جو نسخہ ہے اور دوسرے نسخہ کے سرورق کی کیفیت یہ ہے۔

۱۔ میرے نسخے میں پہلی سطر میں "پراگندگی" میں یائے معروف ہے جب کہ دوسرے میں یائے مجہول۔ اور پ کے دو نقطے ہیں۔

۲۔ وسط میں "عود" کی دال میں بہت زیادہ نمایاں فرق ہے کہ دال کا تحتی سرا میرے نسخہ میں نہایت باریک ہے اور دوسرے نسخے میں موٹا ہے اور کونے دار ہے۔

۳۔ آخری سطر میں "مطبع" واقع اور طبع" کی عین دونوں میں مختلف انداز قلم سے لکھی ہوئی ہے میرے نسخہ میں عین کا سرا خفی اور دائرہ بیضادی مگر ڈھلکا ہوا ہے۔ دوسرے نسخہ میں عین کا سرا جلی ہے۔ دائرہ تو بیضادی ہی ہے مگر ڈھلکاؤ اتنا نمایاں نہیں ہو رہا ہے۔

۴۔ "میرٹھ" کو دونوں نسخوں میں ہائے ہوز کے شوشے کے ساتھ ہائے مخفی سے اس طرح "میرٹھ" لکھا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ میرے نسخے میں "ٹ" کی علامت "ط" کو "ٹ" کے سرے پر لگایا ہے۔ اور ہائے ہوز کے لٹکن بشکل کو ماکو "میر

کے اوپر لکھا ہے۔ لیکن دوسرے نسخے میں "ط" کو ہائے مختفی کے سرے پر اور ہائے ہوز کے کشکن کو "ر" کے بالائی سرے کے بالمقابل لکھا ہے۔ ان کی خطی شکل اس طرح "میرٹھہ" ہے

قدیم الایام میں مخطوطات کی الواح منقش ہوا کرتی تھیں۔ "دیوانِ غالب" نسخہ شیرانی کی لوح منقش ہے جس میں نفیس گل کاری مختلف رنگوں سے کی گئی ہے۔ تقریباً پونے دو سو برس گزر جانے کے باوجود نقش و نگار اچھی حالت میں ہیں۔ البتہ استبدادِ زمانہ کی بدولت رنگوں میں گرد و کہنگی کی وجہ سے کچھ پھیکا پن آگیا ہے۔ چھاپے کے رواج سے الواح کی جگہ سرورق کی تزئین کی جانے لگی۔ سرورق کی تزئین میں باریک حاشیہ اور حوضہ میں بیل بوٹے بنائے جانے لگے۔ یہ کام کاتب حضرات ہی کیا کرتے تھے اور اس سلسلے میں بھی اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس تزئین میں بھی خاص اختراعات سے کام لیا جاتا تھا۔ جس میں کاتب کی صلاحیت، ہنرمندی، اور ذہنی اپج کو دخل ہوا کرتا تھا۔ مختلف قسم کے پھول، بیل بوٹے بنانے میں تخیل سے کام لیا جاتا تھا۔ "عودِ ہندی" کی دونوں طباعتوں کے سرورق میں عبارت، روشِ قلم کی اختلافات کے ساتھ ساتھ گل کاری میں کافی فرق ہے۔ جو پہلی نظر میں واضح نہیں ہوتا مگر تعمقِ نظر سے کام لیا جائے تو فرق نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔

میرے پاس جو نسخہ ہے اس کی گل کاری دوسرے سے مختلف ہے۔ اس فرق کے اظہار میں ہم اپنے نسخہ کو پہلا اور "عودِ ہندی" میں مطبوعہ عکس کو دوسرا کہیں گے۔

دونوں طباعتوں میں سرورق کا چوکھٹا یکساں ہے۔ پہلی پٹی لہریا باریک بیل سے بنائی گئی ہے۔ دونوں کی بیل ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہے۔ اس کے بعد دوہری باریک لکیریں ہیں۔ ان لکیروں کے بعد خالی پٹی ہے اس پٹی کے بعد سیاہ پٹی میں سفید پھول پتیاں بنائی گئی ہیں۔ پتیوں کو پھولوں کے گرداگرد بنایا ہے اور غنچوں کے ذریعے ملحق کیا گیا ہے۔ الحاقی زاویہ کے وسط میں بھی پھول بنائے گئے ہیں۔ یہ پتیاں شاخ نما نصف قوس کی مانند ہیں۔ آغاز دو تکیا پتیوں سے کیا گیا ہے۔ دوسری شاخ کے سرے پر پھول ہے۔ ان کے بیچ میں جو دائرہ بنتا ہے اس میں ایک پھول ہے دو قسم کے پھول ساری پٹی میں ہیں۔ ایک دائرہ میں، ایک دوسرے میں دوسرا۔ بالائی، تحتانی اور بائیں ہاتھ کی پٹیاں اسی نہج پر ہیں۔ ایک پھول گلاب نما ہے۔ دوسرے پھول کی تین پتیاں تو موربنکھی یکساں ہیں۔ مگر چوتھی پنکھڑی کو کرن ماہی یا سیتا پھلی بنایا ہے۔ دائیں طرف کا حاشیہ کم چوڑا ہے۔ بائیں حاشیہ سے تقریباً آدھا ہے۔ اس میں لہریا بیل بنائی گئی لہر کے پیٹے میں ڈنڈی اور پھول بنائے گئے ہیں۔ یہ کیفیت پہلے نسخے کے سرورق کے حاشیوں کی ہے دوسرے نسخے کا سرورق اسی نہج پر بنایا گیا ہے مگر خاصا فرق ہے۔ چوگردی لہریا باریک بیل میں فرق ہے۔ پہلے سرورق میں اس بیل کی پتیاں، ڈنڈیاں بہت نمایاں سفید پھولوں اور پتیوں میں نمایاں فرق ہے۔ جن پتیوں کو پہلے میں پھولوں کے ذریعہ ملحق کیا گیا ہے۔ دوسرے میں پھولوں کی جگہ گلدان بنے ہوئے ہیں۔ ملحاقی زاویہ میں پھول غیر واضح ہیں۔ دائرے کے پھول پہلے سرورق کے انداز پر ہیں مگر پھولوں کی پنکھڑیوں کی رگوں اور زیرے کا انداز بدلا ہوا ہے۔ پہلے میں رگیں نمایاں اور نفیس انداز میں بنائی گئی ہیں۔ زیرہ کا گولا بھی واضح ہے۔ دوسرے سرورق میں بھی دائیں ہاتھ کا حاشیہ کم چوڑا ہے۔ اور اس کے پھولوں کی ساخت اور پنکھڑیوں کی بناوٹ میں کافی فرق ہے۔ پہلے سرورق کے پھول خوش نما، واضح اور نفیس ہیں۔ اور پنکھڑیوں کی بناوٹ ایسی ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ دو پتیاں اور ایک کلی نما پھول ہے۔ دوسرے میں بند شگوفہ کی شکل ہے۔ کالی پٹی کے بعد دونوں میں سفید چھوٹی پٹی میں کالی روشنائی سے عبارت درج ہے۔

حوضہ کے چاروں کونوں پر کیریوں اور پتیاں بنائی گئی ہیں۔ ان کیریوں اور پتیوں کی وجہ سے دونوں سرورقوں کا

فرق نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ پہلے سرورق میں کونوں سے ڈنڈیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ ان ڈنڈیوں میں دو پتے ہیں پتیوں کے بعد دو ڈنڈیاں ہیں جن کے پتے کیریوں کے دونوں طرف پس منظر میں دکھائے ہیں۔ یہ دو دو پتے ہیں جن کے نوکیلے حصے کیری کے دونوں طرف نکلے ہوئے ہیں۔ اور وسطی حصہ کیریوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور یہ شکل پھول کی غلافی ہیئت سے مشابہ ہو گئی ہے۔ چاروں کونوں کی پہلی دو پتیاں جو ابتدائی ڈنڈی پر بنائی گئی ہے ان کی ساخت اور جمی پیمائش میں فرق ہے۔ بالائی بائیں کونے کی پتیاں باقی تین کونوں کی پتیوں سے بڑی ہیں۔ ان کی رگیں واضح اور برگی انداز کی ہیں۔ باقی میں یہ انداز اختیار نہیں کیا گیا۔ اس کیری کی غلافی تحتانی چھوٹی پتیوں کی زمین سفید ہے۔ ان میں رگیں نہیں بنائی گئی ہیں۔ کیری کا بیرونی حلقہ غلافی پتیوں کے بعد کٹاؤ دار ہے۔ اس کے بعد دوسرا حلقہ ہے جسے کیریوں بنایا گیا ہے۔ وسطی حلقہ کے اندر ایک نقش ہے جو کٹاؤ دار ہے۔ کٹاؤ سیاہ ہیں اور ان میں سفید دائرہ ہے۔

دوسرے سرورق میں بھی جوشہ کے چاروں کونوں پر کیریاں بنائی گئی ہیں۔ آغاز ڈنڈی میں نہایت باریک پتیاں بنائی گئی ہیں۔ جو صرف لکیر ہی ہیں۔ اس کے بعد دو لکیروں سے کیری کی ڈنٹھل کا اظہار کیا گیا ہے۔ پتے بالکل نہیں ہیں گویا غلافی انداز نہیں ہے۔ کیریوں کا بیرونی حلقہ ڈنٹھل میں سے کٹاؤ دار بنایا گیا ہے۔ پہلا حلقہ مرواریدی اور وسطی حصہ وہی کٹاؤ دار اور ان میں سفید موتی نما سفید دائرے ہیں مگر دونوں کی ساخت میں فرق ہے۔

وسطی بیضاوی دائرہ جس میں سفید "عود ہندی" لکھا ہوا ہے، اس کی تزئین منقش ہے اس میں پھولوں اور پتیوں سے آرائش کا کام لیا گیا ہے۔ اس دائرے کا حاشیہ پھولوں سے بنایا ہے۔ اندرونی دائرہ جس میں سفید "عود ہندی" درج ہے، اس کی زمین پھولوں، پتیوں اور ڈنڈیوں سے مزین کی گئی ہے۔ حاشیہ کے پھولوں اور پتیوں کی ساخت میں کافی فرق ہے یہ فرق زیبنی تزئین کاری میں بھی پایا جاتا ہے۔

بالائی چھوٹی بڑی پتیوں کی محاذی تختی پتیاں بھی ہیں۔ پہلی باریک پٹی میں "من تصنیف . . . . میر ٹھ کالی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ دوسری بڑی پٹی میں "در مطبع" والی عبارت درج ہے۔ جس کی زمین سیاہ اور تحریر سفید ہے۔ اس میں فرق یہ ہے کہ پہلے میں "باہتمام محمد ممتاز علی خاں" درج ہے، دوسرے میں نہیں ہے۔ پہلے میں "طبع شدہ" ہے اور دوسرے میں "طبع گردید" ہے۔

یہ تحریری خطی اور تزئینی فرق دونوں کے الگ الگ طبع ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے محتاط انداز میں لکھا ہے۔

> "یقینی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن میرا قیاس ہے کہ جس کتاب کے سرورق پر باہتمام محمد ممتاز علی خاں، لکھا ہوا ہے یہ وہ ایڈیشن ہے جو پہلے چھپا تھا۔"

خطی، عبارتی اور تزئینی فرق کے پیش نظر ہمارا خیال بھی یہی ہے کہ پہلے چھپنے والا سرورق وہی ہے جس کا نسخہ ہماری ملک ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جس کا عکس مجلس ترقی ادب کی مطبوعہ "عود ہندی" میں چھاپا گیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کتاب کے اجرا اور سرورق کی دوبارہ طباعت کے متعلق کچھ وجوہ بیان کی ہیں۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں:

> تیسری صورت جو قرین قیاس ہے وہ یہ ہے کہ "عود ہندی" کے ۱۸۴ صفحات چھپ چکے تھے۔ قطعہ تاریخ طباعت کے انتظار میں چار صفحے کی آخری کاپی چھپنے کی نوبت آئی تو منشی ممتاز علی خاں کو خیال آیا کہ "عود ہندی" کی مانگ بہت زیادہ ہے اور انھوں نے جتنی کتابیں چھپوائی ہیں وہ ناکافی ہیں

۱۸۴ صفحے چھپے ہوئے کافی دن ہوگئے تھے اس لیے پریس میں ان کے پتھر بھی صاف کردیے گئے تھے۔
تھے۔ مجبوراً ۱۸۴ صفحات کی کتابت کرا کے انھیں چھاپا گیا۔ آخری چار صفحے اتنی تعداد میں شائع کیے
گئے کہ وہ پوری کتاب کے لیے کافی ہوں!"

یہ بیان مبنی برحقیقت ہے۔ آخری چار صفحے پہلے چھاپ کر چھپے ہوئے فرموں کی جز بندی پہلے ہوئی یہی
وجہ ہے کہ پہلے سرورق والی کتاب کی شکل الگ ہے۔ اگر جز بندی دونوں طباعتوں کی ایک ساتھ ہوتی تو فرمو ں
کے گڈ مڈ ہوجانے کا امکان تھا۔ اور کتاب میں یکسانیت نہ رہتی۔ جب تک پہلے فرموں کی جز بندی ہو کر کتاب
قابلِ اشاعت ہوئی اس وقت تک دوسری طباعت کا عمل جاری رہا۔ ممتاز علی خود کتب فروش تھے انھیں کھپت
اور طلب کا اندازہ بعد میں ہوا۔

پہلی طباعت کی ایک بہت بڑی خصوصیت ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ بتائی ہے:

"مخطوطات میں اور انیسویں صدی کی مطبوعات میں عام قاعدہ تھا کہ جس لفظ پر جفت صفحہ ختم ہوتا
تھا اسے دوسرے طاق صفحے کے شروع میں پھر لکھتے تھے۔ ایسا غالباً اس لیے کیا جاتا تھا کہ
اگر صفحات آپس میں مل جائیں تو انھیں ترتیب دیا جا سکے۔ "عود ہندی" کے ایک ایڈیشن
میں اس قاعدے کی پابندی کی گئی ہے جب کہ دوسرے میں بالکل نہیں کی گئی۔"

یہ بیان درست ہے لیکن یہ قاعدہ عام نہیں تھا۔ میری نظر سے بہت سے مخطوطات گزرے ہیں ان میں عام
قاعدہ یہ پایا گیا کہ جفت صفحہ کی رکاب میں طاق صفحہ کا ابتدائی لفظ بطور ترک لکھا ہوا ملا ہے۔ یہ طریقہ جب مطبوعات
میں اختیار کیا گیا تو اس طریقے کے علاوہ جفت صفحہ کی آخری سطر سے ملحق بائیں حاشیہ میں طاق صفحہ کا ابتدائی لفظ لکھا گیا
ایسی بہت سی کتابیں نظر سے گزری ہیں جو بمبئی، لکھنؤ، کانپور اور دوسرے مقامات کی مطبوعہ ہیں مثلاً "تاریخ افغاناں"
مطبوعہ بمبئی میں مخطوطات کی روشنی کے مطابق ترک رکاب میں ہے۔ "کیمیائے سعادت"، "جواہر العجائب"، "ممتاز عمر
تقدیر و تدبیر"، "بہار دانش"، "میزان الطب"، "ابواب الجنان"، "حیات القلوب جلد دوم و سوم" میں جفت صفحہ کی آخری
سطر سے ملحق بائیں حاشیے پر طاق صفحہ کا ابتدائی لفظ بطور ترک لکھا گیا ہے۔ "غیاث اللغات" مطبوعہ لکھنؤ میں کسی ایک
روش کی پابندی نہیں کی گئی اس میں ترک بائیں حاشیے پر بھی ملتا ہے اور جفت صفحہ کا حرف آخر طاق صفحہ کے آغاز
میں بھی، اور بیشتر ایسے ہیں جن پہ یہ روش اختیار نہیں کی گئی اور آخری فرمہ کے طاق صفحات ۱۸۵، ۱۸۷ کے آغاز
میں صفحات ۱۸۴، ۱۸۶ کا آخری لفظ نہیں لکھا گیا۔ بہر حال ڈاکٹر خلیق انجم کی اس نشان دہی کی بدولت کتب میں
ترک نویسی کے مختلف طریقے سامنے آگئے۔ ہمارے پاس وہی ایڈیشن ہے جس میں ترک نویسی کا مذکورہ
طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

مصنفین کاتبوں کی ستم ظریفی کا کس کس طرح شکار ہوتے ہیں، ہمیں اس کے بڑے تلخ تجربے ہوتے ہیں
اور ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم بھی اس کا شکار ہوتے ہیں۔ "عود ہندی" ہی کے سلسلے میں یہ عبارت ملاحظہ فرمایئے:

"انوار الدولہ سعد الدین خان بہادر شفق کے نام غالب کے ایک خط کے اختلافاتِ نسخ ملاحظہ ہوں
اس سے اندازہ ہوگا کہ میرا پریشان ہونا کہاں تک جائز ہے۔

میرا تیار کیا ہوا متن قصیدو (میں نے اس لفظ کے بارے میں حاشیے میں لکھا تھا کہ "قصیدو" سہو کاتب ہے۔ یہ لفظ "قصیدہ" ہے۔	عود ہندی پہلا ایڈیشن (انجمن) قصیدہ
ہرزہ	ہرذرہ
آوارہ (میں نے لکھا تھا کہ طباعت کی غلطی ہے اصل لفظ "اوروہ" ہے)	اوروہ
ہمشیر	باہمشیر
سفر	اس نسخے میں یہ لفظ ندارد
حضور والا	حضور والد

ایک ہی خط میں اتنے اختلافات نسخ دیکھ کر میں نے سوچا کہ میرا سب کام بیکار ہوگیا"
ڈاکٹر خلیق انجم کا پریشان ہونا بالکل بجا تھا کہ ان کی کی کرائی محنت پر پانی پھر رہا تھا لیکن محترم کاتب نے اس عبارت میں آخری سطر کے الفاظ "حضور والا" "حضور والد" کو بالکل الٹ پلٹ کر دیا ہے۔ پہلے "حضور والد" ہونا چاہیے کہ یہ قرات عود ہندی کے پہلے نسخہ کی ہے اور انجمن کے نسخے کی قرارت "حضور والا" ہے۔ اس کے بعد کی عبارت ملاحظ فرمایئے: جس میں محترم کاتب کی غفلت سے دو جملے نہیں لکھے گئے اور عبارت بالکل مبہم ہوگئی ہے۔
اس کا متن تقریباً وہی ہے جو انجمن کے پہلے ایڈیشن کا ہے اور اس سے مختلف ہے جو میں نے تیار کیا تھا کیوں کہ اختلافات نسخ میں انجمن کے جس ایڈیشن کے اختلافات دیے گئے ہیں وہ مجلس ادب کے مطبوعہ نسخے میں فاضل لکھنوی نے درج کیے ہیں: "قصیدہ" "اوروہ" "حضور والا" ہی چھپا ہے" باہمشیر" کا اختلاف ظاہر کیا ہے اور "سفر" نہ ہونے کی نشان دہی کی ہے۔ ہمارے پاس جو نسخہ وہ وہی ہے جس سے ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنا متن تیار کیا تھا۔ یہ نسخہ انھیں بعد میں انجمن میں دستیاب ہوگیا۔ ایک کتاب کے دو بیک وقت چھپنے والے نسخے سامنے آئے تو یہ فیصلہ کرنا واقعی دشوار ہے کہ متن کی بنیاد کس کو بنایا جائے۔ جب کہ دونوں میں کافی اختلافات نسخ پایا جاتا ہو۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

> "اس لیے متنی نقاد کے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ دونوں ایڈیشنوں کو بنیادی نسخوں کی حیثیت سے استعمال کرے۔ میں نے "غالب کے خطوط" کے تنقیدی ایڈیشن کی تیاری میں ایسا ہی کیا ہے۔"

ہم بھی ڈاکٹر خلیق انجم کے اس بیان سے متفق ہیں کہ دونوں نسخوں کے اختلافات ظاہر کرنے انتہائی ضروری ہیں۔ ہم نے "عود ہندی" سے متعلق ڈاکٹر خلیق انجم کے بیانات کی تائید، توثیق اور تصدیق کی ہے اور کچھ امور بطور وضاحت بیان کر دیے ہیں۔ مقصد ان کی محنت و جاں فشانی کی پذیرائی کرنا ہے۔ ہم نے نگار کراچی میں مطبوعہ خطوط غالب کے ایڈیشن اور ری پرنٹ کو سامنے رکھا ہے جسے ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب "غالب کے خطوط" کی جلد اول کے عکس لے کر چھاپا گیا ہے۔ انشاء اللہ بھرپور تبصرہ و جائزہ کتاب دستیاب ہونے پر پیش کیا جائے گا۔ ان کے کام کی صحیح طور پر قدر وقیمت، مرتبہ اور حیثیت اسی وقت قائم ہو سکے گی۔ اس وقت تک جو کام ہمارے سامنے آیا ہے وہ نہایت وقیع اور فکر انگیز ہے۔ جس کے لیے موصوف مستحق داد و تحسین ہیں۔

رفعت سروش

ڈاکٹر خلیق انجم

ملا کی دوڑ مسجد تک۔ اور شاعر کی دوڑ اردو بازار تک۔ یہ کہاوت کم از کم اس وقت تک سچ تھی جب میں اگست ۵۸ء میں بمبئی سے دلی آیا اور بلی ماران کی گلی سوداگراں میں مقیم ہوا۔ کوئی ایسی شام نہ ہوتی ہوگی جب میں اردو بازار نہ جاتا ہوں۔ اور میں ہی کیا، اس زمانے میں اکثر شاعر اور ادیب شام کو جامع مسجد کی سیڑھیوں کے آس پاس اور اردو بازار کی دوکانوں کے باہر رکھی بنچوں یا قہوہ خانہ قسم کے چائے خانوں میں نظر آتے تھے۔ البتہ اتوار کی شام کو اردو ہال کے بالاخانے پر چڑھ جاتے اور گلزار دہلوی کی لچھے دار باتیں سنتے اور انجمن تعمیر اردو کی ادبی اور تنقیدی نشست میں شریک ہو کر کچھ اپنی کہتے کچھ دوسروں کی سنتے۔

اردو بازار کا یہ کردار بہت پرانا ہے اور اسے کلاسکیت کی سند دے دی جائے تو شاید غلط نہ ہو۔ اردو بازار کی ان دوکانوں کی بنچوں اور تپائیوں پر بڑے بڑے اہل کمال بیٹھے اور جب اٹھے تو یہاں سے علم و شعر کی دولت لے کر اور اس دولت کو دنیا تک پہنچایا۔ میں خود دوسری جنگ عظیم کے دوران ۴۳ء سے ۴۵ء تک یہاں رہا، اس بازار کی ایک گلی خان خاناں میں، اور یہاں کس کس کے ساتھ نہ بیٹھا۔ شاہد احمد دہلوی، حسن عسکری، حقی حزیں تابش دہلوی، ہلال سیوہاروی، عطا محمد شعلہ، آغا سرخوش، نخشب جارچوی، اسرار الحق مجاز، منشی عبدالقدیر اختر الایمان خورشید الاسلام، راز مرادآبادی، شکیل بدایونی، محشر بدایونی، جوہر سعیدی، نظر امروہوی، صابر دہلوی، طالب دہلوی، جمیل الدین عالی، رشید اگجراتی، طور سیوہاروی، گلزار دہلوی۔ کس کس کے نام گناؤں اور اب تیرہ سال بعد بھی اس بازار کی رونق میں کوئی خاص کمی نہیں تھی۔ اگرچہ اس عرصہ میں ملک ایک عظیم انقلاب سے گزر چکا تھا۔ اور ۴۷ء میں دلی میں خون کی ہولی کھیلی جا چکی تھی۔ شاہد احمد دہلوی کا مکتبہ علم و ادب اور "ساقی" اور آغا سرخوش قزلباش کا "چمنستان" پاکستان سدھار چکا تھا۔ مگر مرا ہاتھی سوا لاکھ کا۔ اس پٹی گھسی دلی میں بھی اردو بازار کا وہی حال تھا اور مولانا سمیع اللہ قاسمی کی "خانقاہ عزیزیہ" مولانا کی روایتی وضع داری کی آج بھی گواہی دیتی تھی۔ اور ان کی بنچوں اور تپائیوں پر آج بھی اردو کے ادیب، شاعر، دانشور رات گئے تک نظر آتے تھے۔ ہاں نام اور چہرے بدل گئے تھے۔ سوائے مولانا سمیع اللہ مرحوم، اور گلزار دہلوی کے۔ یہ دونوں پرانی اس حسین روایت کا تسلسل تھے۔ اور ان کے علاوہ اب یہاں اور جو لوگ برابر نظر آتے تھے وہ بھی زمانہ میں انتخاب تھے۔ بسمل سعیدی ٹونکی، انور صابری میر مشتاق احمد، عبداللہ نقوی، رام کرشن مضطر، عزیز وارثی، بہار برنی، رعنا جگی، محسن زیدی، مخمور سعیدی، پریم شنکر فرحت

کامل نظامی، شمیم کرہانی، مشیر جھنجھانوی، فرقت کاکوروی، غلام احمد علمی، اظہار اثر، عشرت کرتپوری، اسلم پرویز، کمال حسین خلیق انجم، نثار احمد فاروقی، اور دوسرے بہت سے نوجوان اردو لوگ جو نئی دلی کی کالونیوں میں بستے تھے وہ بھی جب کبھی اس علاقے سے گزرتے تو خانقاہ عزیزیہ میں ضرور حاضری دیتے۔ جیسے روش صدیقی، ساغر نظامی، سہیل عظیم آبادی، سلام مچھلی شہری، جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، نریش کمار شاد وغیرہ۔

دلی جانا پہچانا شہر تھا مگر اس منظر نامے میں چند مشاہیر کو چھوڑ کر میری کسی سے شناسائی نہ تھی۔ آہستہ آہستہ سب سے یارانہ ہو گیا۔ دراصل انجمن تعمیر اردو کے ہفتہ وار جلسے اس نئے اتحاد کے سلسلے میں ایک تاریخی رول ادا کر رہے تھے اور دلی میں باہر سے آنے والوں کو بھی معلوم تھا کہ جس طرح ۴۷ء سے قبل اتوار کی شام کو خواجہ محمد شفیع کے مٹیا محل والے بالاخانے پر سب ادیب و شاعر مل جاتے تھے۔ اسی طرح اب اردو ہال میں انجمن تعمیر اردو کی نشست میں سب سے ملاقات ہو جائے گی۔ غرض کافی گہما گہمی تھی۔ "محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے"۔

انجمن تعمیر اردو کے جلسے ہی میں ڈاکٹر خلیق انجم سے تعارف ہوا اور یہ نوجوان صاحبزادے مجھے خاصے تیز طرار نظر آئے۔ درمیانہ قد و قامت سوچتی ہوئی آنکھیں، فراخ دل چہرہ کے کشادہ خدوخال سے نمایاں، آواز میں دل گداز کھوج، تیکھا لب و لہجہ مگر اس تیکھے پن پر ہلکی سی ظرافت کی آمیزش کہ سننے والے کو ناگواری نہ ہو اور کہنے والا اپنی بات مزے سے کہہ جائے۔ اس وقت میری عمر ۳۶،۳۵ سال تھی اور ریڈیو میں ملازمت کرتے ہوئے تیرہ چودہ سال بیت چکے تھے مگر شاید میں اپنی عمر سے کم لگتا تھا۔ ایک قہوہ خانے میں چائے کی میز پر خلیق انجم نے اچانک مجھ سے پوچھا کہ پرانے رسالوں میں جس رفعت سروش کی نظمیں ملتی ہیں وہ کون صاحب تھے۔ میں نے انکساری سے کہا کہ میں ہی ہوں۔ ان کے چہرے سے کچھ ندامت کا اظہار ہوا مگر بولے کچھ نہیں۔ لیکن میں نے اس دن خلیق انجم کو ایک عام کھلنڈرے نوجوان سے کچھ مختلف محسوس کیا کیونکہ ان کا سوال اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ یہ جناب صرف دلچسپ گفتگو ہی نہیں کرتے، پڑھتے بھی ہیں۔ میری نظمیں ۴۳ء سے "ہمایوں" "ادبی دنیا" "شاہکار" اور دوسرے معیاری رسالوں میں چھپنے لگی تھیں۔ اور "نیا ادب" "سویرا" "ساقی" "شاعر" "شاہراہ" کوئی معیاری ادبی جریدہ ایسا نہ تھا جہاں میں نہ چھپا ہوں۔ وہ رسائل خلیق انجم کے مطالعے میں رہتے تھے اور ان کی نظر سے میرا نام اور میری نظمیں اس طرح گزری تھیں کہ کلام اور نام ان کے ذہن میں محفوظ تھا۔ غالباً خلیق انجم کا خیال تھا کہ میں اختر انصاری کی طرح اپنا نقلی نام رفعت سروش رکھ لیا ہے۔ شاید بعض لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ ۴۵ء میں مشہور و معروف شاعر اور نقاد اختر انصاری کا کلام ایک صاحب نے چرالیا اور راتوں رات مشہور ہو گئے جب بات زیادہ بڑھی تو شاہد احمد دہلوی نے اس دلچسپ واقعے پر "ساقی" میں ایک مضمون لکھا اور نقلی اختر انصاری کو متنبہ کیا کہ وہ اپنا نام بدلیں یا اپنے نام کے پیچھے کچھ اور اضافہ کریں۔ تب ان ذات شریف نے اپنے آپ کو اختر انصاری اکبر آبادی لکھنا شروع کیا۔ تقسیم وطن کے بعد وہ صاحب پاکستان چلے گئے تھے۔ کسی ظریف الطبع نے ایک شعر بھی کہا تھا جو خوب مشہور ہوا ہے

ملک جب تقسیم ہوا اپنے ہاتھ کیا آیا
ایک اختر انصاری وہ بھی اکبر آبادی

بہرحال کچھ رسائل کے بارے میں گفتگو کے بعد خلیق انجم کو یقین ہو گیا کہ میں نقلی رفعت سروش نہیں ہوں۔ اور میں نے بھی انھیں پڑھا لکھا تصور کیا اور اب تو یہ عالم ہے کہ وہ بہت ہی زیادہ پڑھنے لگے ہیں۔ دو درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور نہ جانے کتنی کتابوں کے مرتب اور مترجم اور ایسے ہونہار کہ ۵۳ء کے بالکل آخری مہینے دسمبر

میں پیدا ہوئے اور بیس اکیس سال کی عمر میں ایم اے کرتے ہی کروڑی مل کالج میں لیکچرر مقرر ہو گئے۔ بعد میں پی ایچ ڈی، ڈپلوما ان لائبریری سائنس اور ڈپلوما اِن لنگوسٹک دلی یونیورسٹی سے کیا۔ جب ابتدا ہی شاندار اور تیز رفتار ہو تو ترقی کی منازل تیزی سے کیوں نہ طے ہوں۔ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے وہ صرف ۳۸،۳ سال کی بھری جوانی میں اس کرسی پر متمکن ہو گئے جس سے ابھی ابھی بزرگ ادیب پروفیسر آل احمد سرور اترے تھے۔ اور جسے ان سے قبل قاضی عبدالغفار اور مولوی عبدالحق نے وقار بخشا تھا۔ وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے اور اس روایت کو بڑی شان سے آگے بڑھایا جو اس عہدۂ جلیلہ سے وابستہ تھی۔

میں نے ڈاکٹر خلیق انجم کو ایک شاداب پودے کی طرح بڑھتے اور پھولتے پھلتے دیکھا ہے۔ اور ان کی گزشتہ تیس سالہ زندگی میری نظر میں ہے۔ یتیمی اور گھر کے "نامساعد حالات اکثر اوقات "مس خام کو کندن" بنا دیتے ہیں مگر اس اذیت ناک لطافت کا اندازہ کچھ وہی کر سکتے ہیں جو اس منزل سے گزرے ہوں۔ اس کی تفسیر نہ فلسفوں کی کتابوں میں مل سکتی ہے نہ نصیحتوں کے بے معنی دفتروں میں سمجھا جا سکتا ہے۔ جن بچوں کو ایام طفلی سے ہی اس سفاک معاشرے اور حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے ان کی ہمتیں بہت جلد جوان ہو جاتی ہیں۔ اور عزائم میں فولاد کی سی صلابت آجاتی ہے۔ اور پھر عملی زندگی کی دشواریاں اور صعوبتیں انھیں طفلانہ کھیل معلوم ہوتی ہیں۔ بچپن سے ہی خود اعتمادی اور ذاتی جدوجہد ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ اور وہ کمزور بیساکھیوں کے سہارے کی بجائے اپنے قوت بازو اور اپنے فکر و عمل پر بھروسہ کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ خلیق انجم کو بھی آٹھ سال کی عمر سے ہی ان اذیت ناک "لطافتوں" کا ذائقہ چکھنے کا موقعہ میسر آیا۔ اور انھوں نے دنیا سے وہ سب کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی جو اس معاشرے میں انھیں اپنا حصہ محسوس ہوا۔ یقینی علم، باعزت زندگی، پر وقار ملازمت، ہم چشموں میں احترام، اور اعلیٰ رہن سہن، خوب صورت اور پرسکون گھر جہاں محبت کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ اور یہ سب کچھ جادو کی چھڑی سے حاصل نہیں ہوتا۔ انسان کو قدم قدم پر جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ اور خلیق انجم کی زندگی اس کی ایک درخشاں اور قابل تقلید مثال ہے۔

خلیق انجم سے جب میری ملاقات ہوئی تو وہ خلیق احمد خاں سے خلیق انجم بن چکے تھے۔ ظاہر ہے یہ خوب صورت قلمی نام شاعری جیسی سادہ فن کو زیر کرنے کے لیے رکھا ہوگا۔ شاید شاعری ان کے زیر دام نہ آسکی اور یونیورسٹی میں تحقیقی مقالہ لکھنے کے دوران ہی انھوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ ؎ "کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے"

انھوں نے صرف بائیس سال کی عمر میں، ۱۹۵۵ء میں "معراج العاشقین" مرتب کر کے یہ ثابت کر دیا کہ صاحبو! مجھے لڑکا نہ سمجھنا۔ میں نے تخلص ضرور رکھ لیا تھا مگر میں وہ نہیں جو دس بیس روپے کے لیے مشاعرہ پڑھتے پھروں اور اپنی ہوٹنگ کرا کر باپ دادا کی عزت بھی گنوا دوں۔ میری منزل کہیں اور ہے۔ کہاں؛ شاید ابھی مجھے بھی نہیں معلوم بس! ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

جب خلیق انجم سے میری ملاقات ہوئی اس وقت وہ "معراج العاشقین" مرتب کر چکے تھے۔ اور کروڑی مل کالج میں لیکچرر ہو چکے تھے اور پھر انھوں نے اپنے کالج کے پرنسپل اور دوسرے ارباب حل و عقد پر کچھ ایسا رعب جمایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے چند سال میں سینئر لیکچرر ہو گئے۔ اور ان کے درخشاں مستقبل کے بارے میں قیاس آرائیاں کی جانے لگیں۔ کوئی اور ہوتا تو یونیورسٹی کے ماحول میں اپنے آپ کو گم کر کے گوشہ نشیں ہو چکا ہوتا۔ مگر خلیق انجم تیز رو آدمی ہیں تیز سوچتے ہیں اور انھیں شاید اس معاشرے سے حساب کتاب چکانے کی جلدی تھی۔ بچپن سے ہی

جس نے ان کے ساتھ نازیبا سلوک کیا تھا۔ وہ چونکہ لڑائی لڑنے کے موڈ میں تھے۔ سیاست بامِ عروج پر پہونچنے کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ بشرطیکہ مضبوط زینہ ہاتھ آجائے۔ خلیق انجم موقع ملنے پر ایسا اقدام کرنے سے نہیں چوکے اور ایک با اثر ممبر پارلیمنٹ سبھدرا جوشی کے اشاعتی ادارے سے منسلک ہو گئے۔ سیکولر ڈیموکریسی (اردو) کے ایڈیٹر بن گئے۔ اور وہاں رہ کر ملک کی سالمیت، قومی یکجہتی اور کانگریس کی مضبوطی کے لیے دن رات کام کیا۔ اور رسالہ چمک اٹھا اور وہ وقت بھی آیا جب لیڈران کرام عوام سے اپنی خدمات کا صلہ مانگتے ہیں۔ الیکشن کا رن پڑا۔ خلیق انجم کو کانگریس نے ان کے علاقے سے میٹروپالیٹن کونسل کا ٹکٹ دے دیا۔ اور افواہ پھیل گئی کہ اگر خلیق انجم جیت گئے تو ایگزیکیٹو کونسلر تو بن ہی جائیں گے۔ مگر خدا بھلا کرے علاقے کے ووٹروں کا کہ وہ علم و ادب کے اس دُرِ بے بہا کو سیاست کی بھٹی میں نہیں جھونکنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ضمانت ضبط ہوئی اور ان کے لیے ایوانِ علم و ادب کے نئے دروازے کھل گئے۔ اردو کو اس کا حق دلانے کے لیے گجرال کمیٹی کا کام پھیلا تو ۷۲ء میں ڈاکٹر خلیق انجم کی خدمات وزارتِ تعلیم نے بحیثیت ڈائرکٹر کے حاصل کر لیں۔ اب گویا وہ ایک روشن راہ پر گامزن تھے اور انھیں اپنے جوہر دکھانے کے مواقع میسر تھے۔ کیوں کہ گجرال کمیٹی میں اس وقت کے سب مرکزی دانشور تھے اور ملک کے گوشے گوشے میں کمیٹی کو لوگوں سے ملنا تھا۔ اور ہر طرح کے لوگوں سے ملنا تھا۔ خلیق انجم نے گجرال کمیٹی کی رپورٹ تیار کرنے میں دن رات ایک کر دیا اور اس بہانے انھوں نے اردو کے ساتھ اپنی انگریزی کو بھی صیقل کیا گجرال کمیٹی کے سربراہوں میں ملک کے منتخب لوگ تھے اور انھیں کام کی پرکھ تھی۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے نئے جنرل سکریٹری کا انتخاب اردو والوں کے لیے ایک اہم مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اس عہدے کے لیے بہت سے مشہور و معروف شاعر اور دانشور اور معلمانِ اردو امیدوار تھے مگر قرعۂ فال ڈاکٹر خلیق انجم کے نام نکلا جو ان سب میں کم عمر تھے۔ اور جب انھیں انجمن ترقی اردو (ہند) کی کرسی پیش کی گئی تو انھیں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آئی۔ میرے کانوں میں اس جلسے کی گونج ہے جو غالب اکیڈمی میں خلیق انجم کو اس موقع پر مبارکباد دینے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ پروفیسر آل احمد سرور کی جوتیوں کے طفیل ترقی پانے والے کئی ادیبوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے سابق جنرل سکریٹری کی نسبت جن غیر ذمہ دارانہ خیالات کا اظہار کیا اس سے خود خلیق انجم بھی متفق نہیں تھے سرور صاحب، سرور صاحب تھے۔ اور ہیں۔ انجمن کی کرسی ان کے اعزاز میں کوئی اضافہ نہ کر سکتی تھی مگر ذکر ہے ان ابن الوقتوں کا جو نئے جنرل سکریٹری کی خوشنودی کے لیے یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی نئی ذمہ داری کو بہت خوش اسلوبی سے سنبھالا۔ ہندوستان گیر دورے کیے آڑے ترچھے لوگوں کو راہ راست پر لائے۔ بڑے بڑے سرپھروں کو رام کیا۔ انجمن کے دفتر کی چولیں بٹھائیں۔ اردو گھر کی تعمیر شروع ہو کر رک گئی تھی مگر خلیق صاحب کے قدموں کی برکت تھی کہ کام پھر شروع ہو گیا۔

آج کچھ، کل کچھ، قصرِ اردو آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ خلیق صاحب کی انتھک محنت، سوجھ بوجھ اور تدبیر نے ان خدشات کو باطل کر دیا کہ یہ لڑکا کیا انجمن چلائے گا۔ انجمن میں آکر خلیق صاحب کے بالوں پر تو خضاب لگ گیا مگر انجمن پر جوانی آگئی۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ اب انجمن کا اشاعتی ادارہ خود کفیل ہے۔ ہفت روزہ "ہماری زبان" اور سہ ماہی "اردو ادب" خلیق انجم کی ادارت میں پابندی سے نکلتے ہیں اور انجمن کی علاقائی شاخیں پہلے سے کہیں زیادہ فعال ہیں۔ ظاہر ہے اس لیے کہ اب جنرل سکریٹری جز وقتی نہیں، کل وقتی جنرل سکریٹری ہے۔ انجمن کا تنخواہ دار ملازم محنتی اور اکلِ حلال پر یقین رکھنے والا۔

مگر وہ خلیق انجم ہی کیا جو صرف کسی ایک ایوان میں یا ایک ادارہ میں محبوس ہو کر بیٹھ رہے۔ اگرچہ اکثر ملازم پیشہ لوگوں کا یہ مزاج ہوتا ہے۔ مگر خلیق انجم تو سیماب صفت ہیں۔ بے پناہ عملی قوت کے مالک ہیں۔ اور جب تک زندگی میں جو کھی لڑائی نہ لڑیں ان کے دماغ پر غنودگی طاری ہونے لگتی ہے۔

لکچر رشپ، اسیکو لرڈیموکریسی، الیکشن، گجرال کمیٹی، انجمن ترقی اردو ہند، یہ سب اپنی جگہ مگر جو نوجوان ۲۱ برس کی عمر میں "معراج العاشقین" کا مرتب تسلیم کر لیا گیا تو تصنیف و تالیف کی نے دو آتشہ سے کیسے دور رہ سکتا ہے ؎

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

یہ راز تو خلیق انجم نے کروڑی مل کالج کی سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے جان لیا تھا کہ ان کی زندگی لفظ سے وابستہ ہے، ادب و شعر کی علامت سے عبارت ہے۔ چناں چہ وہ دنیا کے ہزار جھمیلوں میں پھنسے رہے لیکن ان کے علمی کردار پر نظر ڈال کر دیکھیے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ شخص اپنی تصانیف اور تالیفات کے سلسلے میں بھی ان لوگوں سے بہت آگے ہے۔ جنھوں نے اپنے ذوق مطالعہ کا ڈھنڈورا پیٹ کر زندگیاں اپنے گھروں کے محبسوں میں گزار دیں جن کا بقول ان کے لوگوں سے زیادہ ملنے سے علمی کام میں خلل پڑتا ہے۔ کلاسیکی ادب سے محبت خلیق انجم کی رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ اور قدما کی تفہیم ان کے ذوقِ جستجو کو سکون پہونچاتی ہے۔ انھوں نے مرزا مظہر جان جاناں کے فارسی خطوط کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ غالب کی نادر تحریروں کو جمع کیا۔ مرزا محمد رفیع سودا کا مطالعہ اپنی ایک ضخیم تصنیف کی شکل میں پیش کیا۔ کربل کتھا کا لسانی مطالعہ کیا۔ "افادات سلیم" مرتب کی اور "متنی تنقید" جیسی کتاب لکھی جو اردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ یہ سب اہم کام وہ اس دور میں کر چکے تھے جب وہ انجمن ترقی اردو ہند کی کرسی تک نہیں پہنچے تھے۔ اور بعض اوقات بے حد غیر شاعرانہ اور غیر ادبی فرائض کی ادائگی میں منہمک نظر آتے تھے۔ اور انجمن میں آجانے کے بعد انھیں کب سکون کا سانس لینا نصیب ہوا ہوگا۔ انجمن کی اکھاڑ پچھاڑ پہاڑ سی بلڈنگ کی تعمیر پھر ہندوستان کے کونے کونے میں علاقائی انجمنوں کے مسائل سے جوجھنا، دانشورانِ اردو سے معاملہ کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ اور پھر حکومتِ وقت اور عوام کے تقاضوں میں ایک توازن برقرار رکھنا بھی ایک دردِ سر ہے۔ یہ سب اپنی جگہ مگر کتابوں کی ایک کہکشاں ہے جو خلیق انجم کی ذہانت کا ثبوت ہیں۔ اس دور میں ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ چار ضخیم جلدوں میں مرزا غالب کے خطوط کی ترتیب ہے۔ غالب پر ان کی اور بھی کئی کتابیں ہیں۔ مگر خطوطِ غالب کی ترتیب اور طویل مقدمے نے انھیں ماہرینِ غالب کی صف میں امتیازی مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔ اگر خلیق انجم صرف یہی کام کرتے تب بھی اردو دنیا ان کو فراموش نہیں کر سکتی تھی مگر اس کے علاوہ بھی ان کے کام کی بہت سی جہتیں ہیں اور ان کی مرتبہ کتابوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ "آثار الصنادید" پر ان کا کام سامنے آگیا ہے۔ سرسید کی اس نادرِ روزگار تصنیف کو خلیق صاحب نے تین جلدوں میں ایڈٹ کر کے اپنے علمی تبحر کا ثبوت دیا ہے۔ اپنی نوعیت کا یہ اردو میں پہلا کام ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں ابھی ان کی زنبیل میں بہت کچھ باقی ہے۔

پچیس تیس سال سے ہی تقریباً ایسی ہی علمی کتابوں پر اردو کے ادبی سرمایے میں وقیع اضافہ کرنے والا ڈاکٹر خلیق انجم گوشہ تنہائی میں نہیں، بلبلِ ہزار داستان کی طرح ہر جگہ چہکتا نظر آتا ہے۔ چاہے اردو بازار ہو یا یونیورسٹیوں کے کیمپس، ہند اور بیرونِ ہند کے مختلف شہروں اور ملکوں میں سمینار ہوں یا اردو اور فروغِ علم و فن کے لیے کانفرنسیں اور جلسے یا آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے اسٹوڈیو ——— خلیق انجم اعلیٰ پایے کے براڈ کاسٹر ہیں اور یہ میں

اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر عرض کر رہا ہوں۔ میں اکتوبر ۸۴ء میں دودھ بھارتی سے اردو مجلس دہلی آیا تو اردو ادیبوں اور شاعروں سے دفتری سطح پر بھی ملاقاتوں کی نوبت آئی۔ میں بخاری صاحب کے زمانے کا پرانا آدمی۔ ہمیں سکھایا گیا تھا کہ نشر ہونے سے قبل ایک ایک لفظ کو تولو۔ بری عادت پڑی ہوئی تھی۔ اور اردو مجلس میں یہ عالم تھا کہ جو جب لکھ لایا ریکارڈ کر گیا۔ کسی موضوع پر خلیق انجم کو تقریر کے لیے بک کیا گیا۔ تشریف لائے۔ میں نے اسکرپٹ دیکھا تو محسوس ہوا کہ روا روی میں لکھا ہے۔ میں نے کہا۔ خلیق صاحب آپ بائیں ہاتھ سے لکھ لائے ہیں۔ یہ محاورہ ہمارے ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر گوپال داس صاحب استعمال کیا کرتے تھے۔ خلیق صاحب بولے۔

"کیوں آپ کو پڑھنے میں کچھ دقت ہو رہی ہے؟"

"نہیں میرا مطلب ہے آپ نے روا روی میں اسکرپٹ لکھا ہے۔"

چپ ہو رہے، ریکارڈنگ ہو گئی۔ مگر وہ میرا مفہوم سمجھ گئے۔ اور اس کے بعد میں نے ان کے رویے میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ پھر تو وہ اردو مجلس کے ایسے براڈ کاسٹر بنے کہ جس موضوع پر بلایئے۔ آئیں گے اور پوری تیاری کے ساتھ۔ خلیق انجم ان لوگوں میں سے تھے جن کی میرے کسی پروگرام میں شمولیت پروگرام کی کامیابی کی ضمانت تھی۔ اور وہ بھرپور تعاون کرتے تھے۔ تقریر تو لوگ لکھ کر لے ہی آتے ہیں۔ مگر مذاکروں اور مباحثوں میں ہر لیتے وقت جوہر کھلتے ہیں کہ آدمی برجستہ کس طرح بول سکتا ہے اور اس کو اپنی زبان اور بیان پر کتنا عبور حاصل ہے کچھ مباحثوں میں انھوں نے میری توقع سے کہیں بہتر performance کی۔ میں نے داد دی تو بولے نہیں رفعت صاحب! میں تیار کر کے آتا ہوں اس کے علاوہ جس دن پروگرام ہوتا ہے اس دن ناشتہ کی میز پر میں اپنی بیوی کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرتا ہوں، جس سے بہت سے گوشے سامنے آجاتے ہیں۔ خلیق انجم کی بیگم موہنی انجم سماجیات کی پروفیسر ہیں اور وہ بھی اردو کی بہت اچھی براڈ کاسٹر ہیں۔ خلیق صاحب کے مزاج میں ایک کھلنڈرا پن ہے۔ مگر وہ عام طور پر جب قلم اٹھاتے ہیں تو سنجیدہ ادبی موضوعات پر ہی لکھتے ہیں۔ لیکن براڈ کاسٹنگ کے تجربات کی بنا پر میرا اندازہ تھا کہ وہ ہلکی پھلکی تقریر بھی لکھ سکتے ہیں۔ جن میں مقصدیت کے ساتھ طنز کی چاشنی بھی ہو۔ اپنے اس خیال کی تصدیق مجھے ان کا لکھا ہوا۔ استاد رسا کا خاکہ پڑھ کر ہو گئی۔ میں نے کوئی دلچسپ ہلکا پھلکا موضوع دیا انھیں پہلے تو وہ سٹپٹائے۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنے بے تکلف دوستوں کے ساتھ جس شگفتہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں بس اس طرح کی بات چیت کی زبان لکھیے۔ اور مقالہ بازی کو چھوڑیے۔ راضی ہو گئے۔ اور ایسی تقریر لکھ کر لائے جو اوروں کو پسند آئی سو آئی۔ خود انھیں بھی پسند آئی اور ایک عرصہ تک اس کا مزا لیتے رہے۔ اس کے بعد میں نے ان سے کئی مزاحیہ تقریریں لکھوائیں۔

عام طور پر محقق اور دانشور تنظیمی معاملات میں کچے ہوتے ہیں۔ وہ تو اپنے ہی خیالوں میں غرق رہتے ہیں مگر خلیق انجم میں بلا کی تنظیمی صلاحیت ہے۔ اور اس بے پناہ صلاحیت کا اظہار وہ اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہوئے تو کرتے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ثقافتی اداروں کی کمیٹیوں میں ان کی کارکردگی بے مثل ہوتی ہے اس کا تجربہ مجھے اس وقت ہوا جب اردو اکیڈمی دلی کی تشکیل ہوئی۔ مجھے بھی اس کا رکن بننے کی سعادت حاصل ہوئی اور خلیق صاحب بھی ایک اہم رکن بنے۔ انھوں نے تعلیمی کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے اس قدر تیز کام کیا کہ دلی ایڈمنسٹریشن شعبۂ تعلیم کو ناک چنے چبوا دیے۔ اور اردو اسکولوں کی حالت زار کو ٹھیک کرنے کے لیے انتھک کام کیا۔ اور جب اشاعتی کمیٹی کے چیرمین ہوئے تو کتابوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اسی طرح غالب انسٹی

ٹیوٹ کی سمینار کمیٹی میں ان کے طریقے کار کو میں نے قریب سے دیکھا۔ ان دنوں میں وہاں ڈائرکٹر تھا۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ میٹنگ میں اپنے ذہن کو تیار کر کے آتے ہیں اور اپنی بات بغیر کسی لاگ لپیٹ کے دو ٹوک کہنے پر قادر ہیں۔ ایسی میٹنگوں میں بعض دفعہ یہ صورت حال ہوتی ہے کہ نسبتاً بزرگ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ کہہ دیا۔ کہہ دیا۔ لیکن اگر ان کی بات حرف آخر کا درجہ رکھتی تو کمیٹی بنانا اور دوسرے لوگوں کو تبادلۂ خیال کے لیے بلانا کیا معنی! کیا صرف دکھاوے کے لیے میٹنگ ہوتی ہے۔ سب کو اپنی بات کہنے کا حق ہوتا ہے اور اختلاف رائے کا بھی۔ خلیق انجم اپنے خیالات استدلال کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اصولی بحث میں وہ مصلحت اندیشی کے قائل نہیں۔ اپنی بات پر اصرار کرنے کا فن جانتے ہیں کبھی سنجیدہ لب و لہجہ اختیار کیا تو کبھی ہلکے پھلکے فقرے سے کام چلالیا اور بوجھل ماحول کو سبک بنا دیا۔ اکثر ان کی بات کو تسلیم کرلیا جاتا ہے۔

اور یہ تو خیر ادبی انجمنوں کی باتیں ہیں جہاں ادب بہر حال قدر مشترک ہوتا ہے۔ خلیق انجم کی تنظیمی صلاحیتوں کے انداز دیکھنے ہوں تو ان گروپ ہاؤسنگ سوسائٹیوں کی کاروائی دیکھیے جہاں کبھی کبھی شیر مارکیٹ کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ ان سوسائیٹیوں میں سے کسی کے صدر ہیں۔ کسی کے سکریٹری، کسی کے محض ممبر مجلس عاملہ بھانت بھانت کے لوگ سوسائیٹیوں کے ممبر ہوتے ہیں اور چوں کہ پیسے کا لین دین بھی ہوتا ہے اس لیے ہر آدمی پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ اور کسی کو کسی پر سو فیصدی اعتبار نہیں ہوتا۔ ان سوسائیٹیوں کو چلانا، سب کی سننا، سب کا اعتماد حاصل کرنا، اور سب سے کم از کم ایسا معاملہ رکھنا کہ وہ ممبر شپ چھوڑ کر نہ بھاگ جائیں بڑا مشکل کام ہے۔ شاید انجمن ترقی اردو کے سالانہ اجلاس کی کارروائی چلانے سے بھی زیادہ مشکل۔ مگر ؎

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

دراصل خلیق انجم ہشت پہلو شخصیت کے مالک ہیں۔ اور ان کی ابتدائی زندگی کی جدوجہد نے ان میں غضب کی خود اعتمادی اور شانِ استغنا پیدا کردی ہے۔ اور اس معاملے میں وہ خوش قسمت شخص ہیں کہ مختلف سطحوں پر ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ وہ ملک کے بہت سے اہم اداروں کے رکن ہیں۔ اس لیے ہندوستان میں اردو کے فروغ کے لیے جو کام کیے جاتے ہیں ان میں بالواسطہ یا براہ راست وہ شامل ہوتے ہیں۔ ان کے علمی کارناموں کا اعتراف کیا جارہا ہے۔ اور بہت سے اداروں اور اکیڈمیوں سے انھیں انعامات و اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ اس نے ان کے مزاج میں غرور نہیں پیدا کیا۔ وہ اپنا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اور ان کا ذہن علم و ادب کے نئے نئے افق تلاش کرتا رہتا ہے۔ دراصل یہی ان کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اور یہی وہ رویہ ہے جو ان کے مزاج میں تلخی، بغض، حسد اور دوستوں سے بے اعتنائی نہیں آنے دیتا۔ ان کے بشاش بشاش اور ہر دم فعال رہنے کا یہی اسم اعظم ہے۔

کمال احمد صدیقی

غالب کی تحریر کے بارے میں ایک نیا گوشہ

(خطوطِ غالب، مرتبہ خلیق انجم کی روشنی میں)

غالب، بلاشبہ، اپنے عہد ہی کے نہیں، اب تک کے سب سے زیادہ اہم شاعر ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی شاعرانہ شخصیت کا محل متداول اور غیر متداول کلام غالب ہے یا ان کے خطوط۔ حالی کی یادگارِ غالب اور خطوطِ غالب مہیا نہ ہوتے تو غالب پر اتنی کتابیں بھی نہ ہوتیں۔

غالب شروع میں اس بات پر راضی نہیں تھے کہ ان کے خطوں کو جمع کر کے چھاپا جائے۔ اور یہ بات بھی ان کے خطوں ہی سے ثابت ہے۔ انھی خطوں میں انھوں نے اپنے کچھ شعروں کی تشریح بھی کی ہے۔ بعض موضوعات پر مختلف خطوں میں ان کے متضاد بیانات بھی ہیں۔ صرف عبدالصمد ہی کے بارے میں نہیں بلکہ آگرہ میں قیام کی مدت، اور شعر گوئی کے ابتدا کے بارے میں بھی۔ غالب کی سوانح اور ان کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے کے لیے ان کے خطوط بہت اہم ماخذ ہے، لیکن اس ماخذ سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔

غالب کے خطوط مختلف مجموعوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے جعلی کلام کی طرح، ان کے جعلی خطوط بھی تصنیف فرمائے گئے، اور ایک یونیورسٹی کے نصاب میں ایک جعلی خط بھی شامل کیا گیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم، "سودا" اور "مرزا مظہر جانِ جاناں" (جانِ جاناں)، اور "متنی تنقید" جیسے وقیع کام کے لیے جانے جاتے ہیں۔ لیکن اب جو "خطوطِ غالب" انھوں نے مرتب کیے ہیں، انھیں پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ متن کی تدوین جیسی انھوں نے کی ہے، پہلے خطوطِ غالب کے سلسلے میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اردو میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا کام ہے۔ انھوں نے قینچی سے نہیں ذہن سے کام لیا ہے۔ پہلی جلد کا مقدمہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس سے زیادہ نہیں تو اتنا ہی اہم کام حواشی کا ہے۔ ایک ایک لفظ مختلف نسخوں کے تقابلی مطالعے میں چیک کیا گیا ہے۔ جو واقعی بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے دوسروں کی طرح اوروں کے کام پر ڈاکہ نہیں ڈالا ہے، بلکہ فراخدلی سے حوالہ بھی دیا ہے اس سے ان کے قد میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ سے وہ ایک جگہ بہت بڑی غلطی سے بچ گئے، اور اس کی طرف میں اشارہ اس لیے بھی کر رہا ہوں کہ غالب کے سلسلے میں ہماری "تحقیق" ایک ہی طرح کے نکات اپنی زبان اور اپنے اسلوب میں بیان کرنے کے دائرے میں محصور ہو گئی ہے۔ جلد سوم میں ص ۱۳۰۵ پر نواب کلب علی خاں کے نام "بخطِ غیر" لکھوایا ہوا یہ خط ہے۔

حضرت عالی نعمت آیہ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے آج جو نواں دن ہے کہ توقیع وقیع عز ورود لایا ہے ہنوز
ملفوف کی رسید تنخواہ ششماہی ۶۸ کا سو روپیہ معرض وصول میں آیا ہے جواب کے
جلد نہ لکھنے کی وجہ یہہ ہے کہ مین گرمی کی شدت کی سبب سے اور احتباس ہوا سے
کہ جو لازمہ موسم برسات ہے بیکار محض ہو گیا ہون مطلق کچہ لکھہ نہیں سکتا
اور کوئی ایسا شخص نہ تھا کہ جس سے کچہ لکھواؤن اس چار روز مین تیسرا پاس ہے۔
آج اسوقت ایک صاحب آگئے اونسے مینے یہہ عریضہ لکھوا لیا —— پیر و مرشد
سابق کی عریضہ کے ساتہہ مینے اپنی تصویر حضور مین بھیجی ہے اوسکی رسید ارشاد نہ ہوئی
مین مرقوم تھی مجکو اندیشہ ہے کہیں وہ لفافہ ڈاک مین تلف ہو گیا ہو اگر اوسکی رسید سے شرف اطلاع پاؤن
تو دلجمعی ہو جاوے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہون دن پچاس ہزار ۱۵ جون ۱۸۶۰ء

۱۳۰۵

کتاب میں ص ۱۲۵۶ پر یہ خط نمبر ۶۸ کے تحت درج ہے۔ حواشی کے تحت ص ۱۴۰۳ پر اظہار ہے۔
"عرشی صاحب نے اس خط کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ غالب نے خود یہ خط نہیں لکھا، کسی اور سے لکھوایا ہے
لکھنے والے نے دل جمعی کو دل جمی لکھا ہے۔"
کمال عرض کرتا ہے کہ یہ خط نستعلیق میں خود غالب نے اپنے قلم سے لکھا ہے، اور "دل جمی" کا املا جان بوجھ کر غلط لکھا ہے۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام

اس خط کا عکس کوئی بیس برس پہلے پرتھوی چندر کے "مرقع غالب" میں دیکھ چکا تھا۔ اگرچہ وہ کتاب بھی آفسیٹ سے چھپی تھی، لیکن حروف اتنے شارپ نہیں تھے۔ شاید نگیٹو شیشے پر بنایا گیا ہوگا۔ مکاتیب غالب (مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی) میں بھی متن اور ان کا اظہار کہ یہ خط کسی اور سے لکھوایا گیا ہے، دیکھ چکا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب میں اس خط کا عکس دیکھا تو یہ غالب کی تحریر لگا۔ حروف، دائروں، جوڑوں اور اسلوب نگارش کا تجزیہ کیا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ واقعی غالب کی تحریر ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا نستعلیق خط کتنا اچھا تھا۔ اے کاش غالب نے اپنا کلام خود اس خط میں لکھا ہوتا۔
پاکستان میں مشفق خواجہ، ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور جمیل جالبی اور ہندوستان میں حیرت ہے کہ خلیق انجم نے متنی تنقید پر اہم کام کیا ہے لیکن اس نکتے پر اُن کی نظر بھی نہیں گئی۔
مخطوطہ شناسی کا دعوا میں بھی نہیں کرتا۔ ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور افسر اللہ نظر اس فن پر عبور رکھتے ہیں۔ تفصیل سے تو میں الگ اس کے بارے میں لکھوں گا۔ یہاں چند اشارے کروں گا۔
۱۔ القاب کے ساتھ سلامت بنا کر لکھا گیا ہے، لیکن آخری سطر میں یہ لفظ انھوں نے اپنے مانوس اسلوب میں لکھا ہے۔ (حالاں کہ ۸ جنوری کے خط میں (عکس ۲۹) سطر ۱۱ میں بھی سلامت ایسا ہی ہے)
۲۔ شروع کے دائرے بنا کر لکھے ہیں، لیکن آخر میں پھر اپنے اسلوب پر آ گئے ہیں۔
۳۔ کے میں کاف کا مرکز، اور کے کا زاویہ وہی ہے، جو ان کے مانوس اور مخصوص طرز نگارش میں ہے۔

۴۔ نون کے نقطوں کا مقام وہی ہے، جو ان کا مخصوص اسٹائل ہے۔
۵۔ کچھ اور لکھہ جیسے الفاظ بالکل ویسے ہی ہیں، جو ان کی اور تحریروں میں ہیں۔
۶۔ یا، معروف بھی اسی طرح کئی جگہ ہے، جیسے وہ عام طور سے لکھتے تھے۔
۷۔ کیا جیسے وہ لکھتے تھے، اس پر سے کاف کا مرکز ہٹا دیں، تو اس خط کا کیا ہوبہو ہو جاتا ہے۔
یہ چند اشارے ہیں۔ تفصیل سے اس کے بارے میں پھر عرض کیا جائے گا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کیے ہوئے "خطوط غالب" کے حوالے سے جہاں درست متن سامنے آیا ہے۔ وہاں ایک یہ نہایت اہم بات بھی سامنے آئی ہے، اور یہ ایک خوشگوار اتفاق ہے کہ اس کی دریافت کی سعادت میرے حصے میں آئی۔

آثار الصنادید، مرتبہ خلیق انجم

پروفیسر نثار احمد فاروقی

[۱۲ دسمبر ۱۹۹۰ء کو آل انڈیا ریڈیو سے خلیق انجم صاحب کی مرتبہ آثار الصنادید پر ایک مذاکرہ منعقد ہوا تھا جس میں پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر اسلم پرویز، سید شریف الحسن نقوی صاحب اور ڈاکٹر خلیق انجم نے حصہ لیا۔ اس مذاکرے میں پروفیسر نثار احمد فاروقی نے "آثار الصنادید" کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔] (م۔ ح۔ خ)

دہلی کے آثار قدیمہ کے بارے میں جتنی کتابیں ہیں ان میں سب سے اہم کتاب "آثار الصنادید" ہے۔ اس کتاب کی تالیف و تصنیف میں سرسید نے جو محنت کی تھی اور جو کھکھیڑ اٹھائی تھی اس کا اندازہ ہمیں مولانا حالی کی "حیات جاوید" پڑھ کر ہوتا ہے۔ خلیق انجم صاحب کو دہلی کی عمارتوں اور مزارات سے ہمیشہ ہی سے دلچسپی تھی۔ ہم لوگ اکثر یہ عمارتیں دیکھنے کے لیے ساتھ جایا کرتے تھے۔ خلیق صاحب نے "آثار الصنادید" کی ترتیب میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ یہ کام انتہائی قابلِ تعریف اور لائق داد ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا مرتبہ اڈیشن تمام اڈیشنوں سے بہتر ہے۔ خلیق صاحب نے میرے مشورے سے اس میں عمارتوں کی تصویریں شامل کی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تصویریں لینے میں انھوں نے بہت روپیہ خرچ کیا ہے اور بہت محنت کی ہے۔ اب یہ اڈیشن ایسا ہو گیا ہے کہ اگلے سو سال یا دو سو سال بعد ماہر آثار قدیمہ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ۱۹۸۹ء یا ۱۹۹۰ء میں دہلی کی ان عمارتوں کا کیا حال تھا۔ طباعت کے اعتبار سے بھی اس کتاب کا شمار اردو کی بہترین کتابوں میں ہوگا۔ میں ڈاکٹر خلیق انجم اور دہلی اردو اکیڈمی کو ایسے شاندار کام پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ایم۔ حبیب خاں

انجمن صاحب

خلیق انجم صاحب پر جب میں نے مضمون لکھنا شروع کیا تو ڈاکٹر اسلم پرویز سے جو اُن کے بچپن کے دوست اور ساتھی ہیں ان کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم کیں۔ اسلم پرویز صاحب نے بتایا کہ وہ اور خلیق انجم صاحب علی گڑھ کے ممتاز ہوسٹل میں رہتے تھے تو ان کے کمروں کا بیرا انھیں ہمیشہ انجمن صاحب کہتا تھا بار ہا ٹوکنے کے باوجود انجمن صاحب کہنا نہیں چھوڑا ممکن ہے یہ کوئی قدرت کی طرف سے اشارہ تھا۔ انجمن کے سکریٹری ہونے کے بعد خلیق صاحب نے انجمن کو اپنی شخصیت اور زندگی کا حصہ بنالیا۔ نقوش کے اڈیٹر محمد طفیل مرحوم اور ڈاکٹر ظ۔ انصاری دونوں خلیق صاحب کو "خلیق انجمن" کہتے تھے بلکہ لفافے کے پتے پر بھی ان کا نام "خلیق انجمن" لکھتے تھے۔ اسی لیے میں نے اس مضمون کا عنوان انجمن صاحب ہی رکھا ہے۔

آج میں ایک ایسے ادیب، ناقد اور محقق کے بارے میں لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں جو میرے مہربان بھی ہیں افسر بھی اور دوست بھی اور جنھیں اردو دنیا خلیق انجم کے نام سے جانتی ہے اور جن کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۵۲ء میں دیکھا ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک قربت رہی پھر دتی میں گاہے گاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد یکم اپریل ۱۹۷۴ء سے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

خلیق انجم صاحب کا پورا نام خلیق احمد خاں ہے لیکن اردو دنیا میں خلیق انجم کے نام سے مشہور ہیں۔ دتی کے رہنے والے ہیں۔ بچپن میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا یہ ایسا المیہ تھا جس نے ان کے خاندان کی بنیادیں ہلا دیں۔ چار بہنوں کے ایک بھائی سب کے لاڈلے تھے لیکن سب اتنے کم سن تھے کہ ان سب کو کھانے پینے کے علاوہ تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی۔ یہ کمی ان کی والدہ نے پوری کی۔ انھوں نے جس ثابت قدمی اور تحمل سے اولاد کی پرورش اور نگہداشت کی اور مشکلات کا مقابلہ کیا اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ والد کے انتقال کے وقت خلیق صاحب کی والدہ کی تعلیم مڈل تک تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں میں عورتوں کی تعلیم کا رواج بہت کم تھا۔ اور وہ گھر کی چہار دیواری تک محدود رہتی تھیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے خلیق صاحب کی والدہ کے حوصلے میں خدا نے ایسی استقامت پیدا کی کہ انھوں نے اپنی تعلیم کو دوبارہ جاری کیا، بی۔اے کیا، استادوں کی تربیت حاصل کی اور ملازم ہو گئیں۔ ملازمت ملنے تک والدہ اور خود خلیق انجم صاحب نے روپیہ کمانے کے لیے بہت پاپڑ بیلے۔ خلیق صاحب سات آٹھ سال کی عمر میں خاندان کی کفالت کے لیے روپیہ کمانے کے لیے مجبور ہوئے اور طرح طرح کے پیشے اختیار کیے۔ ان کی والدہ نے اسی محدود آمدنی میں اپنے بچوں کو اعلا تعلیم دلائی۔

خلیق صاحب کی والدہ نہایت نیک، صالح اور دین دار خاتون تھیں۔ پنج وقتہ نمازی اور تہجد گزار ہونے کے

علاوہ ان میں غریبوں سے ہمدردی کا بہت جذبہ تھا۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہر ماہ غریب اور بیوہ عورتوں کی مدد کیا کرتی تھیں۔ ان میں بے سہارا اور یتیم بچے خود غریب ہونے کے باوجود بھی شامل تھے۔ میں نے ان کو کئی بار دیکھا اور ان سے ملاقات کی۔ نورانی چہرہ، گندمی رنگ اور بے انتہا خوب صورت خدوخال، اور ہر وقت اپنے پرانے مکان واقع کلاں محل میں ایک تخت پر بیٹھی یادِ الٰہی میں مصروف رہتیں۔ انھوں نے اپنی اولاد کی تعلیم کے لیے بہت جدوجہد کی اور انھیں یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ والد کا مہربان سایہ سر سے اٹھ گیا ہے۔ والدہ ہی ان کا سب کچھ تھیں۔ انسان کو انسان بنانے میں تعلیم ہی سب کچھ نہیں ہوتی تربیت کا بھی بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ خلیق انجم صاحب کی تعلیم سے زیادہ ان کی والدہ کی تربیت کا اثر ہے جو ان کے دل و دماغ پر آج تک قائم ہے۔ خلیق صاحب اکثر اپنی والدہ کے قول بیان کرتے رہتے ہیں اور اکثر کہتے ہیں کہ میں اپنی والدہ کی دعاؤں کے طفیل دشمنوں اور مخالفوں سے محفوظ ہوں اور میں نے ان ہی کی دعاؤں سے ترقی کی ہے۔ والدہ سے عقیدت اور محبت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ آج بھی دفتر میں ان کی میز پر شیشے کے نیچے والدہ کی تصویر لگی رہتی ہے اور گھر کے ڈرائنگ روم میں والدہ کی بہت بڑی تصویر آویزاں ہے۔ اسی طرح انجم صاحب کو اپنی چاروں بہنوں سے غیر معمولی محبت ہے۔ بڑی بہن کو تو وہ ماں کی طرح سمجھتے ہیں اور ان کا احترام اسی طرح کرتے ہیں۔ ان کی دو بہنیں کناڈا میں ہیں اور وہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی ہیں اگر کبھی ان دونوں کا ذکر آجاتا ہے تو خلیق صاحب آب دیدہ ہو جاتے ہیں۔

انجم صاحب نے ابتدائی تعلیم دتی میں حاصل کی۔ مقابلے کیے، محنت کی، جامع مسجد کے ڈاک خانے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر لوگوں کے خطوط لکھے حالانکہ انھیں سخت کوش بنا دیا تھا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور اسی طرح اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول اجمیری گیٹ دتی سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۰ء میں اپنے دوست اسلم پرویز صاحب کے ساتھ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس علی گڑھ میں چلے گئے جو سر سید کی درس گاہ ہونے کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ اس وقت ہندوستان کی تقسیم ہو چکی تھی۔ یہ زمانہ بڑا افراتفری کا تھا۔ چاروں طرف بڑے پیمانے پر فسادات شروع ہو چکے تھے۔ ایسے موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد نے محسوس کیا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی حالت بہت نازک ہے اور اس کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو کے مشورے سے ڈاکٹر ذاکر حسین جو اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ۱۹۴۸ء میں وائس چانسلر مقرر کرایا۔ اور یونیورسٹی کو برباد ہونے سے بچایا۔ خلیق انجم صاحب نے ۱۹۵۰ء میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا تو اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین ہی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی سے ان کو بے حد محبت اور لگاؤ ہے۔ ان کے طالب علمی کے زمانے کا ایک ایسا واقعہ دیکھا جس میں خود اعتمادی اور جدید ذہن کی کوششوں کا دخل تھا یعنی خلیق انجم صاحب اور اسلم پرویز صاحب نے مل کر ڈ،لی کیفے کے نام سے ایک ہوٹل علی گڑھ میں شمشاد بلڈنگ پر کھولا۔ یہ ہوٹل لالہ کی دوکان کے برابر تھا۔ اس وقت انھوں نے یہ جگہ نور محمد ٹھیکیدار سے کرائے پر لی تھی۔ ان کے ہوٹل کے عقب میں بہادر کا ہوٹل تھا۔ اس کیفے کی فضا میں بڑی کشش تھی۔ طلبہ کے علاوہ گاہے گاہے نادرِ روزگار ہستیاں بھی کیفے کی رونق کا باعث بنتی تھیں۔ اس کیفے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پرانی روش کی تمام فرسودہ چیزوں کو ترک کر کے جدید طرز پر یہ کیفے علی گڑھ میں پہلی مثال تھا۔ اس زمانے میں میز پر میز پوش نہیں ڈالے جاتے تھے، طلبہ میزوں پر میز پوش دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اسی طرح سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کی ایش ٹرے میز پر رکھنے کا رواج بھی اسی کیفے نے قائم کیا۔ ریڈیو کیفے میں بجانے کی روایت بھی اسی کیفے نے ڈالی تھی۔ اس سے کیفے میں جمگھٹ لگنے لگا۔ بل کاٹنے کا

سسٹم بھی پہلی بار یہیں دیکھا گیا۔ اپنی ان تمام خوبیوں کی وجہ سے یہ کیفے رات گئے تک کھلا رہتا اور طلبہ اس کی نفاست اور جدت طرازیوں کو دیکھ کر خوش ہوتے غرض یہ کیفے دو سال تک خوب چلا لیکن دوستوں نے اتنا قرض لیا کہ بالآخر کیفے کو بند کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

خلیق انجم صاحب علی گڑھ میں جب زیر تعلیم تھے تو نہایت دبلے پتلے تھے۔ رنگ گیہواں اور طبیعت میں چلبلا پن، ادب و شعر کا ذوق، حاضر جوابی اور فقرہ طرازی بہت تھی، خوش خلقی اور لطیفہ گوئی ان کی خاص خصوصیات ہیں۔

خلیق انجم صاحب کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز علی گڑھ میں ہوا، پاکستان کے ایک رسالے "اخبار جہاں" میں شائع ہونے والے ایک انٹرویو میں خلیق صاحب نے ادبی زندگی کے آغاز کے بارے میں بتایا کہ جب وہ اینگلو عربک اسکول میں پڑھتے تھے وہاں ایک استاد رہبر پرتاب گڈھی تھے، ان کی رہنمائی میں خلیق صاحب نے ادب کا مطالعہ شروع کیا اور نویں کلاس میں انھوں نے شرحوں کی مدد سے دیوان غالب کا بہت بڑا حصہ پڑھ لیا تھا۔ علی گڑھ سے ایک "جھلک" نام کا رسالہ شایع ہوتا تھا۔ اس کے مالک اور اڈیٹر طاہر قریشی تھے، یہ ضمیر الدین قریشی مرحوم مالک مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ کے چھوٹے بھائی تھے، خلیق صاحب نے اس رسالے کو ایک کہانی لکھ کر بھیجی۔ اڈیٹر کو کہانی پسند آئی اور خلیق صاحب اس وقت ممتاز ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ایک دن طاہر قریشی صاحب خلیق انجم صاحب سے ملنے ہوسٹل آئے اور باتوں باتوں میں طاہر صاحب نے پیش کش کی کہ اگر خلیق صاحب پسند کریں تو "جھلک" کے نائب مدیر ہو سکتے ہیں۔ تنخواہ ساٹھ روپے ملے گی۔ خلیق صاحب نے یہ پیش کش فوراً قبول کر لی۔ اصل میں تو انجم صاحب نائب مدیر ہوئے تھے لیکن بقول ان کے میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز دونوں مل کر یہ کام کرتے تھے۔ ان ہی دنوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس کی وجہ سے خلیق صاحب کو ادیب بننے کے لیے بڑا حوصلہ ملا۔ واقعہ یہ ہے کہ خلیق صاحب اور اسلم پرویز صاحب دلّی کے تھے۔ اس لیے اردو کی کلاس میں دونوں بہت نمایاں رہتے تھے۔ کبھی کبھی لیکچرر کسی لفظ یا محاورے کے بارے میں بھی ان سے مشورہ کرتے تھے۔ معین احسن جذبی صاحب ٹیوٹوریل لیا کرتے تھے ایک دن انھوں نے کہا کہ جس طالب علم کو جو موضوع پسند ہو اس پر مضمون لکھ لائے۔ خلیق صاحب کا کہنا ہے کہ ان دنوں خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب ہمارے سینئر پارٹنر تھے اور ادبی مطالعے میں خلیق صاحب کی بہت رہنمائی کرتے تھے اس لیے ان دنوں میں خلیق صاحب اور اسلم پرویز صاحب ایسی کلاسیکی کتابیں پڑھتے تھے جو ان کی عمر سے کہیں زیادہ تھیں۔ اتفاق سے ان ہی دنوں خلیق صاحب نے سراج اورنگ آبادی کی مثنوی "خواب و خیال" پڑھی تھی اور خورشید الاسلام صاحب کا ایک مضمون "امراؤ جان ادا" پر پڑھا تھا۔ اس مضمون کا اسلوب خلیق صاحب پر چھایا ہوا تھا۔ انھوں نے خورشید الاسلام صاحب کے اسلوب میں "مثنوی خواب و خیال" پر مقالہ لکھا اور اگلے ہفتے جذبی صاحب کو وہ مقالہ دکھایا۔ مقالے کے دو تین صفحے پڑھ کر غصے ہوگئے۔ کہنے لگے۔ "میں نے آپ سے کہا تھا کہ خود مقالہ لکھ کر لائیے۔ آپ کسی ادیب کا مقالہ نقل کرکے لے آئے۔" کلاس میں خاصی دیر بحث رہی۔ خلیق صاحب کہتے تھے کہ یہ میں نے خود لکھا ہے اور جذبی صاحب کہتے تھے کہ ایک تو نقل کی اور پھر غلط بیانی سے کام لیتے ہو۔ خلیق صاحب کہتے ہیں کہ میں اپنی اس بے عزتی پر رو پڑا۔ ہوسٹل کر اپنے کمرے میں خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ ہوسٹل کے ایک سینئر پارٹنر ابو سعید زیدی صاحب ان سے ملنے آئے تو دیکھا خلاف معمول خلیق صاحب منہ لٹکائے بیٹھے ہیں۔ سعید صاحب نے وجہ معلوم کرنا چاہی تو انھوں نے تو کچھ نہیں بتایا اسلم پرویز صاحب نے پوری داستان بیان کی۔ زیدی صاحب نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ رونے کا نہیں خوش ہونے کا مقام ہے۔ اگر تمہاری کسی تحریر پر یہ شبہ ہوا ہے کہ وہ کسی بڑے نقاد کی تحریر ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم تو باقاعدہ

نقاد ہو گئے۔ آؤ تمہارے نقاد ہونے کی خوشی میں چائے پی جائے۔ سعید زیدی صاحب ہوسٹل کے کئی لڑکوں کو اپنے ساتھ کیفے ڈی پھوس لے کر پہنچے، نمک پارے برفی اور چائے منگا کر سب نے پی اور پہلے زیدی صاحب نے اور پھر ان کی تقلید میں تمام طالب علموں نے خلیق صاحب کو مبارک باد دی۔ خلیق صاحب کا کہنا ہے کہ جذبی صاحب کے رویئے اور زیدی صاحب کی خوشی کے اظہار سے مجھ میں بڑا حوصلہ پیدا کیا۔ بقول خلیق صاحب وہ ایم۔ اے کر چکے تھے اور ان کی کتاب معراج العاشقین شایع ہو چکی تھی۔ ایک دن کوئی کاغذ تلاش کر رہے تھے کہ وہ مقالہ ان کے ہاتھ آ گیا۔ انھوں نے یہ مقالہ کراچی سے شایع ہونے والے رسالے "زندگی" کو بھیج دیا جہاں وہ فوراً شایع ہو گیا۔ تو یہ ہے داستان خلیق صاحب کی ادبی زندگی کے آغاز کی۔ خلیق صاحب اس علمی اور تہذیبی شہر میں ۱۹۵۵ء تک رہے اور اسی سال بی۔ اے کر کے دلّی واپس چلے گئے۔ ۱۹۵۷ء میں دلّی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ اور اسی یونیورسٹی سے ۱۹۶۷ء میں "مرزا مظہر جان جاناں" پر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اس وقت کروڑی مل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ (موجودہ گورنر گجرات) تھے۔ بڑے باغ و بہار اور زندہ دل انسان ہیں۔ ان کے کالج میں اردو کے استاد کی جگہ خالی ہوئی تو خلیق انجم صاحب کا تقرر بحیثیت استاد شعبۂ اردو میں انھوں نے ہی کیا۔ خلیق صاحب کے قول کے مطابق ان کے کریئر کو بنانے میں پرنسپل مرزا محمود بیگ اور ڈاکٹر سروپ سنگھ کو بڑا دخل ہے۔ انھوں نے ہر قدم پر ان کا خیال رکھا ہے۔ اکثر ان کی زبان سے یہ کہتے ہوئے بھی سنا ہے کہ ان کی شخصیت کے نکھار میں ان کے دوستوں کے علاوہ ان کے اساتذہ کا بھی دخل رہا ہے۔ یونیورسٹی میں تقرر کے سلسلے میں خلیق صاحب کو پروفیسر خواجہ احمد فاروقی سے بہت شکایتیں رہیں لیکن خلیق صاحب خواجہ صاحب کی غیر معمولی صلاحیتوں کے مداح بھی ہیں۔ اس کا اعتراف خلیق انجم صاحب مرزا محمد رفیع سودا کے دیباچے میں اس طرح کرتے ہیں:-

> "جب میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا تو میرے محسن اور مشفق استاد ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے سب سے پہلی بار مجھے تحقیقی کام کی طرف متوجہ کیا۔ اس زمانے سے لے کر آج تک جب کبھی میں ان کے پاس سے آیا ایک نئی امنگ اور ایک نیا حوصلہ لے کر۔ اگر خواجہ صاحب مجھ میں ذاتی دلچسپی نہ لیتے، کبھی پیار، کبھی غصے سے مجھے نہ سمجھاتے رہتے تو میرے لیے اس کتاب کا مؤلف ہونا ممکن ہی نہ تھا۔" [1]

خلیق انجم صاحب نے "ادبی تبصرے" کے عنوان سے ایک رسالہ بھی دلّی سے نکالا تھا جس میں کتابوں پر تبصرے اور ان پر کڑی تنقید ہوتی تھی۔ یہ نئی فکر اور تخلیقی اظہار کا بہترین آرگن تھا۔ افسوس کہ یہ مجلس ادارت کے آپسی اختلافات کی نذر ہو گیا۔

۱۹۶۲ء میں سودا پر تحقیقی کام کے لیے خلیق انجم صاحب دوبارہ علی گڑھ پہنچے جہاں انھوں نے انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔ اس وقت انجمن کے اعزازی جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنا پی۔ ایچ ڈی کا وہ مقالہ جو مرزا مظہر جان جاناں پر تھا اس پر بھی کام کیا۔ اس زمانے میں تحقیقی کام کرنے کی قدر آج کل کے مقابلے میں زیادہ تھی اور اسکالر کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ میں نے ان کو کئی دن تک دیوانوں کی طرح انجمن کے قلمی ذخیرے سے استفادہ کرتے ہوئے دیکھا۔ سودا کے کلیات کے قلمی نسخے جو انجمن میں محفوظ ہیں

---

[1] مرزا محمد رفیع سودا۔ ص ۱۱

ان سب کو انھوں نے دیکھا۔ ان میں تحقیقی کام کرنے کی وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک اچھے تخلیق کار میں ہوتی ہیں۔ پی۔ ایچ ڈی کیا مگر مقالہ ہنوز شائع نہیں ہوا البتہ مرزا محمد رفیع سودا پر جب کام مکمل ہو گیا تو اس کی اشاعت کا مسئلہ ان کے سامنے تھا۔ اس عرصے میں ان کے مضامین اردو کے معیاری رسالوں میں شایع ہو چکے تھے "تاراس بلبا" کا اردو ترجمہ معراج العاشقین اور مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، جیسی اہم کتابیں شایع ہو چکی تھیں اور خلیق انجم صاحب کی تحریریں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ چناں چہ خلیق انجم صاحب کی فرمائش پر سودا پر مسودہ ادبی کمیٹی میں پیش کرنے کے لیے سرور صاحب کے پاس بھیجا گیا۔ قاضی صاحب کے زمانے سے آج تک انجمن میں یہ قاعدہ رہا ہے کہ مسودہ چھپنے سے پہلے ادبی کمیٹی میں پیش کیا جاتا ہے۔ کمیٹی منظور کرنے سے پہلے اس کو مبصر کے پاس رائے کے لیے بھیجنے کے لیے نام تجویز کرتی ہے۔ اور جب رائے آجاتی ہے تو آیندہ ادبی کمیٹی کے جلسے میں مبصر کی رائے کو پیش کیا جاتا ہے اگر مسودے کے حق میں مبصر کی رائے ہوتی ہے تو اس کی اشاعت عمل میں لائی جاتی ہے۔ خلیق انجم صاحب کا مسودہ سرور صاحب کی سفارش پر مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کے پاس رائے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس زمانے میں عرشی صاحب انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عام کے فعال ممبر بھی تھے۔ اسی زمانے میں سرور صاحب کی بہت سی تحریریں پڑھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ خلیق انجم صاحب کو بہت عزیز رکھتے ہیں اس لیے انھوں نے "مرزا محمد رفیع سودا" پر ان کا تحقیقی مقالہ ۱۹۶۶ء میں انجمن سے شایع کیا۔ انجمن نے اس وقت تک جن ادیبوں کی کتابیں چھاپی تھیں ان میں انجم صاحب سب سے کم عمر تھے۔ اس زمانے میں سے کتب خانے کی ذمے داری کے ساتھ ساتھ شعبۂ نشر و اشاعت کا تعلق مجھ ہی سے تھا۔ اس وقت انجمن کے نائب معتمد مولانا حفیظ الدین مرحوم تھے۔ مولانا عرشی نے سودا کے مسودے پر یہ رائے دی تھی کہ شیخ چاند مرحوم کا مقالہ سودا کے بعد خلیق انجم صاحب کا مقالہ بڑا اہم ہے اور اس میں وہ بہت سے مقامات پر شیخ چاند مرحوم سے آگے نکل گئے ہیں اور اس میں اضافے کیے ہیں۔ سودا جب شایع ہوئی تو سرور صاحب نے دو صفحے کا پیش لفظ لکھا۔ وہ خلیق انجم صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> "جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو میں تحقیق و تنقید کا معیار گر رہا ہے انھیں خلیق انجم کی اس تصنیف کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ سودا کی عظمت تو شروع سے مسلم رہی ہے لیکن سودا کی یہ بدقسمتی اور اردو کے محققوں اور نقادوں کی یہ بدتوفیقی ہے کہ نہ تو ان کے کلیات کا کوئی صحیح ایڈیشن اب تک شایع ہوا ہے اور نہ شیخ چاند اور حال میں محمد حسن کے علاوہ کسی نے سودا کی حیات، شخصیت اور کلام کے سیر حاصل جائزے کی ضرورت سمجھی۔ شیخ چاند کی کتاب قابل قدر ہے مگر اب خاصی پرانی ہو گئی ہے۔ اس لیے جدید تحقیق کے معیار سے سودا پر ایک نئی اور سیر حاصل کتاب کی اشد ضرورت تھی۔ خلیق انجم صاحب نے اس ضرورت کو بڑی خوبی سے پورا کیا ہے۔" [1]

سرور صاحب کے اس تجزیے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ خلیق صاحب کے بعد جدید تحقیق کی روشنی میں سودا پر کوئی اضافہ نہیں ہوا جس طرح قاضی عبدالغفار نے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "میر تقی میر حیات اور شاعری" پہلی مستند اور اہم کتاب چھاپی تھی اسی طرح سرور صاحب کے عہد میں سودا پر خلیق انجم صاحب کا کام نہ صرف قابل قدر ہے بلکہ سودا کی حیات اور ان کے کلام پر سیر حاصل تجزیہ پیش کرتی ہے۔ خلیق انجم صاحب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی وقت

---

[1] مرزا محمد رفیع سودا ص ۹

میں بہت سے ادبی اور غیر ادبی کام اپنے ذمے لے لیتے ہیں اور سب کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔ کروڑی مل کالج کی زندگی میں "مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط" غالب کی نادر تحریریں" "معراج العاشقین"، "کربل کتھا کا لسانی مطالعہ" اور "متنی تنقید" جیسی اہم کتابیں لکھیں۔

نومبر ۱۹۶۵ء میں انجمن کے مرکزی دفتر کے لیے دلّی میں راؤز ایونیو روڈ پر ایک قطعہ زمین خریدا گیا۔ اس کی تعمیر کا کام سرور صاحب کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا اور کرنل بشیر حسین زیدی کی نگرانی میں اس کا کام چلتا رہا۔ اس عمارت کا نام "اردو گھر" رکھا گیا اور اس کا سنگِ بنیاد آنجہانی اندرا گاندھی سابق وزیر اعظم ہند نے ۲۳ مارچ ۱۹۶۸ء کو رکھا تھا اردو گھر کا نام بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس وقت تجویز کیا تھا جب انجمن کا دفتر اورنگ آباد دکن میں رابعہ منزل میں تھا اور مولوی صاحب نے عمارت کی تعمیر کے لیے چندے کی اپیل کی تھی اور اس کے لیے ساٹھ ستر ہزار روپے کی رقم جمع ہو گئی تھی۔

۱۹۷۴ء میں پروفیسر آل احمد سرور انجمن ترقی اردو ہند کے اعزازی جنرل سکریٹری اور پنڈت آنند نرائن ملا صدر تھے۔ چوں کہ انجمن کے مرکزی دفتر کو دلّی منتقل ہونا تھا جہاں اس کے لیے اردو گھر کی عمارت زیر تعمیر تھی اور سرور صاحب دلّی آنا نہیں چاہتے تھے اس لیے انھوں نے ۳۱ مارچ ۱۹۷۴ء کو انجمن سے استعفا دے دیا۔ اس وقت سکریٹری کے عہدے کے لیے بہت سے لوگ امیدوار تھے جن میں بعض بہت سینئر ادیب اور شاعر بھی شامل تھے۔ ایک بزرگ افسانہ نگار تو اس امید پر کہ ان کا تو تقرر ہو ہی جائے گا۔ ساز و سامان لے کر دلی آ گئے تھے۔ جب پنڈت آنند نرائن ملا صاحب کی کوٹھی پر مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا تو باہر کھڑے اپنے حق میں فیصلے کا انتظار کرتے رہے۔ خلیق انجم صاحب اس وقت وزارتِ تعلیم میں ڈائرکٹر تھے اور گجرال کمیٹی کی رپورٹ لکھ رہے تھے۔ کمیٹی میں کئی ممبر ایسے بھی تھے جو انجمن کے بھی رکن تھے مثلاً سجاد ظہیر صاحب، مالک رام صاحب، ڈاکٹر گیان چند وغیرہ سب حضرات گجرال کمیٹی میں انجم صاحب کی کارکردگی سے متاثر تھے۔ خاص طور پر مالک رام صاحب ڈاکٹر سروپ سنگھ گجرال کمیٹی کے ممبر تھے اور اس وقت دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے ان تمام حضرات نے اپنے طور پر پنڈت آنند نرائن ملا صاحب کو اور مجلس عاملہ کے بعض حضرات جن میں مالک رام صاحب کا نام خاص طور پر شامل تھا، راضی کر لیا کہ اس عہدے پر انجم صاحب کا تقرر کیا جائے۔ اب تک کے تمام سکریٹریوں میں انجم صاحب سب سے کم عمر تھے۔ انجم صاحب کے لیے کوشش ہو رہی تھی لیکن اس کا علم مجلس عاملہ کے ممبروں کے سوا کسی کو نہ تھا بلکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے خود انجم صاحب کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ البتہ سرور صاحب جب ۳۰ مارچ ۱۹۷۴ء کی صبح انجمن کے دفتر پہنچے تو انھوں نے خلیق انجم صاحب کا نام بتایا ادھر ملا صاحب نے دلّی میں خلیق انجم صاحب کو اس تقرر کی اطلاع فون سے دے دی تھی۔

مجھے انجم صاحب کے قریب آنے کا موقع اس وقت سے ملا جب وہ یکم اپریل ۱۹۷۴ء کو انجمن کا چارج لینے علی گڑھ پہنچے۔ انھوں نے اس روز لائبریری کے کمرے میں تمام اسٹاف کو جمع کر کے ہمدردانہ باتیں کیں اور یہ یقین دلایا کہ مجھ سے جہاں تک ممکن ہو سکے گا آپ لوگوں کے مفاد اور سہولتوں کا خیال رکھوں گا۔ اس وقت ڈاکٹر ناصر حسین نقوی نائب معتمد اور میں لائبریرین تھا۔ "ہماری زبان" کا کام سید تفضل حسین صاحب کے سپرد تھا۔ علی گڑھ کے کارکنوں میں صرف رام اوتار صاحب دلّی جانے کے لیے تیار نہ ہوئے اس لیے انھوں نے وہیں استعفا دے دیا۔ ڈاکٹر کبیر احمد جائسی نے ایک مہینے کی چھٹی مانگی۔ خلیق صاحب نے اس وقت چھٹی دینے سے انکار کر دیا جس سے انھیں بڑی تکلیف پہنچی۔ غالباً کبیر صاحب کی والدہ بیمار تھیں خلیق صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ دلّی جانے کے بعد آپ چھٹی لے سکتے ہیں مگر کبیر صاحب اس پر آمادہ نہ ہوئے اور انھوں

نے انجمن سے استعفا دے دیا۔ "نذر مسعود" میں کبیر صاحب نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ کبیر صاحب انجمن میں میرے ساتھی اور علی گڑھ کے زمانے کی بہترین یادیں ان سے وابستہ ہیں اور میرے تعلقات ان سے دفتر میں ملازم ہونے سے بہت پہلے کے ہیں۔

۱۶ مئی ۱۹۴۸ء کو انجمن کا مرکزی دفتر علی گڑھ سے دلی اس نامکمل عمارت میں منتقل ہوا۔ صرف قلمی کتابوں کی الماریاں اور چند لکڑی کی الماریوں کے علاوہ باقی تمام سامان برآمدے میں کئی سال تک پڑا رہا۔ باہر کئی لکڑی کی الماریاں جو راستے میں ٹرک میں لاد کر لائی گئی تھیں، ٹوٹ گئی تھیں۔ انجم صاحب نے شکر پور میں ایک مکان تین سو روپے ماہوار پر انجمن کی مطبوعات، اردو ادب اور ہماری زبان وغیرہ کے فائلوں کے لیے کرائے پر لے لیا تھا جہاں ہماری زبان اور اردو ادب کے بہت سے فائل چوری ہو گئے بعد میں تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ مالک مکان کے لڑکے کا یہ کام تھا۔ اس لیے اسے خالی کرنا پڑا۔ انجم صاحب نے یہ کمی اس طرح پوری کی کہ ہماری زبان اور مطبوعات کی فروخت کا انتظام اپنے مکان واقع کلاں محل کے ایک حصے میں منتقل کرا دیا اور وہاں معظم علی خاں صاحب کے سپرد یہ کام کیا گیا انجمن کی مطبوعات اردو گھر میں پہنچا دی گئیں۔ کئی سال تک انجم صاحب کے مکان کا خاصا بڑا حصہ انجمن کے تصرف میں رہا اور انھوں نے انجمن سے کرایہ نہیں لیا۔ جب کہ پرانی دلی کے اس علاقے میں مکان کا ملنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

سرور صاحب کے زمانے میں چار منزلوں کا اینٹوں کا ڈھانچہ تعمیر ہو چکا تھا مگر اوپر کا کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ خلیق انجم صاحب نے پانچویں منزل تعمیر کرائی اور تمام عمارت کا باقی کام کرایا۔ خلیق صاحب کے اس کام کی داد صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے "معارف" اکتوبر ۱۹۸۶ء کے اداریے میں ان الفاظ میں دی۔

> "ڈاکٹر خلیق انجم صاحب جب سے اس کے جنرل سکریٹری ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے کو اس کا بہت ہی فعّال، متحرک، ہوش مند اور لائق عہدے دار ثابت کر دکھایا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے اس کو پاکستان منتقل کیا تو اس لٹے پٹے ادارے کو پہلے قاضی عبدالغفار اور پھر پروفیسر آل احمد سرور نے سنبھالا۔ اس زمانے میں اس ملک میں اردو کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا تو اس کے لائحۂ عمل سے زیادہ توقع وابستہ نہیں کی جا رہی تھی مگر یہ سخت جان بن کر اچھی طرح چلتی رہی۔ اور جب ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کی باگ اپنے ہاتھوں میں لی تو اس کے بہی خواہوں کا دل دھڑک رہا تھا کہ معلوم نہیں وہ اس کی شان دار روایات کو کس حد تک برقرار رکھ سکیں گے مگر اس عہدے پر فائز ہوتے ہی ان کی ادبی صلاحیتیں اچھی طرح ابھریں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ قلب دہلی میں اردو گھر کی تعمیر ہے۔ جب سے یہ ادارہ قائم ہوا تھا بے گھر تھا جس بے سروسامانی اور ہمت شکن فضا میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کی تعمیر شروع کی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ناممکن کام کو ممکن بنانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ان کے یقین محکم اور سعی پیہم کی بدولت دہلی کے راؤز ایونیو میں اردو گھر میں کئی منزلوں کی تعمیر کیا ہوئی کہ اس پر شیفتہ، میر، غالب، ذوق، مومن، ظفر، داغ اور ناصر نذیر فراق کی اردو بلکہ اس ملک کے کروڑوں باشندوں کی مادری زبان کا پرچم لہراتا نظر آیا۔" [1]

انجم صاحب کے سامنے ایک طرف تو اردو گھر کی تعمیر کا مسئلہ تھا تو دوسری طرف انجمن کے تمام ملازمین جو علی گڑھ کے

۱؎ معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۸۶ء ص ۲۴۳

رہنے والے تھے ان کی رہائش کا مسئلہ تھا۔ انھوں نے سارے اسٹاف کو تسلی و تشفی دی اور کرایے پر مکان حاصل کرنے کے سلسلے میں ان کی مدد کی۔ دو تین ممبر تو ایسے ہیں جنھیں وہ خود لے کر گھومتے پھرے اور ان کے رہنے کا بندوبست کیا۔ انجمن جب دلّی آئی تو اس کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ آمدنی ویسی تھی جو علی گڑھ جیسے چھوٹے شہر کی تھی اور اخراجات دلّی جیسے بڑے شہر کے ہو گئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انجمن میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ ہماری زبان کے فولڈ کرنے اور اس پر پتے چسپاں کرنے کا کاغذ خریدا جا سکتا۔ انجم صاحب خود کھڑے ہو کر یہ کام کرتے اور دفتر کے ساتھیوں کو بھی ساتھ لگاتے اور وہ اس طرح ہنسی خوشی یہ کام کرتے جیسے کوئی بہت بڑا کام ہو۔ ان کا یہ کہنا کہ کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا آدمی چھوٹا بڑا ہوتا ہے۔ انجمن کی مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے انھوں نے دو سال تک انجمن سے تنخواہ نہیں لی۔ اگرچہ اب خدا کا شکر ہے کہ انجمن کے وسائل قابل اطمینان ہیں لیکن اب بھی انجم صاحب چپراسیوں اور انجمن کے کارکنوں کے ساتھ مل کر چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں بے عزتی محسوس نہیں کرتے۔ عمارت کے تیار ہونے کی دھن ان پر ایسی سوار تھی کہ ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے۔ مالی حالت بہتر بنانے کے لیے انھوں نے نیشنل ہیرلڈ کی بلڈنگ میں ایک چھپائی کی مشین کرائے پر لی۔ جہاں چھپائی کا کام شروع ہونے لگا۔ اس وقت کرنل بشیر حسین زیدی نیشنل ہیرلڈ کے مینیجنگ ڈائرکٹر تھے۔ اس پریس میں چھپائی کا کام آنے لگا اب انجم صاحب کی مصروفیت اور بڑھ گئی۔ کام کو بڑھانے کے لیے انھوں نے اپنا ذاتی روپیہ بھی لگایا جو بعد میں انھوں نے لے لیا۔ لیکن پریس نیشنل ہیرلڈ کے کاریگروں کو آئے دن کے جھگڑوں اور ان کی پریشانیوں نے ایسا مبتلا کر دیا کہ اس کو آخر کار بند کرنا پڑا۔ اب انجمن کی مالی حالت بہتر ہونے کی بجائے اور سقیم ہو گئی مگر انجم صاحب نے ہمت نہیں ہاری گو انجمن کے بعض ملازمین کی طرف سے ان کو مشکلات بھی آئیں لیکن ان کے دل میں کسی کی طرف سے میل تک نہیں آیا۔ اور انھوں نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ انجانے میں انجم صاحب سے کچھ غلطیاں ہوئیں، کچھ ناتجربے کاری کی وجہ سے کچھ دوسروں کے کہنے میں آ کر مگر بہت جلد ان پر قابو پا لیا اور کسی کو بد دل نہیں ہونے دیا۔

انجمن کو خود کفیل بنانے کی دھن ان پر شروع سے ایسی سوار ہوئی کہ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ پہلے گراؤنڈ فلور جہاں انجمن کا دفتری سامان تھا اس کو تہ خانے میں منتقل کرایا اور گراؤنڈ فلور کرائے پر اٹھا دیا اور اس سے پانچ لاکھ روپے ایڈوانس لے کر اوپر کی منزل مکمل کرائی۔ اسی طرح پیشگی کرایہ لے لے کر باقی منزلیں مکمل کرائی گئیں۔

یہ لکھنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ کرنل بشیر حسین زیدی عمارت کمیٹی کے صدر تھے انجم صاحب نے جب انجمن کا چارج لیا ہے تو اردو گھر پر ٹھیکیدار کے تقریباً ڈھائی لاکھ کے بل واجب تھے اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نظر نہ آتا تھا۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ اور بیان کر دوں کہ سرور صاحب کے زمانے میں بلڈنگ فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے رسیدیں چھپوائی گئی تھیں۔ یہ رسیدیں ایک روپے، دو روپے ۵ روپے اور دس روپے کی تھیں۔ یہ رسیدیں چندے کی فراہمی کے لیے اردو کے ہمدردوں میں تقسیم کی گئی تھیں۔ شرم آتی ہے کہ ان رسیدوں سے بیس ہزار روپے سے زیادہ وصول نہیں ہوا اور بعد میں علم ہوا کہ کچھ حضرات نے رقم تو خاصی اکٹھا کر لی تھی لیکن انجمن میں داخل نہیں کی۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو گھر کی تعمیر کے سلسلے میں کرنل بشیر حسین زیدی کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو اردو گھر کی تعمیر کو مکمل ہونے میں اور زیادہ وقت لگتا۔ ان کی ذات سے بہت سی الجھنوں کو سلجھنے میں مدد ملی۔ ۱۹۷۶ء کی بات ہے کہ عمارت کے سلسلے میں مالی مشکلات اور بڑھ گئیں تو انجم صاحب نے زیدی صاحب کے مشورے سے چندے کی اسکیم بنائی اور وہ زیدی صاحب کے ساتھ بمبئی گئے۔ وہاں کوئی دروازہ ایسا نہیں تھا جس پر دستک نہ دی ہو لیکن ہر دروازے

سے خالی لوٹنا پڑا۔ جب سب طرف سے ناامیدی ہوگئی تو زیدی صاحب انجم صاحب کو لے کر رجنی پٹیل صاحب کے گھر گئے، رجنی پٹیل صاحب اس وقت پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر تھے اور یہ زیدی صاحب کی بیگم قدسیہ زیدی صاحبہ کو بہن کہا کرتے تھے۔ زیدی صاحب نے اردو گھر کی تعمیر کے لیے چندے کی بات کی تو پٹیل صاحب نے بتایا کہ وہ آج کل ہائی کمانڈ میں معتوب ہیں اس لیے مہاراشٹر کے وزیر اعلا کے عہدے سے ہٹا کر انھیں پردیش کانگرس کا صدر بنا دیا گیا ہے۔ پٹیل صاحب نے چندہ اکٹھا کرنے کے لیے معذوری کا اظہار کیا تھوڑی دیر کے بعد وہ اندر گھر میں گئے اور واپس آکر زیدی صاحب کو ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ بہنوئی گھر آیا ہے تو خالی ہاتھ کیسے جانے دوں۔ اس میں اردو گھر کی تعمیر کے لیے ایک چھوٹا سا چک ہے۔ یہ چھوٹا سا چک دس ہزار روپے کا تھا اور بمبئی میں کئی دن تک رہنے کے باوجود بس یہی چک نصیب ہوا تھا۔ اس رقم سے انجمن کو کچھ مدد ملی۔ تیسری منزل مکمل ہونے پر اس کو بھی کرائے پر اٹھا دیا۔ پورا دفتر دوسری منزل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح اب تین منزلیں کرائے پر اٹھی ہوئی ہیں اور انجمن کو خلیق انجم صاحب نے خودکفیل بنا دیا۔ جب انجم صاحب نے چارج لیا تھا تو انجمن کو حکومت سے ۴۰ ہزار روپے کی سالانہ گرانٹ ملتی تھی جو بعد میں ۸۰ ہزار ہو گئی مگر انجم صاحب گرانٹ بڑھانے کے خلاف رہے۔ ان کی توجہ زیادہ تر انجمن کی عمارت کی طرف رہی کہ یہ ادارہ اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو سکے اور خودکفیل بن سکے۔ آج ان کا یہ خواب پورا ہو گیا۔ ابھی گزشتہ مہینے کی بات ہے کہ انھوں نے کنارا بنک کے ایک حصے میں میز نائن بنوا کر کرایے میں اضافہ کرا دیا اس طرح اب انجمن کے کرائے سے کل آمدنی تقریباً ایک لاکھ روپے ماہانہ کے قریب ہے۔

علمی اور ادبی کام

عمارت کے جھمیلوں کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی کاموں کی طرف بھی ان کی توجہ مبذول رہی ہے اور انھوں نے انجمن کی معیاری اور قابل قدر کتابیں شائع کیں۔ اسی طرح کتابوں کی طباعت کے معیار کو بلند کیا کہ دوسرے ادارے انجمن کی تقلید کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس کام کے لیے انھوں نے پبلی کیشنز انچارج شمیم جہاں صاحبہ کی تربیت کی۔

"ہماری زبان" کے ڈاکٹر یوسف حسین نمبر، مرزا محمود بیگ نمبر، خواجہ حسن نظامی نمبر، گجرال کمیٹی نمبر، اردو کانفرنس نمبر، حالی نمبر، ہندوستان میں اردو کے مسائل نمبر، تبصرہ نمبر اور جنوبی ہند کانفرنس نمبر وغیرہ خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ ۸ جولائی ۱۹۹۰ء کا شمارہ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کی روشنی میں "اعداد و شمار نمبر" کے نام سے شایع کیا۔ یہ نمبر اپنی افادیت کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ اب اسے کتابی صورت میں شایع کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح "اردو ادب" کے کئی خاص نمبر شایع کیے۔ ان میں فیض احمد فیض، حسرت موہانی، عبدالغفور شہباز، اشرف صبوحی، اقبال نمبر، غالب پر چند تحریریں، اردو کا اپنا عروض، اختر انصاری نمبر اور کئی خاص نمبر اردو حلقوں میں کافی مقبول ہوئے۔ خلیق صاحب نے نہ صرف اس کی علمی اور تحقیقی فضا کو قائم رکھا بلکہ اس کی پابندی کا بھی خاص خیال رکھا۔ وہ اس کے مدیر اور میں اس کا معاون مدیر ہوں۔ اس کے علاوہ دفتر کے بیشتر ادبی کاموں میں ان کا معاون رہتا ہوں۔

انجمن کے زیر اہتمام سمینار اور استقبالیہ پروگرام منعقد کرنے کی روایت بھی ڈاکٹر خلیق انجم نے قائم کی اس سے انجمن کو بڑا فروغ ہوا۔ اس کا نام اور اس کی شہرت اخباروں ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ دور دراز مقامات تک پہنچی۔

خلیق صاحب تیس کے قریب کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر پہلے آ چکا ہے لیکن ان کی دو اہم تالیفات کا ذکر کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت سے اردو ادب کے سرمایے میں اضافہ ہوا۔

ہے۔ ان میں غالب کے خطوط پہلی بار سائنٹیفک طریقے سے مرتب ہوئے ہیں۔ اس میں خلیق انجم صاحب نے غالب کے تمام اردو خطوط کو چار جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ جس کی اب تک تین جلدیں غالب انسٹی ٹیوٹ دلی سے شایع ہو چکی ہیں چوتھی جلد زیر طبع ہے۔ دوسرا تحقیقی کارنامہ جو ابھی حال میں دلی اردو اکادمی نے سرسید کی معرکۃ الآرا تالیف "آثار الصنادید" ہے جس کو انھوں نے پہلی بار سائنٹیفک طریقے سے مرتب کیا ہے۔ اس میں ہندو مسلم فن تعمیر کی مفصل تفصیلات اور اس کے ماخذ بیان کیے گئے ہیں۔ نیز تصویریں، نقشے اور کتبے بھی دیے گئے ہیں۔ اس کتاب سے دلی کے آثار قدیمہ کی موجودہ حالت کا بھی علم ہوتا ہے کتاب کے حواشی مرتب کی تحقیقی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔

اردو تحریک

انجمن ترقی اردو ہند ایک ایسا علمی، تہذیبی اور ادبی ادارہ ہے کہ اس کی طرف سے اردو کے سلسلے میں جو آواز اٹھائی جاتی ہے۔ یا اردو کے حق میں بلند ہوتی ہے پوری اردو دنیا اس کی توجہ کا مرکز بنتی ہے۔ قاضی عبدالغفار، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مسعود حسین سے لے کر ڈاکٹر خلیق انجم تک اردو تحریک کے سلسلے میں انجمن نے جو جد و جہد کی ہے۔ وہ قابل تحسین ہے۔

خلیق انجم صاحب کا رول اردو تحریک کے سلسلے میں پچھلے پندرہ برسوں میں بہت اہم رہا ہے اور اس سلسلے میں جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ موضوع ایک الگ مقالے کا متقاضی ہے۔ میں صرف اس کمیٹی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے اردو دنیا میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ میری مراد گجرال کمیٹی سے ہے۔ اس کا ذکر کئی بار آچکا ہے کہ خلیق صاحب اس کمیٹی میں ۱۹۷۲ء میں ڈپٹی ڈائرکٹر کی حیثیت سے لیے گئے تھے اور کچھ ہی دن بعد ان کو ڈائرکٹر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی تھی۔ اس کمیٹی کی ضخیم رپورٹ خلیق انجم صاحب اور علی جواد زیدی صاحب نے لکھی تھی۔ خلیق صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ میں نے انگریزی لکھنا علی جواد زیدی صاحب سے سیکھی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کا جائزہ لینے کے لیے مرکزی حکومت ہند نے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں ڈاکٹر خلیق انجم کو بھی شامل کیا گیا اس کمیٹی نے ہندوستان کے مختلف صوبوں کا دورہ کرنے کے لیے چار سب کمیٹیاں تشکیل دیں ان میں سے تین کمیٹیوں کے کنوینر خلیق انجم صاحب ہی تھے۔ گجرال کمیٹی کی رپورٹ لکھنے میں جو تجربہ حاصل کیا تھا اس کا پورا استعمال اس کمیٹی میں ہوا۔ سب کمیٹیوں کی اطلاعات پر مشتمل پوری رپورٹ خلیق انجم صاحب ہی نے لکھی جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے اور رپورٹ میں ضمیمے کے طور پر دی گئی ہے۔

انجمن کی شاخوں کی تنظیم کا مسئلہ بھی اردو تحریک کا ایک حصہ ہے۔ کسی انجمن کی تشکیل آسان ہے مگر اس کی تکمیل میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں اس کی فضا ہموار کرنے میں مرکزی انجمن کے سکریٹریوں نے ہمیشہ تعاون دیا خلیق صاحب نے بھی اپنے پیش رو کی اس روایت کو قائم رکھا۔ وہ اس سلسلے میں انجمن کی شاخوں کے عہدے داروں کو لکھتے رہتے ہیں کہ زبان کے مسائل سے شاخیں غفلت نہ برتیں اور اس سلسلے میں مرکز سے جو تعاون ہو سکتا ہے اس کے لیے وہ کوشاں رہتے ہیں۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۸۸ء کو علی گڑھ کی ضلعی شاخ کی طرف سے کل ہند پیمانے پر "اردو اور روزی روٹی کا مسئلہ" پر جو سمینار منعقد ہوا اس کے کنوینر ایم۔ حبیب خاں اور معاون کنوینر جناب محمد احمد شیون، کمیٹی کے خصوصی ممبر ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری اور علی گڑھ شاخ کے صدر ڈاکٹر محمود احمد تھے۔ سمینار میں مرکزی انجمن کی طرف سے جناب حیات اللہ انصاری، بیگم سلطانہ حیات، خلیق انجم، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جناب شہاب الدین دسنوی، پروفیسر مسعود حسین اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ شامل تھے۔

انجم صاحب ضرورت مند حضرات کی مدد کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں۔ اردو کے مشہور صحافی سلامت علی مہدی جب بیمار پڑے تو ان کو آنجہانی اندرا گاندھی سابق وزیراعظم ہند کے فنڈ سے پانچ ہزار روپے کی رقم دلائی اور وزیر اطلاعات ونشریات کے فنڈ سے سلامت علی مہدی کو مزید پانچ ہزار روپے دلوائے اسی طرح نظر ادیب کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ کے لیے دو سال تک پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ دلّی اردو اکیڈمی سے مقرر کرایا۔ اور پانچ سو روپے ماہوار دو سال تک ایک ادارے سے دلوائے۔ ان کو بھی وزیراعظم کے فنڈ سے پانچ ہزار اور ایچ۔ کے ایل بھگت کے فنڈ سے پانچ ہزار روپے کی رقمیں دلوائیں۔ انجم صاحب نے بلا مبالغہ بے شمار ادیبوں اور شاعروں کی مدد کی ہے۔

آج جب کہ انجمن کے وسائل اطمینان بخش ہو چکے ہیں انجم صاحب اب بھی چھوٹے چھوٹے کام کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے اگر ہال میں کرسیاں ٹھیک کی جا رہی ہوتی ہیں تو دفتر کے لوگوں کے ساتھ مل کر وہ بھی کرسیاں اٹھا اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھتے ہیں ان کے اس رویے سے دفتر کے تمام لوگ چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ انجم صاحب نے اسٹاف کے ہر فرد کو ہمیشہ اپنے خاندان کا فرد سمجھا ہے جب تنخواہیں بہت کم تھیں تو اسٹاف کے بہت سے ان کے مقروض رہتے تھے۔ انجم صاحب کو غصہ جتنی جلدی آتا ہے اتنی ہی جلدی اتر بھی جاتا ہے۔ انجمن کے کارکن، افسران اور چپراسیوں کو برابر کی عزت دیتے ہیں۔ ایک طرف اگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی چپراسی کسی افسر سے بدتمیزی کرے تو دوسری طرف جب کبھی انجمن میں کوئی تقریب ہوتی ہے تو انجمن کے تمام کارکنوں اور چپراسیوں کو ایک ساتھ کھانا کھلاتے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ کسی چپراسی نے کوئی زبردست غلطی کی اور اس کے بارے میں انجم صاحب نے طے کر دیا کہ اس کو دفتر سے نکال دیا جائے گا۔ یہ واقعہ اگر صبح ہوا تو شام تک وہ اس واقعہ کو بھول جائیں گے کہ متعلقہ چپراسی کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا تھا۔ وہ بہت رحم دل اور انسان دوست ہیں۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے کبھی کبھی دفتر کے انتظامی امور میں ایسا خلل پڑتا ہے کہ اس کا اثر دوسرے کارکنوں پر پڑتا ہے۔ یہاں ایک واقعہ اور بیان کر دوں کہ انجمن جب دلّی منتقل ہوئی جیسا کہ میں اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ انجمن سخت ترین مالی دشواریوں کا شکار تھی اس کا ذکر اس سے پہلے بھی آچکا ہے کہ انجم صاحب نے دو سال تک تنخواہ نہیں لی اور صرف یہی نہیں کہ انھوں نے ۲۵ ہزار روپے انجمن کو قرض بھی دیا جس کی ادائیگی اس وقت ہوئی جب انجمن کے مالی وسائل ٹھیک ہو گئے۔ اس قرض دینے کی وجہ یہ تھی کہ انجم صاحب یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ انجمن کے اسٹاف کو تنخواہ ایک دن دیر سے ملے۔ کیوں کہ انھیں خیال تھا کہ اسٹاف پہلے ہی مالی دشواریوں میں گرفتار ہے اور کارکن نئے شہر میں آباد ہیں۔ اب اگر تنخواہ دیر سے ملی تو یہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ انجم صاحب ان دنوں یہ کہہ کر اسٹاف کی حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ ان شاء اللہ وہ وقت بھی آئے گا کہ جب آپ کی محنت کا صلہ ملے گا اور آپ کی تنخواہوں میں مناسب اضافے ہوں گے۔ آج خدا کا شکر ہے کہ انجمن کے اسٹاف کی جو تنخواہیں ہیں وہ سینٹرل یونیورسٹی کے گریڈ کے مطابق ہیں اور ہندوستان میں کوئی اردو ادارہ اپنے اسٹاف کو اتنی تنخواہیں نہیں دیتا۔ ایسا صرف انجم صاحب کی محنت و لگن اور اسٹاف کے بھرپور تعاون کی وجہ سے ہے۔

انجم صاحب یک رخے نہیں ہیں، وہ ادیب ہیں، اچھے منتظم ہیں اور اعلا درجے کے مقرر ہیں۔ فوٹو گرافر بھی بہت اچھے ہیں، ہومیوپیتھی میں بھی اچھا خاصا دخل رکھتے ہیں پھر ادب میں بھی کسی خاص ایک موضوع پر کام نہیں کیا بلکہ مختلف میدانوں کو اپنی جولان گاہ بنایا ہے۔ تحقیقی کتابیں لکھیں، بڑی تعداد میں تنقیدی مضامین لکھے۔ متنی تنقید کے فن پر اردو میں پہلی کتاب لکھی۔ فارسی اور انگریزی سے اردو میں ترجمے کیے۔ غالب کے خطوط اور "آثار الصنادید" کے اعلا ترین درجے کے تنقیدی اڈیشن تیار کیے۔ اور اس کے علاوہ وہ ۱۴، ۱۵ سال تک کروڑی مل کالج میں اردو کے استاد رہے۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طلبہ کو پڑھایا اور پی۔ ایچ ڈی کے طلبہ کی رہنمائی کی۔

تارا چرن رستوگی

تالیف کاری اور اس کے ملتزمات
اور
خلیق انجم بہ حیثیت مولف

شاعر بمبئی کے ایک شمارے میں میرا مضمون اداریہ نگاری و تبصرہ کاری ایک مطالعہ دو تین سال پیشتر شائع ہوا تھا۔ ادبیاتی صحافت ویسے تو صحافت تنظیم journalism کے تحت آتی ہے مگر ادبیات سے تعلق اس کا بغور مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ اردو ہی میں کیا، انگریزی میں بھی اس موضوع پر کوئی کاوش نہیں کی گئی ہے۔ کسی ادبی جریدے کے مدیر کو ادبیاتی دل و دماغ کا حامل ہونا ضروری ہے۔ ادبیات سے کسی نوعیت کی کارآگہی کا فقدان اس کا بڑا دشمن ہوگا اور کسی طرح کا انتشار خیالات اس کی بدبختی کا آئینہ دار ہوگا۔ بہ حیثیت مدیر ہر شمارے کے لیے اس کو اداریہ سپرد قلم کرنا پڑتا ہے۔ اداریہ کون کون سے اوصاف سے متصف ہونا چاہیے اس پر مذکرہ مضمون میں بھرپور روشنی ڈالی گئی تھی۔ غالباً یہاں اداریہ کی بابت کچھ معروضات اجمالاً پیش کرنا برمحل ہوگا۔ ہر شمارے کا اداریہ اس کے مشتملات پر روشنی ڈالتے ہوئے قارئین کو پیش کردہ مضامین، منظومات افسانوں وغیرہ سے متعارف کرا دیتا ہے تو بھی خاص خاص باتیں قارئین کو معلوم ہو جاتی ہیں۔ اگر خصوصی شمارہ نکالا جاتا ہے تو ادارت کو مبارزہ طلبی challenge سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یعنی پیش کیے جانے والے مواد پر تمام تر توجہ صرف کرنا پڑتی ہے۔ ادارت کو خصوصی نمبر کے موضوع سے سیر حاصل واقفیت نیز واشگاف کارآگہی کو بروئے کار لانا پڑتا ہے، جو مشکل کام ہے۔ اگر خصوصی نمبر کارآگہانہ سلیقے سے نکالا گیا ہے تو اس خصوصی نمبر کو کتاب کے سائز میں بھی نکالا جا سکتا ہے۔ اس بحث سے جو نکات مستنبط کیے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں۔

ا۔ مدیر کی موضوع سے بھرپور واقفیت

ب۔ اداریہ میں مشمولات پر طائرانہ نظر۔ اگر کسی موضوع پر ہدایت و ہمت کی نشاندہی، اگر ضروری مواد سے بھرے ہوں تو صاف ظاہر ہے اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے گا۔

ج مواد کی ترتیب

مندرجہ بالا اوصاف ادبی تالیفات میں بھی ہونا چاہئیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ڈاکٹر خلیق انجم جن کا اردو ادبیات میں کلیدی و مرکزی مقام رہا ہے بہ حیثیت مولف کون اوصاف سے حامل ہیں درج ذیل تالیفات کی روشنی میں انتقادی جائزہ لینا واقعی ادبی خدمت ہی تصور کی جائے گی

سید سلیمان ندوی	انجمن ترقی اردو ہند
محی الدین قادری زور	" " "
فیض احمد فیض	" " "

اختر انصاری شخص و شاعر

سید سلیمان ندوی مرحوم پر تالیف میں خلیق انجم نے اپنی بھرپور آگہی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "مولانا سید سلیمان ندوی بیسویں صدی کے صف اول کے عالموں میں سے تھے۔ مرحوم عالم دین تھے، مورخ تھے، محقق اور سوانح نگار، شاعر اور مترجم تھے، سیرت نگاری میں علامہ شبلی کے بعد انھی کا نام آتا ہے . . . . مولانا ندوی کو انجمن ترقی اردو ہند سے گہرا لگاؤ تھا۔ انھوں نے انجمن کی حمایت میں لکھا، اسے مشورے دیے اور بعض اوقات تنقید بھی کی . . . " (حرف آغاز)

مدیر و مولف کو موضوع کی پوری آگہی اگر نہ ہو یا وہ کسی مخمصے کا شکار ہوجائے یا موضوع کے متعلقات پر کسی قسم کا انتشار اس کے دماغ کو محصور کر لے تو وہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس کو علوم ہونا چاہیے کہ تالیف میں موضوع سے متعلقہ تمام تر پہلوؤں پر روشنی ڈالنے والی تحریریں شامل کی جائیں۔ خلیق انجم صاحب مرحوم کی جملہ خوبیوں سے آگاہ تھے لہٰذا انجمن ترقی اردو ہند، سید سلیمان ندوی سمینار میں پیش کیے گئے ایسے مقالے منتخب کر لیے جو تالیف میں اولیت کے قابل سمجھے گئے۔ سید مظفر حسین برنی سابق گورنر منی پور اور ہریانہ کو خطبۂ افتتاحیہ کے لیے مدعو کیا جانا نگاہِ انتخاب کی خوبیوں کی آئینہ دار ہے۔ فی الواقع خلیق صاحب نے جناب برنی صاحب جو خوبی ہائے دل و دماغ کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں افتتاح کرنے کے لیے مدعو کیا یہ امر بالواسطہ اس کا ثبوت ہے کہ

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

خلیق صاحب نے مرحوم کا سوانحی خاکہ پیش کرتے ہوئے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ "تالیف ہٰذا میں صرف ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے بھی مراسلات کے توسط سے مولانا سلیمان ندوی مرحوم سے بارہا استفادہ کیا تھا۔ دونوں کے مابین مراسلت کے تعلق سے ان کے خطوط پر مشتمل مجموعے بھی دستیاب ہیں۔ اگر اس موضوع پر بھی کوئی تحریر شامل کر لی جاتی تو اس گراں مایہ تالیف کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہوجاتا۔ کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خلیق صاحب اس موضوع کو نظر انداز کر گئے۔ غالباً ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے مضمون "مولانا سید سلیمان اور فارسی ادبیات" اور ڈاکٹر مسز افتخار بیگم کی تحریر "دبستان شبلی کے ایک ممتاز ادیب، مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ میں اقبال کے تعلق سے بھی کچھ نہ کچھ کہا گیا ہے مزید براں ایک اور مضمون کا اضافہ تالیف کی ضخامت کو بڑھا دیتا غالباً ایسی ہی وجوہ سے اقبال اور سلیمان ندوی پر علاحدہ مضمون شمول نہیں ہو سکا۔ بہرکیف، ضرورت تھی کیوں کہ علامہ اقبال اکثر و بیشتر سید سلیمان ندوی مرحوم سے متعدد امور پر رجوع کرتے تھے مرحوم ہمہ جہت شخصیت، کے حامل تھے اور تالیف میں بھی جہات روشنی میں لائے گئے ہیں۔

محی الدین قادری زور بھی قابل ستائش تالیف ہے۔ "حرف آغاز" کے تحت خلیق صاحب نے باتمام اجمال موضوع کے متعلق سبھی نکات پیش کر دیے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ

"ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور تاریخ اردو ادب کا ایک روشن باب ہیں۔ انھوں نے تقریباً ۴۰ سال تک اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ ان کا بیشتر کام دکنی ادب پر ہے لیکن انھوں نے کبھی شمالی ہند کے ادیبوں سے کسی قسم کا تعصب نہیں برتا۔ دکن میں پیدا ہونے کے ناتے ان کے لیے دکن کا ہر ذرہ دیوتا تھا۔ زبان اور ادب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ انھوں نے قدیم دکنی ادب کے شہ پاروں کی بازیافت کی، دکنی کے کئی اہم اور قدیم مخطوطات مرتب کر کے شائع کیے۔ . . . . دکن کی قدیم تاریخ اور تہذیب سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ انھوں نے ایوان اردو جس کی تعمیر زور تھا

ہی کی دلچسپی کی مرہونِ منت تھی) . . . بڑی تعداد میں مخطوطات اور مطبوعات جمع کیے . .
میوزیم قائم کرگے اس میں دکن کے حاکموں کی تصویریں، تلواروں اور دوسرے ہتھیار، فرامین طغرے
خطاطی کے اعلانات، سیاسی دستاویزیں وغیرہ جمع کیں، یہ چیزیں دکن کی قدیم تاریخ اور
تہذیب کا مطالعہ کرنے والوں . . . کے لیے بہت اہم ہیں۔

"حیاتِ زورؔ" مولف ہی کی تحریر ہے جو ۱۰ صفحات کو محیط ہے۔ زورؔ مرحوم کی ادبیاتی و ثقافتی ظفریابیوں کا ایسا خاکہ پیش کیا گیا ہے کہ اس کو زورؔ صاحب کی پوری شخصیت کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔ زورؔ صاحب کی کتاب اردو شاعری کا انتخاب (ساہتیہ اکیڈمی) جس پر رشید حسن خاں نے سخت تنقید کی تھی اس کا بھی ذکر کر دیا ہے، جو فی الواقع ضروری تھا۔ تالیف میں ۱۹ تحریریں شامل کی گئیں ہیں۔ جن کا مطالعہ قارئین کو زورؔ مرحوم سے پوری طرح متعارف کر سکتا ہے۔ افسانہ نگاری، تنقید نگاری، مخطوطہ شناسی، اردو خدمات، حیدرآباد میں تعمیرِ ایوانِ اردو، لسانیات، شاگردوں کی حوصلہ افزائی، فارسی و اردو ادبیات میں گہری دلچسپی، سماجی شعور، تصانیف و تالیفات وغیرہ موضوعات پر تحریریں، بہ حسنِ ترتیب تالیف میں شامل ہیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں خلیق انجم نے زورؔ صاحب کے جملہ متعلقات سے قارئین کو افادہ پہنچایا ہے۔ زورؔ پر ہر مطالعہ کے لیے یہ تالیف کام میں لائی جا سکتی ہے اس کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ یہی نہیں، اردو زبان پر ایک تحریر، یہ جو اردو زبان ہماری ہے" جو قلم زورؔ کی مرہونِ منت ہے۔ تالیف میں شامل کی گئی ہے۔ فی الواقع "قندِ مکرر" کا درجہ رکھتی ہے۔

فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ

یہ تالیف انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کی ہے۔ حرفِ آغاز کے تحت خلیق صاحب نے لکھا ہے کہ
"فیض احمد فیضؔ علامہ اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ گورکھپوری کے بعد اس صدی کے سب سے
زیادہ قدآور اردو شاعر ہیں۔ بیسویں صدی کے جن اردو شاعروں کو بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت
حاصل ہوئی ان میں غالبؔ، علامہ اقبالؔ کے بعد فیضؔ کا نام آتا ہے۔ ان تینوں کی وجہ سے اردو زبان
اور اس کے تخلیقی ادب سے دنیا کا بڑا حصہ واقف ہوا۔ غالبؔ اور علامہ اقبالؔ کو مرنے کے بعد
جو شہرت نصیب ہوئی وہ ان کو اپنی زندگی میں حاصل ہو گئی۔ فیضؔ کو ہندوستان اور پاکستان
دونوں ملکوں میں برابر مقبولیت حاصل رہی ہے . . . فیضؔ نے شاعری اور عملی زندگی میں اپنی محبت
اور خلوص کے ذریعہ انسانیت کو جو کچھ دیا ہے ہم اس کا بدلہ نہیں چکا سکتے . . ."

خلیق صاحب نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو فیضؔ کی عملی زندگی اور ان کی شاعری کی بابت مضمونوں اور کتابوں میں بالتشریح لکھا گیا ہے، لکھا جا رہا ہے اور آیندہ بھی لکھا جائے گا۔ ۸ سوانحی مقالے ۱۲ تنقیدی مقالے ۵ انٹرویوز انتخاب فیضؔ کے تحت فیضؔ کی نظموں وغیرہ کا انتخاب تالیف میں شامل کیے گئے ہیں۔ مشمولہ تحریریں چوٹی کے ادیبوں سے لکھائی ہوئیں ہیں۔ لہٰذا انجمن ترقی اردو ہند کی اس مطبوعہ پیش کش سے قارئین خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ فیضؔ کا کسی اعتبار سے مطالعہ کرنے کے لیے اس تالیف کو نظر انداز نہیں جا جا سکتا۔ مزید براں، خلیق انجم کی ژرف بینی، ذہنی و قلبی مضمرات سے غیر ملوث انتقادی توانائی "حرفِ آغاز" کے پہلے جملے ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ انھوں نے اس صدی کے سب سے زیادہ قدآور تین شاعر بتائے ہیں۔ اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ گورکھپوری ملحوظ رہے۔ آج کل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فراقؔ گورکھپوری کی شاعری کو انجانی کر دینے کی کچھ درپردہ سازش سی چل رہی ہے۔ خلیق صاحب کا نظریہ صالح بھی

ہے اور صحیح بھی۔

اختر انصاری شخص اور شاعر:

یہ وہ تالیف ہے جس کو انجمن ترقی اردو ہند نیو دہلی نے شائع کیا ہے اور خلیق صاحب نے ترتیب دیا ہے حرف آغاز، خلیق صاحب کی ناقدانہ نظر کا آئینہ دار ہے اور اس نوعیت کا ہے کہ اس کو یہاں پیش کیا جائے تا کہ قارئین خاطر خواہ استفادہ کر سکیں۔

۲۵، ۳۰ سال قبل اردو کی جن عصری کتابوں کو اہمیت حاصل تھی ان میں 'افادی ادب' اور 'ایک ادبی ڈائری' بھی شامل تھیں یہ دونوں کتابیں ایک ایسے شخص کی تصنیف تھیں جس کا شمار اردو کے ممتاز اور نامور ترقی پسند نقادوں اور شاعروں میں ہوتا تھا یعنی اختر انصاری مرحوم۔ آہستہ آہستہ اختر صاحب کی مقبولیت اور شہرت میں کمی آنے لگی۔ یہاں تک کہ خود ان کی زندگی میں نئی نسل ان کے نام اور ان کی ادبی زندگی سے واقف نہیں رہی۔ اختر انصاری (اپنی شہرت و مقبولیت) کو نقصان پہنچانے والے خود اختر انصاری تھے۔ اختر انصاری کی . . . کمزوری . . . ان کی اُنا کی غیر معمولی بڑھی ہوئی لے . . . نتیجہ یہ ہوا کہ . . . نقادوں نے انھیں قطعی نظر انداز کر کے بدلا چکا لیا اور پھر ترقی پسند نقاد شروع ہی سے بہت زیادہ مصلحتوں کے شکار رہے ہیں . . . مرحوم نے زندگی بھر خونِ جگر سے اردو شعر و ادب کی آبیاری کی لیکن خود ان کی زندگی ہی میں ان کو فراموش کر دیا گیا . . . وہ گروہ بندی کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی . . .''

'حرف آغاز' میں غرض کہ وہ سب کچھ آگیا ہے جو اگر سپرد قلم نہ کیا جاتا تو اختر انصاری کے متعلق جملہ مضامین میں کمی رہ جاتی۔ اس کی نشاندہی بہت ضروری تھی کیوں کہ 'انا' کی گرفت میں پھنسنے سے آج کل کے شعراء ادبا پیچھے رہ سکتے ہیں۔ بالواسطہ مشورہ indirect suggestion نفسیاتی اعتبار سے تیر بہدف ہی ثابت ہوتا ہے کیوں کہ براہ راست مشورہ اکثر و بیشتر ناگوار گزرتا ہے۔

سوانحی خاکہ خطوط اختر انصاری، اختر کی ادبی خدمات پر مضامین اور دیگر شمولات اختر انصاری کی شہرت کی نو آبادکاری کے لیے ضروری بھی ہیں اور افادیت سے بھرپور بھی ہیں۔ بنیادی طور پر اختر انصاری اچھے شاعر تھے۔ شاعری کا انتخاب کرنا جوئے شیر کا لانا ہے۔ کہتے ہیں نا کہ ؎

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

خلیق صاحب انتخاب پیش کرنے میں بھی عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔ اختر انصاری کا درج ذیل شعر تو روزمرہ ہی میں داخل ہو گیا ہے ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اختر انصاری کی نگارشات کو مطالعہ میں لانے کے لیے خلیق انجم کی پیش کردہ تالیف اختر انصاری شخص، شاعر سرفہرست ہی نظر آئے گی۔

مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے

یہ تالیف اردو اکادمی، دہلی کی پیش کش ہے، جو ۱۹۸۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ ادبیاتی سرگرمیاں، بالخصوص اردو زبان وادب سے متعلق سرگرمیاں دتی میں صدیوں سے ہوتی رہی ہیں۔ گزشتہ متعدد برسوں سے جس نوعیت کی مربوط ومنظم کاوش well co-ordinated endeavours روایت میں تبدیل ہو رہی ہے اس میں خلیق انجم کا کردار واضح خدوخال profiles کا حامل ہے۔ غالب اکیڈمی، بستی نظام الدین دہلی میں ۲۵ تا ۲۷، اکتوبر ۱۹۸۷ء ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر خلیق سمینار کے ڈائرکٹر تھے۔ سمینار میں پیش کیے گئے مقالے بغایت سلیقے اور حسن ترتیب سے تالیف دینے کا سہرا خلیق صاحب کے سر ہے۔ "حرفِ آغاز" سے رجوع کرنے پر تمام تر متعلقات واضح ہوجاتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

> "مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستانی تاریخ کی عظیم ترین ہستیوں میں ہیں۔ کچھ سیاسی حالات اور کچھ بدتوفیقی کہ ہم نے قومی زندگی میں اپنے محسن کو وہ مقام نہیں دیا جس کا وہ مستحق تھا۔ ہاں، وہ وقت دور نہیں جب قوم اپنی کوتاہی کا اعتراف کرے گی۔ مولانا آزاد ہماری جنگ آزادی کے ہیرو تھے۔ . . مولانا نے ایک طرف قید وبند اور دار و رسن کی آزمائشوں میں زندگی گزاری اور دوسری طرف اپنی قوم اور خاص طور پر مسلمانوں کی فکری قیادت کی۔ سرسید نے مسلم فرقے کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا اور مذہب کو عصری زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی . . . مولانا آزاد اور سرسید کا اختلاف، سیاسی میدان میں تھا۔ سرسید کا خیال بلکہ عقیدہ تھا کہ مسلمان برطانوی حکومت کے حمایتی بن کر رہیں۔ اس کے برعکس مولانا آزاد . . . میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا۔ میرا خیال ہے کہ سرسید جس راستے پر چل کر منزل پر پہنچے اس کے بعد کا راستہ وہی تھا جس پر مولانا آزاد پہنچے . . . مولانا آزاد کی شخصیت متنوع تھی۔ وہ اگر مجاہد آزادی تھے تو عالم دین بھی تھے . . . وہ فلسفی تھے، مفکر تھے، مدبر تھے، تاریخ پران کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو انقلاب برپا کر دیا۔ ایسی روایتوں کو جنم دیا، جن سے اردو صحافت ناآشنا تھی، مولانا کا شمار اردو کے اعلاترین انشاپردازوں میں ہوتا ہے۔ اگر ان کا اسلوب تحریر منفرد تھا تو تقریر میں بھی ان کا ثانی ملنا مشکل تھا۔ ان جیسے شعلہ نوا اور جادو بیان ہندوستان نے بہت کم پیدا کیے ہیں . . . غرض کہ مولانا اقتادِ طبع، علم، ذہانت وفطانت، اہلیت وصلاحیت معاملہ فہمی اور دوراندیشی کے لحاظ سے غیرمعمولی انسان تھے ایسے انسان جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں . . . "

یہ ہے لبِّ لباب ان تمام اوصاف کا جن کے مولانا آزاد حامل تھے۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خلیق انجم نے ان تمام تر سطور کی نشاندہی کردی ہے جن پر نگاہ مرتکز کرتے ہوئے کسی زاویہ سے مولانا کی تصانیف نیز واقعاتِ ملی وقومی جن پر مولانا نے اثرات مرتب کیے ہے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ اس تالیف میں شامل مضامین کی مجموعی تعداد ۲۶، ہے اور ان مضامین کو درج ذیل عنوانات کے تحت جگہ دی گئی ہے۔

۱۔ سیرت وشخصیت ۲۔ سیاست ۳۔ مذہب ۴۔ ادبی نثر ۵۔ صحافت ۶ شاعری۔

پچھلے تین چار سال کے دوران مولانا آزاد پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور متعدد اردو جریدوں نے خصوصی شمارے

بھی شایع کیے جن میں اردو اکادمی دلی کا ماہنامہ رسالہ "ایوان اردو" بھی شامل تھا اور قابل تعریف پیش کش تھا سمیناروں میں شرکار کرام نے اپنے خیالات پر مشتمل مقالے پیش کیے۔ غالب اکیڈمی، بستی نظام الدین دہلی کی سمینار میں پیش کیے غالب اکیڈمی، بستی نظام الدین دہلی کی سمینار میں پیش کردہ مقالوں کو بہ حسن ترتیب و تالیف پیش نظر کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ "آزاد" پر محققانہ کام کرنے والوں کو اس تالیف کی جانب بھی رجوع کرنے پڑے گا۔

منتخبات

اردو اکادمی نیو دہلی اور انجمن ترقی اردو ہند، نیو دہلی کے وہ تالیفات جن کی ادارت ڈاکٹر خلیق انجم کے سپرد رہی اور جن کا جائزہ اس مضمون میں لیا گیا ہے مستقل اہمیت و افادیت سے بھرپور ہیں۔ حرفِ آغاز کے تحت خلیق صاحب نے مستعدانہ ژرف نگاہی و کارآگہی کا ثبوت دیا ہے۔ خلیق انجم صاحب نے ایک اور تالیف "فراق گورکھپوری" کے حرفِ آغاز میں منجملہ دیگر امور یہ نکتہ بھی پیش کیا کہ فراق پر پوربی زبان (جو فراق کی مادری زبان تھی) نے بھی کچھ نہ کچھ اثر مرتب کیا ہے۔ ژرف نگاہی کا حامل ہی ایسی نکتہ رسی کا ثبوت دے سکتا ہے، بلکہ مثال پیش کر سکتا ہے۔ خلیق صاحب کے "حرفِ آغاز" کے تحت سمت ہدایت کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مولانا آزاد کے بارے میں ایک نکتہ نظر انداز ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آزاد نے علامہ اقبال اور ان کی شاعری کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔

تالیف میں مواد کو کس طرح یعنی کس ترتیب سے پیش کیا جائے مشکل کام، بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ خلیق صاحب کی ترتیب کہیں انتشار کی زد میں نہیں آئی ہے۔

ایک اچھی تالیف اپنے موضوع کے اعتبار سے قدر و منزلت کی حامل اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اس میں کسی موضوع سے متعلقہ نظریات کا احاطہ کیا گیا ہو۔

بحیثیت مولف ڈاکٹر خلیق انجم اعلیٰ ترین تالیفی خد و خال distinguished profiles کے حامل ہیں اور اس کے ساتھ اردو اکادمی نیو دہلی اور انجمن ترقی اردو ہند دونوں ادارے تحسین و تعریف کے مستحق ہیں۔ تالیف کار اور تالیفات دونوں کے بارے میں غنی کے درج ذیل شعر پر یہ تحریر "ختم شد" کی منزل پر پہنچتی ہے ؎

آب بود معنی روشن غنی
خوب اگر بستہ شود گوہر است

عبدالمغنی

متنی تنقید اور خلیق انجم

انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اردو دنیا میں ڈاکٹر خلیق انجم کی شہرت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کے علمی و ادبی کارناموں پر کچھ پردہ سا پڑ گیا ہے، گرچہ حال میں غالبیات کے ایک محقق کی حیثیت سے مکاتیب غالب کی ترتیب کے بعد ناقدوں کی توجہ ان کی طرف مبذول ہونے لگی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے متعدد ایسے تحقیقی و تنقیدی کام پچھلے بیس پچیس سال میں کیے ہیں جن کا اعتراف تاریخ ادب پر ایک قرض ہے۔ "مرزا محمد رفیع سودا"، "مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط"، "غالب کی نادر تحریریں" اور "معراج العاشقین مع دکنی کلام" ڈاکٹر انجم کی وقیع کاوشیں ہیں جو ۱۹۶۷ء میں ان کی عالمانہ و فاضلانہ تصنیف "متنی تنقید" کی اشاعت سے قبل ہی سامنے آچکی تھیں۔ یہ سب مل کر ایک ایسے محقق و ناقد کا کردار پیش کرتی ہیں جو اپنی دیدہ ریزی اور دیدہ وری کی بدولت اپنا ایک علمی مقام بناتا ہے۔ اس مقام کی مزید وضاحت دلی کے آثار قدیمہ پر ڈاکٹر انجم کے ان تحقیقی مقالات سے ہوتی ہے جو چھپ کر اہل نظر سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ آثار قدیمہ کے موضوع پر ان کی تین کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔

تنقید متن پر اردو میں اصولی بحثیں بہت کم کی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد محققین ادب کے علمی کارناموں کے باوجود متن کی تنقید کے اصولوں اور طریقوں کی واقفیت عام نہیں ہے۔ حالاں کہ پچھلی چوتھائی صدی میں خاص کر یونیورسٹیوں کے اندر متون کی ترتیب کے کام بہ کثرت ہوئے ہیں۔ ریسرچ اب اردو کی اعلیٰ تعلیم کا ایک لازمی جز ہو گیا ہے اور آئے دن پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کے لیے لکھے ہوئے مقالات شایع ہوتے رہتے ہیں۔ اس وسیع ریسرچ ورک میں متن کی اڈیٹنگ کا حصہ بہت نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ کسی قسم کا تحقیقی موضوع ہو اس کا حق اس وقت ادا ہو سکتا ہے جب صحیح متن کو مدنظر رکھا گیا ہو، اس لیے کہ جن تصانیف کا مطالعہ کیا جاتا ہے ان کے فہم اور تجزیے کے صحیح و معتبر ہونے کے لیے ان کی عبارت کی درستی ضروری ہے۔ ورنہ ناقص عبارت کی بنیاد پر جو نتائج نکالے جائیں گے ناقص اور ناقابل قبول ہوں گے۔ علمی کاموں کی اصلیت، حقیقت، اہمیت اور افادیت متن و عبارت کے صحیح ہونے پر منحصر ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی تصنیف "متنی تنقید" اردو میں لکھی ہوئی ایسی پہلی کتاب ہے جو تصحیح متن کے طریقوں پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالتی ہے۔ اس سے ادب کے معیار کی تعین بھی ہوتی ہے اور اس کی تشریح و توضیح کے وہ پیمانے مقرر ہوتے ہیں جن سے ذوق و شعور کی پرورش اور ترقی کا سامان ہوتا ہے۔ کہنا چاہیے کہ متن

کی تصحیح دراصل تحقیق کا وہ بنیادی کام ہے جس پر تنقید کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو متنی تنقید بہ یک وقت تحقیق و تنقید دونوں میدانوں میں شامل ہے اور علم و ادب کے ان دونوں دائروں کا ارتقا اسی پر مبنی ہوتا ہے۔

ایسے کلیدی موضوع پر بحث آسان نہیں۔ اس میں چند در چند مشکلات ہیں۔ اس سلسلے میں دو اہم ترین مسائل کی نشاندہی ہی کافی ہوگی۔ اول یہ کہ موضوع کی تمام جہتوں اور ان کے مضمرات کا احاطہ بہت دشوار ہے۔ جس کے لیے نہایت باریک بینی کے ساتھ حقائق کا مفصل تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ دوم یہ کہ اس تجزیے میں تکنیکی امور کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ کم ہی لوگ اس کے مطالعے کی طرف راغب ہوتے ہیں اور عام قارئین کے لیے اس کا قابل مطالعہ ہونا بھی مشکوک ہوتا ہے، اس لیے کہ اصطلاحی الفاظ اور اعداد و شمار کی فراوانی وضاحت بیان میں حائل ہوسکتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر خلیق انجم ان دونوں مسائل سے اس کمال کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں کہ مباحث بسا اوقات قصے کی طرح دل چسپ ہوگئے ہیں، خاص کر متن کی تحریف و تصحیح کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ قاری کی معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کے تجسس کو بہم بیدار رکھتی ہیں اور اس کے ذہن پر ایسے ایسے اسرار و رموز کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس کی دل چسپی مسلسل بڑھتی جاتی ہے۔ یہ بات صرف اس لیے ممکن ہوئی کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے موضوع کے پورے مواد کی فراہمی کے ساتھ ہی اس پر کافی غور و فکر کر کے اس کے سارے پیچ کھول دیے، اس کے علاوہ انھوں نے بہت ہی سادہ و سلیس اندازِ بیان سے کام لے کر ہر قسم کے قاری کو اعتماد میں لیا۔ یہ انداز بے تکلفی انشائیے کا ہے جس میں جا بجا لطیف مزاح کی چاشنی کے باوجود کہیں ابتذال نہیں ہے۔ ایک مشکل اور سنجیدہ علمی موضوع کی یہ تسہیل و تفہیم مصنف کی واقفیت اور مہارت کا ثبوت ہے۔

دراصل "متنی تنقید" میں ڈاکٹر خلیق انجم کا اسلوب تحریر ایک ایسے شخص کا ہے جو ایک خاص فن کی گویا بنیاد رکھ رہا ہے اور اس نے اس کے ہر ہر پہلو کی چھان بین کر لی ہے۔ لہٰذا وہ پورے اعتماد اور بے ساختگی کے ساتھ اپنے نتائج افکار پیش کرتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ اس کے پڑھنے والے کچھ نئی آگہی حاصل کریں گے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے دیگر علما کے ساتھ تبادلۂ خیال نہیں کیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے متعلقہ موضوع پر کسی بھی جہت سے اظہار خیال کرنے والے اپنے پیش رووں کے متعدد حوالے دیے ہیں اور بعض اوقات ان کی رایوں پر محاکمہ بھی کیا ہے۔ استفادے اور افادے کا یہ طریقہ تخلیقی حد تک نتیجہ خیز ہے، جس میں مناسب موقع سارے ضروری نکات کی تفتیش کر کے انھیں ایک نئے انداز سے بہت سوچ سمجھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ یہ ترتیب مصنف کے اپنے تجربات و تصورات کا خلاصہ ہے، جس کی اصلیت بجائے خود ایک علمی کارنامہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر انجم نے تنقید متن کے متعلق موجود حقائق و افکار کی ایک نئی تدوین کی ہے اور اپنے مطالعات کا حاصل ایک خاص تنظیم سے پیش کیا ہے۔ وہ موضوع کے مختلف پہلوؤں کی تبویب اور ان پر بحث اس منظم طریقے سے کرتے ہیں کہ مجموعی طور پر متعلقہ مواد کا ایک مربوط ہیولا تیار ہوجاتا ہے اور قاری بہت آسانی کے ساتھ ایک تکنیکی مضمون کی پیچیدگیوں اور باریکیوں سے نہ صرف واقف ہوتا ہے بلکہ لطف اٹھاتا ہے، اس لیے کہ مصنف صراحت کے ساتھ تدریجی طور پر تمام تفصیلات ایک رواں دواں انداز سے سامنے لاتا ہے، وہ اس سلسلے میں نہ تو بے جا طوالت سے کام لیتا ہے نہ پریشان کن اختصار سے سب

سے بڑھ کر یہ کہ وہ بھاری بھرکم اصطلاحات کے چکر سے نکل کر سادہ و عام فہم لفظوں میں اپنا مافی الضمیر صاف صاف بیان کر دیتا ہے، گرچہ منطقی استدلال اور نکتہ سنجی اس کی ہر تشریح سے عیاں ہے۔ یہ ایک اچھا تدریسی اسلوب بھی ہے، جس میں تجزیے کی قوت ترکیب کی صلاحیت سے ہم آہنگ ہے اور دونوں علمی طریقوں کا ارتباط تصنیف کی جامعیت و ثروت کا باعث ہوتا ہے۔ اس نظم و ضبط کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

کتاب کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر باب کو اس کی جزئیات میں تقسیم کر کے ہر ہر جز پر روشنی ڈالی گئی ہے، جیسے "متن کی تصحیح" پر مشتمل باب کے اجزا یہ دیے گئے ہیں:

بنیادی نسخہ، موازنے کا طریقہ، اختلافات نسخ کے مسایل، متنوں کی مختلف قرائتیں، اردو رسم خط کی دشواریاں، متن کی تصحیح، قیاسی تصحیح۔

ان اجزا میں قیاسی تصحیح پر بحث کرتے ہوئے اس کے پانچ مدارج بتائے گئے ہیں، پھر سب مدارج کا الگ الگ بیان ہے۔ گرچہ قیاسی تصحیح کی تشریح ایک مستقل باب میں اسی عنوان سے کی گئی ہے۔ اس لیے کہ یہ موضوع تصحیح متن کے دیگر امور سے ممتاز اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح "اعلیٰ تنقید" کے باب کو متعدد اجزا میں تقسیم کر کے ہر جز پر الگ الگ بحث کی گئی ہے، مثلاً متن مستند ہے یا غیر مستند، سرقہ، مصنفین کے ناموں کی مماثلت، مذہبی اختلاف، عوام کی عقیدت، مصنف کی شہرت کا ناجائز فائدہ وغیرہ۔

ڈاکٹر انجم اپنے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے بعض ایسے حقائق کی نشاندہی بحسن و خوبی کرتے ہیں جن کی ادبی تنقید میں بڑی اہمیت ہے، جب کہ جدید تنقید کا ایک حلقہ عصر حاضر میں ان کو نظر انداز کر رہا ہے۔ ماضی اور کلاسکی ادب پر ڈاکٹر انجم کا یہ اظہار خیال ان کی علمی بصیرت اور ادبی آگہی کا ایک نمایاں ثبوت ہے:

"مہذب قوم کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس کے پاس اپنے بزرگوں کی ذہنی اور فکری سفر کے ارتقا کی پوری تاریخ محفوظ ہوتی ہے۔ ہمارے حال کو فکر کی جن شمعوں نے روشن کیا ہے ان میں کوئی شمع ایسی نہیں جس کا رشتہ ماضی سے نہ ہو۔ کوئی سائنس اور کوئی فن ایسا نہیں جو ماضی کی پرواہ کیے بغیر ترقی کر سکے۔ وقت کے تیز اور تند دھارے ہر چیز کو مٹاتے ہوئے چلتے ہیں۔ انسان ازل سے ان دھاروں پہ قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جن ایجادوں کے ذریعے انسان نے اپنے مقصد میں تھوڑی بہت کامیابی حاصل کی ہے ان میں تحریر سر فہرست ہے۔ کتابوں اور مختلف اشیا پر لکھی گئی تحریروں ہی سے ہم ماضی کی بازیافت کرتے ہیں۔ الہامی کتابوں کے بعد اگر کوئی چیز مقدس ہے تو بزرگوں کے وہ فکری کارنامے ہیں جو کتابوں کی صورت میں ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔" (ص ۱۲)

تمہید کتاب کے بعد جملے "مقدمہ" کے طور پر کہے گئے ہیں اور ان کے مطالعے سے اس وسیع تناظر کا پتا چلتا ہے جس میں کتاب کے مباحث واقع ہوئے ہیں۔ اس تناظر کی مزید توضیح اور موضوع کی تعین کے سلسلے میں مقدمے کے یہ الفاظ قابل غور ہیں:

"تنقید ادبی ہو یا متنی، دونوں سائنس ہیں۔ دونوں کے کچھ اصول اور ضابطے ہیں۔ ادبی تنقید کے اصول زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، جب کہ متنی تنقید کے اصول نہیں بدلتے، البتہ

اسے زیادہ سے زیادہ سائنٹیفک بنانے کے لیے مزید اصولوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان دونوں کی راہیں کبھی بالکل ایک اور کبھی ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوتی ہیں۔ دونوں کا مقصد سچائی کی تلاش ہے۔ دونوں اپنے مواد کی تشریح اور تجزیہ کرتے ہیں۔" (ص ۱۴)

ادبی اور متنی تنقید وں کی حدود کا یہ تعین جہاں ان کے باہمی امتیازات کی وضاحت کرتا ہے وہاں ان کی مشابہتوں کی صراحت بھی، اگرچہ اس تشریح میں بعض امور کی مزید تفصیل مطلوب ہو سکتی ہے، مثلاً ادبی تنقید کے اصول میں زمانی تغیر کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ تنقید ادب کے کچھ مستقل اصول نہیں ہیں، اس لیے کہ فکر و فن دونوں کے بنیادی تصورات معین ہونے کے بعد مستقل ہو جاتے ہیں اور اصول موضوعہ کے طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ بہر حال یہ بات صحیح ہے کہ متنی تنقید ادبی تنقید کی بہ نسبت زیادہ معروضی ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کا تعلق بڑی حد تک تکنیکی امور سے ہے۔

اعلیٰ تنقید کے باب میں متن کی آزمائش کے طریقے بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر انجم نے لفظیات کی تنقید کا یہ اہم نکتہ پیش کیا ہے:

"متنی نقاد کو اپنی زبان کے ارتقا کا پورا علم ہونا چاہیے۔ مرزا مظہر کے اسکول کے شاعر کی زبان اور مفہوم دونوں دور ایہام گویاں کے شاعروں سے مختلف ہوں گے، ہر زبان میں ایسے الفاظ کی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے جن کے بارے میں قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا استعمال کب شروع ہوا یا کس زمانے میں ان کا مفہوم یا تلفظ بدل گیا۔" (ص ۱۳۶)

ڈاکٹر خلیق انجم نے متن و عبارت کی تنقید پر اپنا وقیع کارنامہ ۶۷ء میں پیش کیا۔ یہی وقت اردو ادب میں جدیدیت کے اس رجحان کے آغاز کا تھا جس کے جلو میں اسلوبیاتی تنقید کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس رجحان نے لفظیات کا ایک چکر چلایا، نیز ہیئت فن میں تجربوں پر زور دیا۔ اس طرح انفرادیت کی وہ ہنگامہ آرائی ہوئی جس میں روایت کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ اگر غور کیا جائے تو "متنی تنقید" کے مباحث میں ڈاکٹر انجم نے عبارت کلام کے جن مسائل سے بحث کی ہے اور اس سلسلے میں جو علمی حقائق اور تنقیدی نکات انھوں نے پیش کیے ہیں وہ وضاحتی کتابیات اور اسلوبیاتی تنقید دونوں کو روشنی دکھاتے اور ان کی رہ نمائی کرتے ہیں۔ جس طرح شبلی نے "موازنہ انیس و دبیر" میں ایک صنف شاعری کا فنی مطالعہ اور محی الدین قادری زور نے اسالیب نثر کا تجزیہ کر کے ادب کے اسلوبیاتی جائزے کی نہ صرف راہ ہموار کی تھی بلکہ شاہراہ تعمیر کی تھی، اسی طرح ڈاکٹر خلیق انجم نے "متنی تنقید" لکھ کر اسی کشادہ راستے پر ایک سنگِ میل نصب کیا۔ جس کا نشان جدید ترین یا جدیدی تنقید کی بے اعتدالیوں کے سبب گم ہوتا نظر آتا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس کتاب کی تازہ اشاعت ہو اور اس کا مطالعہ ایک نئے تناظر میں کیا جائے، تاکہ اسلوبیات و لفظیات کے علم برداروں کو ادبی و تنقیدی مسائل کی سنجیدگی و پیچیدگی کا احساس و عرفان ہو اور نئے لکھنے والوں کی استقامت کا سامان۔ اس طرح انفرادی تجربات کے شائقین اجتماعی روایات کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔ حال کا رشتہ ماضی سے استوار ہوگا، مسلّمہ تہذیبی قدروں سے وابستگی کی افادیت واضح سے واضح تر ہوگی، کلاسیکیت اور رومانیت کی ہم آہنگی سے وہ فکری و فنی توازن میسر آئے گا جس کی بنا پر ہی اخلاقیات و جمالیات کے امتزاج سے اعلیٰ ادب کی تخلیق و ترقی کے لیے فضا سازگار ہوتی ہے۔

سید شریف الحسن نقوی

خلیق انجم اور آثار الصنادید

پچھلے پچیس تیس برسوں میں جن حضرات نے اردو تحقیق اور تنقید میں ممتاز مقام حاصل کیا ہے ان میں ڈاکٹر خلیق انجم کا نام بھی شامل ہے۔ انجم صاحب کی پہلی کتاب "غالب کی نادر تحریریں" تیس سال پہلے شائع ہوئی تھی اور اب تک ان کی چوبیس پچیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انجم صاحب نے حضرت "مرزا مظہر جانِ جاناں" پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ جس پر انھیں دلی یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی ڈگری تفویض کی تھی (یہ مقالہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔) انجم صاحب کی ایک اہم کتاب "مرزا محمد رفیع سودا" ہے۔ جو سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب تحقیق و تنقید کا اعلا ترین نمونہ ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا تھا کہ "جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو میں تحقیق و تنقید کا معیار گر رہا ہے انھیں ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ معرکۃ الآرا کتاب دیکھنی چاہیے" یہ کتاب بیشتر یونیورسٹیوں کے ایم۔ اے کے نصاب میں شامل ہے۔ "غالب اور شاہانِ تیموریہ" میں انجم صاحب نے غالب اور ذوق کے ادبی معرکوں کے نئے نئے گوشے تلاش کیے ہیں اور قلعۂ معلیٰ سے غالب کے تعلقات کی تفصیل بیان کی ہے۔ انجم صاحب کی ایک اہم کتاب "متنی تنقید" ہے کلاسکی متون کی ترتیب کے اصول و ضوابط پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ اگرچہ بعد میں اس موضوع پر دو تین کتابیں اور چھپی ہیں۔ لیکن انجم صاحب نے ایک انتہائی خشک موضوع کو ایسا شگفتہ انداز تحریر دیا ہے کہ آج بھی ہندوستان اور پاکستان کی بیشتر یونیورسٹیوں کے ایم۔ فل کے نصاب میں یہ کتاب شامل ہے۔

انجم صاحب کا ایک غیر معمولی ادبی کارنامہ خطوطِ غالب کا تنقیدی اڈیشن ہے۔ خطوط کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور چوتھی زیرِ طبع ہے۔ "غالب کے خطوط" کا یہ تنقیدی اڈیشن متنی تنقید کے جدید ترین اصولوں کے مطابق کیا گیا ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو کے صفِ اول کے ادیب ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے انجم صاحب کو داد دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس کتاب کا مقدمہ ہی بجائے خود ایک علمی اور تحقیقی مقالہ کا وزن رکھتا ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی تو خلیق انجم پہلے ہی سے ہیں۔ اس مقالے پر انھیں کوئی علمی ادارہ ڈی۔ لٹ دے نکلے تو بے جا نہیں، برحق ہوگا"۔ اسی طرح پاکستان کے مشہور و ممتاز شاعر اور ادیب جمیل الدین عالی صاحب نے "غالب کے خطوط" کے اس اڈیشن کے بارے میں لکھا ہے "کہ اب تک خطوطِ غالب پر اتنا بڑا کام میرے علم کی حد تک کسی اور نے نہیں کیا۔ شاید پہلی بار یہ ہوا ہے کہ کسی اردو متن کی تدوین جدید جرمن طریقے پر کی گئی ہے۔ جرمن اس معاملے میں پورے یورپ کے لیے مثال اور امریکہ سے بہت آگے ہیں۔ غالب کے خطوط" کی تدوین جرمن انداز پر بالکل

سائنٹیفک ہے۔" اِن کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انجم صاحب بنیادی طور پر محقق اور متنی نقاد ہیں۔ انھوں نے فارسی سے اردو میں جن کتابوں کا ترجمہ کیا ہے ان کے حواشی بھی بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے لکھے ہیں۔ یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے، جو بنیادی طور پر محقق اور متنی نقاد ہو۔

انجم صاحب نے خاصی تعداد میں تنقیدی مقالے بھی لکھے ہیں لیکن ان مقالوں کی حیثیت ثانوی ہے۔

انجم صاحب دلّی والے ہیں۔ دلّی کی ہر چیز سے والہانہ عشق کرتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس شہر کا ذرہ ذرہ ان کے لیے دیوتا ہے۔

انجم صاحب کو فنِ تعمیر سے بھی لگاؤ ہے۔ انھوں نے اردو گھر کی تعمیر کے سلسلے میں اس فن سے اچھی واقفیت حاصل کی تھی۔ وہ ایک ایسی ہاؤسنگ سوسائٹی کے صدر رہے ہیں جس میں تین سو فلیٹ بن رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کالج کی شاندار عمارت کی تعمیری کمیٹی کے بھی صدر تھے۔ جدید فنِ تعمیر سے واقفیت حاصل کر کے انجم صاحب نے دلّی کی قدیم عمارتوں کی طرف توجہ کی۔ جب اردو اکادمی نے ایوانِ اردو نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تو خود انجم صاحب نے پیش کش کی کہ وہ دلّی کے آثارِ قدیمہ پر قسط وار مضامین لکھیں گے۔ انھوں نے ۱۳، ۱۴ قسطوں میں دہلی کے آثارِ قدیمہ پر مضامین لکھے۔ ان مضامین کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ مضامین پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے "آثارِ قدیمہ" کے فنِ تعمیر پر بھی قدرت حاصل کرلی ہے۔ میرے دعوے کا ثبوت دلّی کے آثارِ قدیمہ پر انجم صاحب کی دو کتابیں ہیں۔ ایک تو" دلّی کی درگاہ شاہِ مرداں" اور دوسری" دلّی کے آثارِ قدیمہ"۔ یہ دونوں کتابیں ۱۹۸۸ء میں دہلی اردو اکادمی سے شائع ہوئی ہیں۔" دلّی کے آثارِ قدیمہ" میں ان کی دلچسپی اور ان کی واقفیت کو دیکھتے ہوئے اردو اکادمی دلّی کی تحقیقی اور اشاعتی کمیٹی کی طرف سے میں نے فرمائش کی کہ وہ" آثار الصنادید" کو مرتب کردیں۔ مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے اس کام کی ذمہ داری قبول کرلی اور" آثار الصنادید" کا متن اس انداز سے مرتب کیا کہ وہ واقعی قابلِ تقلید نمونہ بن گیا۔

قدیم فنِ تعمیر کو سمجھنے کے لیے انھوں نے بڑی تعداد میں مختلف زبانوں کی کتابوں کا مطالعہ کر کے" آثار الصنادید" کے اس تنقیدی اڈیشن کا دو سو صفحات پر مشتمل مقدمہ لکھا۔ اس مقدمے میں ماہرانہ انداز میں مسلم فنِ تعمیر کے آغاز اور ارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، ہندوستان کے قدیم فنِ تعمیر کا جائزہ لیا ہے اور پھر بتایا ہے کہ کس طرح اِن دو مختلف اندازِ تعمیر کی آمیزش سے ایک نیا فنِ تعمیر وجود میں آیا۔ یہ تمام تفصیلات بیان کرنے کے بعد انجم صاحب نے دلّی کے اہم آثارِ قدیمہ کا ماہرانہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔

میری معلومات کے مطابق آج سے دو سال قبل تک انجم صاحب نے فنِ تعمیر پر ایک سطر بھی نہیں لکھی تھی۔ لیکن" آثار الصنادید" کے زیرِ نظر تنقیدی اڈیشن کے مقدمے کو پڑھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ اس شخص کی تحریر ہے۔ جس نے پہلی بار اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں اس لیے پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ" آثار الصنادید" کا یہ مقدمہ مسلم اور ہندوستانی فنِ تعمیر پر اردو میں پہلی مستند تحریر ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ انجم صاحب نہ صرف متنی تنقید کے جدید ترین اصول وضوابط کے ماہر ہیں بلکہ انھوں نے" غالب کے خطوط" کی شکل میں عملی متنی تنقید کا بہترین نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ انجم صاحب

نے "آثار الصنادید" کو متنی تنقید کے جدید ترین اصولوں کے مطابق مرتب کیا ہے۔ انھوں نے تقریباً ساڑھے تین سو اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں کی مدد سے جو حواشی لکھے ہیں وہ خاصے کی چیز ہیں۔ پہلی جلد میں مقدمہ اور "آثار الصنادید" کا عمارتوں سے متعلق متن ہے۔ دوسری جلد میں عمارتوں کے وہ خاکے اور کتبے ہیں جو سرسید نے پہلے اڈیشن میں شامل کیے تھے لیکن دوسرے اڈیشن کو مختصر کرنے کے خیال سے نکال دیے۔ چوں کہ سرسید کے بنوائے ہوئے عمارتوں کے یہ خاکے اور کتبے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اس لیے انھیں دوسری جلد میں شامل کیا گیا ہے۔

انجم صاحب کو فوٹوگرافی کا بہت شوق ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ ایک ماہر فوٹوگرافر ہیں۔ ان کے پاس کئی قیمتی کیمرے ہیں۔ آثار قدیمہ پر کام کے دوران ان کا یہ شوق بہت کام آیا۔ انھوں نے بڑی تعداد میں دلّی کے آثارِ قدیمہ کی تصویریں کھینچی ہیں۔ ان کی کھینچی ہوئی بہت سی تصویریں ان کی دو کتابوں دلّی کی درگاہ شاہ مرداں" اور" دلّی کے آثار قدیمہ" میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے ٹائٹل کی خوب صورت تصویریں بھی انھیں کی کھینچی ہوئی ہیں۔ "آثار الصنادید" کی دوسری جلد میں انھیں کی لی ہوئی ستر اسّی تصویریں شامل ہیں۔ ان تصویروں کی اہمیت یہ ہے کہ ان سے ہمیں آثارِ قدیمہ کی موجودہ حالت کا پتا چلتا ہے۔ ساٹھ ستر سال بعد ان تصویروں کی غیر معمولی تاریخی اہمیت ہوگی اور یہ تصویریں حوالے کے طور پر استعمال کی جائیں گی۔

دلی میں بڑھتی ہوئی آبادی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بہت سے آثار قدیمہ کو منہدم کرنا پڑا اور جو باقی ہیں ان میں سے بیشتر نئی کالونیوں میں اس طرح چھپ گئے ہیں کہ اب انھیں تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ انجم صاحب گلے میں کیمرے ڈالے مئی اور جون کی تپتی ہوئی گرمی میں ان عمارتوں کی تلاش میں گھومتے پھرے ہیں۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ بعض عمارتیں تو کئی کئی دن کی تلاش کے بعد انھیں ملی ہیں۔ انجم صاحب نے اس سلسلے میں ہماری مشکل اس طرح حل کر دی کہ دوسری جلد کے حواشی میں ایسی عمارتوں کے مکمل نئے پتے درج کر دیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک بڑا کام یہ کیا ہے کہ اردو، فارسی اور انگریزی کی جن کتابوں میں دلّی کے آثار قدیمہ کا ذکر آیا ہے، ان کے حوالے صفحات کے ساتھ درج کر دیے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اس موضوع پر آئندہ تحقیق کرنے والوں کا کام بہت آسان کر دیا ہے۔ اگر کوئی ماہر آثار قدیمہ قطب مینار یا مسجد قوت الاسلام یا کسی ایسے آثار قدیمہ پر کام کرنا چاہتا ہے جس کا ذکر "آثار الصنادید" میں ہے تو اسے اردو، فارسی اور انگریزی کی ببلیوگرافی تیار صورت میں مل جائے گی۔

سرسید نے "آثار الصنادید" کے پہلے اڈیشن میں شاہجہاں آباد کے لوگوں کا بیان" کے عنوان سے اپنے عہد کے دلّی کے صوفیائے کرام، علمائے کرام، شاعر، خوش نویس اور اربابِ موسیقی کا ذکر کیا تھا۔ لیکن دوسرے اڈیشن میں اختصار کے نقطۂ نظر سے یہ باب نکال دیا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل کی دہلی کی تہذیبی، سماجی اور ادبی زندگی کو سمجھنے کے لیے یہ باب بہت اہم ہے۔ زیر نظر اڈیشن کی تیسری جلد میں اس باب کو شامل کیا گیا ہے اور حواشی میں انجم صاحب نے دلّی کے اِن مشاہیر کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ ان اردو اور فارسی کتابوں کے صفحات کے ساتھ حوالے دیے ہیں جن میں ان حضرات کا ذکر ہے۔

اسلم پرویز

آثار الصنادید مرتبہ خلیق انجم

محترمی و مکرمی، سلام و سپاس

آپ کا بے حد گراں قدر عطیہ آثار الصنادید' تین جلدوں میں، ستائش خیز اور حیرت افزا ہوا۔ اپنی گوناگوں اور سخت گیر اور عرق ریز مصروفیتوں کے باوجود آپ نے اس مہتم بالشان کام کے لیے وقت نکال لیا آپ کی ہمت مردانہ پر ہزار آفریں۔ کتابت اور طباعت اور تصویریں اور نقشے کتاب کی اہمیت کا دم بھر رہے ہیں۔ یہاں تک تو مبارکباد کا عمل دخل تھا۔

اب سپاس گزاری کا موڑ آتا ہے۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ کو اپنی بیش بہا تصنیف سے نوازا۔ آپ کے ذہن اور قلم سرعت رفتار کے رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں۔

آپ جب اتنا کچھ کر سکتے ہیں تو اب کسی کے پاس کوتاہ قلمی یا تنگ نگاری کے لیے مصروفیت کا عذر باقی نہیں رہا۔ ایسی مثال قائم کرنا کیا روا ہے جو بہتوں کی طمانیت برہم کردے اور بے شمار افراد کو اپنی نظر میں گرادے ؟ اس ا ہم سوال پر بطور تبریک و تشکر کو ختم کرتا ہوں۔

والسلام

(ڈاکٹر خلیق انجم کے نام جناب سید حامد کا خط)

"آثار الصنادید" دلی کی تاریخ، تہذیب، ثقافت اور قدیم عمارات سے متعلق سید احمد خاں کی اہم تالیف ہے۔ صنادید دراصل جمع ہے لفظ صندید کی جس کے معنی ہیں سردار، بہادر، جواں مرد۔ گویا اس کتاب میں دلی کی ان عظیم شخصیتوں کی بازیافت کی کوشش کی گئی ہے جو دلی کی شاندار تاریخ کا حصہ رہی ہے اور اس بازیافت کی کوشش ان عظیم شخصیتوں کے چھوڑے ہوئے ان آثار یا نشانات کے وسیلے سے کی گئی ہے جن میں ان کی تہذیب، ثقافت اور ان کی بنائی ہوئی عمارات شامل ہیں۔ ماضی کے دوسرے نشانات کے مقابلے میں عمارات کی حیثیت دیرپا، واضح اور روشن نشانات کی ہے۔ شاید اسی لیے "آثار الصنادید" کے مولف سید احمد خاں نے بھی اپنی کتاب میں دلی کے آثار قدیمہ پر خصوصی توجہ دی ہے۔ "آثار الصنادید" کے دو اڈیشن سید احمد خاں کی زندگی ہی میں شایع ہو چکے تھے۔ پہلا اڈیشن ۱۸۴۷ء میں مطبع سید الاخبار سے اور دوسرا ۱۸۵۴ء میں مطبع سلطانی سے شایع ہوا تھا۔ سید احمد خاں نے خود ہی پہلے اڈیشن کے مقابلے میں دوسرے اڈیشن میں خاصی ترمیم اور تخفیف کر دی تھی اور اس کے ساتھ ہی کچھ اضافے بھی کیے تھے۔ پہلا اڈیشن چھے سو صفحات پر مشتمل تھا جب کہ دوسرے اڈیشن کی ضخامت صرف دو سو چوراسی صفحات رہ گئی۔ پہلے اڈیشن کا چوتھا باب جو دو سو چھیالیس صفحات پر مشتمل تھا اور جس میں دلی کی مختلف آبادیوں کا بیان تھا دوسرے اڈیشن سے خارج کر دیا گیا لیکن دوسرے اڈیشن کے پہلے باب کے

طور پر ایک باب دلی کی عمل داریوں کے مختصر حالات میں شامل کر دیا گیا۔ ان دو اڈیشنوں کے بعد "آثار الصنادید" چار بار اور شایع ہوئی ۱۸۷۶ء میں مطبع نول کشور سے ۱۹۰۴ء میں نامی پریس کانپور سے ۱۹۶۵ء میں سینٹرل بک ڈپو دلی سے ۱۹۶۶ء میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی سے۔ لیکن ان چاروں اڈیشنوں میں تدوین متن کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اس لیے ان کی حیثیت صرف ری پرنٹ کی سی ہے۔ اس اعتبار سے "آثار الصنادید" کا موجودہ اڈیشن جسے اردو اکادمی دلی نے تین جلدوں میں شائع کیا ہے اور جس کے مرتب ڈاکٹر خلیق انجم ہیں خصوصی توجہ کے لائق ہے۔ خلیق انجم نہ صرف یہ کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری اور اردو تحریک کے ایک سرگرم رکن ہیں بلکہ وہ اردو تحقیق کے میدان میں بھی ایک معتبر حیثیت کے مالک ہیں اس کے ساتھ ہی وہ ایک متنی نقاد بھی ہیں۔ "آثار الصنادید" کو ترتیب دے کر انھوں نے تدوین متن کا ایک ایسا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے جس کی مثالیں ہمارے ہاں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مرتب کردہ احمد علی خاں یکتا کا فارسی تذکرہ "دستور الفصاحت"، رشید حسن خاں کا مرتب کیا ہوا "فسانۂ عجائب" اور خود خلیق انجم کے چار جلدوں میں (جن کی چوتھی جلد طباعت کے مراحل میں ہے) مرتب کیے ہوئے خطوطِ غالب اردو میں تدوین متن کی بہترین مثالیں ہیں "آثار الصنادید" کی زیرِ نظر اشاعت اسی سلسلے کا ایک اور سنگِ میل ہے۔

سید احمد خاں جیسی تاریخی شخصیت کے ساتھ خلیق انجم کا موازنہ کرنا یہاں ہمارا مقصد نہیں لیکن اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ بہت سی باتیں دونوں میں مشترک ہیں۔ خلیق انجم کا دائرہ کار انتہائی وسیع ہے وہ ادبی، سماجی، انتظامی اور سیاسی بھی، غرض تمام امور میں دلچسپی رکھتے ہیں اور سب میں یکساں طور پر مصروف رہتے ہیں۔ ان کے ادبی مشاغل بھی گوناگوں قسم کے ہیں انھوں نے تراجم بھی کیے ہیں ادبی شخصیتوں پر سوانحی مضامین یا خاکے بھی لکھے ہیں تنقیدی مقالات لکھے ہیں ہفت روزہ "ہماری زبان" اور دو ماہی "اردو ادب" کی ادارت بھی ان کے ذمے ہے لیکن ان کا اصل میدان تحقیق ہے "مرزا محمد رفیع سودا" اور "غالب اور شاہان تیموریہ" جیسی کتابوں کے ذریعے وہ اردو دنیا سے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کی داد حاصل کر چکے ہیں۔ متنی تنقید کا شعبہ بھی ایک اعتبار سے تحقیق سے ہی علاقہ رکھتا ہے۔ کچھ عرصے پہلے خلیق انجم کی ایک کتاب "متنی تنقید" شایع ہوئی تھی۔ یہ اس موضوع پر اردو میں پہلی کتاب تھی۔ اسی کتاب کی تالیف کے ساتھ شاید خلیق انجم نے اپنی اس صلاحیت کو بھی دریافت کیا کہ وہ تدوین متن جیسا کام کرنے کے اہل ہیں۔ چناں چہ "متنی تنقید" کی اشاعت کے بعد سے ہی "خطوطِ غالب" کی باقاعدہ ترتیب کی طرف ان کی توجہ مبذول ہو گئی جس کا آغاز ایک طرح سے "غالب کی نادر تحریریں" کی اشاعت کے ساتھ پہلے ہی ہو چکا ہے اسی سلسلے کی دوسری کڑی اب ہمارے سامنے "آثار الصنادید" کی شکل میں ہے۔ سید احمد خاں نے "آثار الصنادید" کی تالیف کے سلسلے میں دلی کے دشت و دیار کی بہت خاک چھانی تھی۔ یہی کام "آثار الصنادید" کی ترتیبِ نو کے دوران اپنا کیمرہ گلے میں لٹکا کر خلیق انجم نے بھی کیا ہے۔ سید احمد خاں کے زمانے میں دلی میں سڑکوں کا جال تو اس طرح پھیلا ہوا نہیں تھا کوئی بھی تاریخی عمارت میلوں دور ہی سے اپنے وجود کا پتا ضرور دے دیا کرتی تھی۔ آج کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی دلی میں یہ تمام آثار قدیمہ کنکریٹ کی فلک بوس عمارتوں کے جنگل میں کھو سے گئے ہیں دلی کے نئے جغرافیے میں اب ان آثار قدیمہ کے نشان اور پتے بھی بدل گئے ہیں۔ "آثار الصنادید" کی ترتیب کا کام ہاتھ میں لینے کے بعد سید احمد خاں کے متن کو سامنے رکھ کر جو بنیادی نکتہ اس کتاب کے مرتب خلیق انجم کی سمجھ میں آیا اور جس کی طرف اشارہ اس گفتگو کے آغاز میں بھی کیا جا چکا ہے وہ یہی تھا کہ صنادید کے آثار میں شاید سب سے زیادہ اہمیت انھی آثار کو حاصل ہے جو قدیم تاریخی عمارتوں یعنی آثار قدیمہ کی شکل میں ہمارے سامنے ہوتے ہیں اس لیے کہ یہی صنادید کے سب سے ٹھوس اور مستند نشانات ہیں اور پھر ان قدیم عمارات میں ان عمارتوں کے اپنے وجود کے ساتھ کہیں کہیں

پتھروں پر کندہ ایسی عبارتیں بھی موجود ہیں جو تاریخی دستاویزوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور جو مخطوطات کے مقابلے میں محفوظ تر مستند ترین اور دیرپا ہوتی ہیں۔ اسی لیے آثار الصنادید کی ترتیب کے آغاز ہی میں خلیق انجم کی چھٹی حس نے انھیں آثارِ قدیمہ میں غیر معمولی دل چسپی لینے پر مائل کیا یہاں تک کہ آثار الصنادید کی اشاعت سے قبل ہی آثار قدیمہ کے موضوع پر ان کی دو کتابیں دلی کے آثار قدیمہ اور دلی کی درگاہ شاہِ مرداں، منظر عام پر آگئیں۔ ان دو کتابوں کے ذریعے انھوں نے گویا یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ تحقیق اور تدوینِ متن جیسے دقیق کاموں کے ساتھ ساتھ آثار قدیمہ جیسے مشکل اور پیچیدہ موضوع پر بھی دست رس رکھتے ہیں۔ چناں چہ جس طرح سید احمد خاں نے پوری دلی کی خاک چھان کر ان آثار قدیمہ کو دریافت کیا تھا کم و بیش اسی طرح ان آثار قدیمہ کی دریافت نو کے سلسلے میں خلیق انجم نے بھی کچھ کم خاک نہیں چھانی خاص طور پر یوں بھی کہ یہ آثار قدیمہ اب میلوں دور سے اپنے وجود کا پتا نہیں دیتے۔

"آثار الصنادید کی تینوں جلدوں کو سامنے رکھیے تو اس کام کے دو روشن پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک "آثار الصنادید" کا متن جس کی تدوین "آثار الصنادید" کے پہلے اور دوسرے اڈیشن کی بنیاد پر کی گئی ہے اور تقریباً چار سو اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں کی مدد سے متن کے متعلقات سے بحث کرتے ہوئے مبسوط اور مفصل حواشی اور دو سو صفحات کا جامع مقدمہ لکھا گیا ہے اس اڈیشن کا دوسرا روشن پہلو یہ ہے کہ اس میں آثار قدیمہ کو وہی خصوصی اہمیت دی گئی ہے جو خود سید احمد خاں نے دی تھی۔ اسی سلسلے کے حواشی اور تعلیقات کیمرے سے لی گئی اُن آثار قدیمہ کی وہ تصاویر ہیں جن میں یہ آثار قدیمہ جو ہو بہو اور مستند شکل میں کتاب کے صفحات میں محفوظ ہوگئے ہیں۔ یہ صورتِ حال آثار الصنادید کے پہلے اڈیشن میں شامل آثار قدیمہ کی قلمی شکلوں کے مقابلے میں زیادہ مستند اور بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ سائنٹیفک بھی ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی مرتبہ "آثار الصنادید" کے موجودہ اڈیشن میں پہلے اڈیشن کے پہلے باب کی شمولیت جو سید احمد خاں کے دوسرے اڈیشن میں نہیں تھا، اور دوسرے اڈیشن کے آخری باب کی برقراری جو سید احمد خاں کے پہلے اڈیشن میں شامل نہیں تھا خلیق انجم کی ذاتی پسند یا ناپسند کے تحت نہیں بلکہ متنی تنقید کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

"آثار الصنادید کی موجودہ تین جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد بارہ سو چھے ہے ان میں "آثار الصنادید" کے متن لگ بھگ ساڑھے سو صفحات ہیں بقیہ ساڑھے چار سو صفحات میں کتاب کا مقدمہ، حواشی، اشاریہ اور کتابیات وغیرہ شامل ہیں۔ یہ کام کتاب کے مرتب ڈاکٹر خلیق انجم کے لیے اور کتاب کے ناشر اردو اکادمی دلی دونوں کے لیے مایۂ ناز ہے خلیق انجم نے "آثار الصنادید" دلی کے آثار قدیمہ" اور "دلی کی درگاہ شاہِ مرداں" جیسی کتابوں کے ذریعے دلی کے آثار قدیمہ سے متعلق اپنی جس دل چسپی اور مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی اگر وہ آگے چل کر دلی کی "نئی آثار الصنادید" لکھنے کا بیڑہ اٹھالیں۔

شمیم جہاں

کردار کا غازی

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی باغ و بہار اور جانِ محفل شخصیت سے تو میں بہت پہلے سے واقف تھی، لیکن ان کو بہت قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور برتنے کا موقع مجھے انجمن میں آنے کے بعد ہی ملا۔ وہ ایک جادوئی شخصیت کے مالک ہیں۔ میں نے انھیں ہر دن، ہر پل۔ موقع اور وقت کے مطابق ہر روپ اور ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ کبھی مفکر، کبھی ادیب کی حیثیت سے قلم کی نوک سے موتی بکھیرتے ہوئے، کبھی مقرر، اور مقرر بھی ایسا جو اپنی سادہ سحر بیانی سے بگڑے ہوئے مجمع کو پل بھر میں اپنی گرفت میں کر لے۔ کبھی اخبار (ہماری زبان) کی پیکنگ کرتے ہوتے۔ کبھی اسٹاف اور چپراسیوں کے ساتھ مزدوروں کی طرح کام کرتے ہوئے۔ نہ بڑی حیثیت کے لوگوں کے سامنے جھکتے ہوئے دیکھا ہے نہ کم حیثیت کے لوگوں پر رعب جماتے ہوئے بلکہ جب وہ کم حیثیت کے لوگوں سے انھیں کے لب و لہجے میں بات کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ وہ انھیں میں سے ایک ہیں۔ ان کے اس رویّہ سے اکثر انجان لوگوں کو اپنے بارے میں غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ اعلیٰ سوسائٹی کی محفلوں میں شریک اور عالمانہ گفتگو میں مصروف ہوتے ہیں تو انھیں پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ یہ وہی خلیق انجم ہیں۔ جنھیں کل جامع مسجد کے چوراہے پر بھائی خلّو سے انھیں کے لب و لہجے میں کرخنداری زبان میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ " ابے مان جا یار کیا کر دیا ہے۔"

بہت سے لوگ بڑی تہہ دار شخصیت اور غضب کی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایک وقت میں اپنی ایک ہی صلاحیت کو بروئے کار لانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ لیکن خلیق صاحب کمپیوٹر صفت انسان ہیں اور انھیں اپنی کئی صلاحیتوں کو بیک وقت استعمال کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ یعنی وہ کئی محاذ پر ایک ساتھ لڑ سکتے ہیں۔ دفتر میں کام کرتے ہوئے میں نے ان کا بغور جائزہ لیا ہے کہ وہ بغیر کسی تھکاوٹ اور چڑچڑاہٹ کے ایک ہی وقت میں دس کام کرتے ہیں۔ ایک طرف باہر سے آئے ہوئے مہمانوں سے ادب کے دقیق اور اہم نکتوں پر بحث کر رہے ہیں۔ دوسری طرف انجمن کے کارکنوں کو کام کے سلسلے میں ہدایات دے رہے ہیں۔ ایک ساتھ انگلش اور اردو کے خطوط ڈکٹیٹ کرا رہے ہیں۔ ڈاک بھی دیکھ رہے ہیں، فون پر بھی بات ہو رہی ہے۔ درمیان میں کوئی اہم کام یاد آگیا تو اٹھ کھڑے ہوئے اور غائب . . . . لیکن پانچ منٹ بعد پھر موجود۔

ڈاکٹر صاحب دائیں ہاتھ کی دوسری انگلی میں انگوٹھی پہنے رہتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ انگوٹھی دوسرے ہاتھ کی انگلی میں پہنچ جاتی ہے۔ دفتر آکر جب وہ اس انگوٹھی کو اسی ہاتھ کی انگلی میں ڈالتے ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہتی ہے تو اس وقت ڈاکٹر صاحب دفتر کے کسی صاحب کو بلا کر کسی اہم کام کی ہدایت دیتے ہیں۔ میں نے کئی بار

ان کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔ یہ آپ کیا کرتے ہیں تو انھوں نے بتایا کہ رات میں مجھے جب کوئی ایسا کام یاد آجاتا ہے جس کا ہونا بہت ضروری ہے تو میں ایسا کرتا ہوں تاکہ بھول نہ جاؤں۔"

ڈاکٹر صاحب کو میں نے کبھی آرام سے کھانا کھاتے ہوئے نہیں دیکھا، کام کے دوران ہی کھانا بھی کھا لیتے ہیں اگر اتفاق سے کھانے پر ان کے ساتھ کوئی موجود نہیں ہے (جو اکثر ہوتے ہیں) تو وہ کمرے میں یا کمرے سے باہر ٹہل ٹہل کر کھانا کھاتے ہیں اور اس دوران ان کا دھیان کھانے میں نہیں ہوتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اہم مسئلے پر سوچ رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں خلا میں گھورتی کسی گہری فکر میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے وہ کوئی گتھی سلجھا رہے ہوں۔

کسی نے (نام اس وقت مجھے یاد نہیں) نپولین کے بارے میں کہا تھا کہ اس کی کامیابی اور ترقی کا راز یہ تھا کہ اسے اپنی نیند پر قابو تھا۔ شاید یہ سچ ہے کیوں کہ نیند کا گھوڑا اتنا سرکش ہوتا ہے کہ اس پر قابو پانا واقعی مشکل ہے لیکن جس انسان کے بس میں اس کی نیند ہے، اس کی صحت، اعصاب، دل و دماغ اور وقت اس کے قبضے میں ہے اور جس کے قبضے میں یہ تمام دولت ہے وہ واقعی کامیاب ترین انسان ہے۔ یہ کمال بھی خلیق صاحب کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحب دوپہر کو سوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ دو منٹ کے لیے بھی سو سکتے ہیں اور دو گھنٹے کے لیے بھی۔ گویا وہ کوئی مشین ہیں جس میں سوئچ فٹ ہیں ضرورت کے مطابق وہ سوئچ آن، آف کر دیتے ہیں۔

میں نے انجمن جنوری ۱۹۷۵ء میں بک ڈپو انچارج کی حیثیت سے جوائن کی۔ انجمن میں میرا پہلا دن میرے لیے اہم ہے۔ اہم اس لیے کہ آج جو کچھ بھی ہوں اس کا بیج اسی دن بویا گیا تھا۔ دفتری کام کا تجربہ صفر، تعلیم نامکمل اور ڈاکٹر صاحب میرے عزیز۔ اس ناطے میں نے امید کی تھی کہ مجھے ہر وقت ان کی سپورٹ حاصل رہے گی اور کام چل جائے گا۔ لیکن انھوں نے مجھے وقتی اور جھوٹے سہارے دینے سے انکار کر دیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے میرے ہاتھ میں بغیر ہتھیار دیے مجھے جنگ میں کود پڑنے کا حکم دے دیا تھا۔ تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ انھوں نے مجھے وہ سہارا نہیں دیا تھا جو اس وقت تو اچھا لگتا لیکن مجھے سہاروں کا محتاج بنا دیتا۔ ڈاکٹر صاحب نے وہی کیا جو ایک مخلص انسان کرتا ہے۔ انھوں نے میری تعلیم جاری رکھنے میں مجھے ہر ممکن سہولت مہیا کی اور دفتر کا ہر کام سیکھنے پر مجبور کیا۔ چاہے وہ پبلیکیشن کا کام ہو، ٹائپ ہو یا اخبار کی ایڈیٹنگ اور پرنٹنگ۔ مجھے لکھنے کی ترغیب بھی ڈاکٹر صاحب سے ملی۔ انھوں نے مجھے وقتی سہارا نہ دے کر جو خود اعتمادی اور خود پر بھروسہ کرنا سکھایا ہے، میں ان کی احسان مند رہوں گی۔ یہ مضمون لکھتے ہوئے آج مجھے یہ موقع ملا ہے کہ چند لائنوں میں صدق دل سے ان مہربانیوں کا شکریہ ادا کروں جو اس وقت بہت ناگوار گزرتی تھیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ مجھے سروس کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پہلا موقع تھا کہ کوئی سروس جوائن کرنے جا رہی تھی، کچھ خوشی، کچھ اندیشے، کچھ خوف کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ ایک سلپ ہاتھ میں لیے ہوئے (جسے اپوائنٹمنٹ لیٹر کہنا چاہیے) جو انجمن کے جنرل سکریٹری کی طرف سے ملا۔ تصور میں تھا کہ باقاعدہ آفس ہوگا، کمرہ، میز، کرسی وغیرہ وغیرہ۔

خیر ہم دفتر میں داخل ہوئے اور داخل بھی کیا۔ داخل تو اس وقت ہوتے جب کوئی دروازہ ہوتا۔ یوں کہیے کہ جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں انجمن کا دفتر یعنی اردو گھر کی بلڈنگ تعمیر ہو رہی تھی لیکن تعمیر کا کام رکا ہوا تھا کیوں کہ انجمن کے پاس پیسے نہیں تھے اینٹ، پتھر اور ریت کے ڈھیر سے گزر کر عمارت کے اس ڈھانچے تک پہنچی، جہاں انجمن کا دفتر ٹین کے سائبان ڈال کر بنایا گیا تھا۔ سب سے پہلے میری ملاقات انجمن کے ایک کارکن اشتیاق حسین رضوی صاحب (مرحوم) سے ہوئی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ آفس میں لے گئے۔ آفس کا کمرہ اچھا خاصا کباڑ خانہ تھا۔ اونچی نیچی کچی زمین، سیلن، جگہ جگہ جالے لگے ہوئے۔ اڑا بھنا کر پانچ میزیں لگائی گئی تھیں، جن پر ہرے گہرے رنگ کے تاریخی قسم کے میز پوش پڑے

ہوئے تھے جگہ جگہ نیلی اور سرخ روشنائی کے داغ، ہر رنگ میل کی وجہ سے سیاہی مائل ہوگیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دھوبی کو کبھی ان کی خدمت کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ دروازے کے سامنے ایک میز کرسی پڑی تھی جس پر ایک صاحب بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔ اشتیاق صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا اور بتایا کہ آپ اسسٹنٹ سکریٹری ڈاکٹر ناظر حسین نقوی ہیں انھوں نے میرا بغور جائزہ لیا ان کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور تھوڑے توقف کے بعد فرمایا "جی ہاں ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے آپ کے بارے میں مجھے" سامنے والی میز پر دبلے پتلے سے ایک صاحب تشریف رکھتے تھے ان سے تعارف ہوا۔ انھوں نے اپنے چشمے کو تھوڑا اور نیچے کھسکا کر (جو پہلے ہی سے ناک پر رکھا ہوا تھا) چشمے کے اوپر سے جھانکا اور ایک لمبی ہوں سے مجھے خوش آمدید کہا معلوم ہوا کہ آپ لائبریرین صاحب ہیں۔ اور اردو کے مشہور ادیب ایم حبیب خاں صاحب ہیں۔ اور ہم آگے بڑھ گئے جہاں اسی قسم کے دوسرے لوگوں سے تعارف ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کو انجمن کا چارج سنبھالے ہوئے چند مہینے ہوئے تھے اور انھوں نے ابھی مکمل طور پر کالج نہیں چھوڑا تھا۔ کچھ وقت انھیں کالج میں دینا پڑتا تھا۔ تقریباً دو بجے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور انھوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا بہت چھوٹا سا سیلن بھرا کمرہ، چھوٹی سی میز، چند پرانی کرسیاں، ایک طرف کتابوں کا ڈھیر، کمرے کی چھت میں ایک بانس میں بلب لٹکا ہوا۔ یہ کمرہ تھا، ان جنرل سکریٹری صاحب کا جنھوں نے ایجوکیشن منسٹری سے ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے کو خیرباد کہہ کر انجمن کا سکریٹری ہونا پسند کیا تھا۔ چوں کہ میں نے ان کے وہ ٹھاٹھ بھی دیکھے تھے اس لیے کچھ عجیب سا لگا۔ اب سوچتی ہوں شاید اردو سے عشق ہی انھیں یہاں کھینچ کر لایا تھا۔ کچھ دیر بعد دیر انھوں نے کہا آئیے میں آپ کو کام بتا دوں، وہ ایک اور کھنڈر نما کمرے میں مجھے لے گئے جہاں کتابوں کا ڈھیر (کتابوں کا وہ اسٹاک جو علی گڑھ سے منتقل ہوا تھا) چھت تک لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ یہ بک ڈپو ہے اور آپ کو یہ کتابیں سارٹ آوٹ کرنی ہیں۔ اس کے بعد ہم عمارت سے نکل کر باہر آئے (جہاں آج کل خوب صورت لان ہے اور رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں) وہاں پرانے رسائل، اخبارات اور کتابوں کا ڈھیر تھا۔ دوسری طرف لائبریری کی الماریوں کی قطاریں تھیں میں وہیں بیٹھ کر کتابیں سارٹ آوٹ کرنے لگی۔ پانچ بجے دفتر سے لوگ جانے لگے لیکن ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں کام کر رہے تھے "ہماری زبان" کے دفتر میں اشتیاق صاحب اور عبداللہ کمال صاحب بھی بیٹھے تھے۔ میں بھی کام کرتی رہی۔ تقریباً آٹھ بجے ڈاکٹر صاحب باہر آئے۔ کہنے لگے بھئی میں تو یہاں نو دس بجے تک کام کرتا ہوں آپ چلی جایا کیجیے اور ایک پھر پردہ بیٹھ کر کتابیں چھانٹنے لگے اب یہ روز کا معمول تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنا کام ختم کرنے کے بعد میرے ساتھ کتابیں چھانٹ کر لگواتے۔ اشتیاق صاحب بھی ہمارے ساتھ کام میں شریک رہتے۔ اس طرح رفتہ رفتہ بک ڈپو کی شکل نکلنے لگی۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا کہ اردو گھر کا اس وقت صرف ڈھانچہ تھا۔ اسے عمارت کی شکل دینا جوئے شیر لانا تھا اس کی کئی وجوہات تھیں سب سے بڑی وجہ انجمن کے تعمیر کا کام جاری رکھنے کے لیے فنڈ نہیں تھا۔ آمدنی کے وسائل محدود ترین تھے۔ گورنمنٹ کی ایڈ برائے نام تھی، جس میں اب اس میں بہت تھوڑا اضافہ ہوا ہے۔ کتابوں کی فروخت سات ہزار روپے سالانہ۔ کل ملا کر چھ ہزار روپے ماہانہ آمدنی تھی۔ تین ہزار اسٹاف کی تنخواہوں پر صرف ہوتے تھے اور تین ہزار دیگر اخراجات پر۔ نہ گورنمنٹ سے تعمیر کا کام جاری رکھنے کے لیے کسی مدد کی توقع تھی۔ اور نہ ہی اردو والوں سے مالی یا اخلاقی تعاون کی امید۔ اعتراضات کی بھرمار سازشوں کے جال پھیلے ہوئے تھے۔ جو لوگ سکریٹری شپ کے امیدوار تھے ان کی کوشش تھی کہ اردو گھر کی عمارت مکمل نہ ہونے پائے سکریٹری کو ناکام کرنے کے لیے انھوں نے اخبارات کے ذریعے سکریٹری کے خلاف مہم چلا رکھی تھی۔ پٹنہ کے ایک اخبار میں چھپا "انجمن کے سکریٹری رنگے ہاتھوں اردو گھر اپنی بیوی کے نام کراتے ہوئے پکڑے گئے۔"

چوں کہ انجمن کا دفتر علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوا تھا اس لیے علی گڑھ سے آئے ہوئے اسٹاف کے لوگوں میں بھی ناہمگی اور بے چینی تھی۔ کچھ لوگوں کے عدم تعاون کی وجہ سے دفتر کے ماحول میں گھٹن سی پیدا ہو گئی تھی۔ اسٹاف کے بعض لوگ لوئر کلاس ملازمین کو سکریٹری کے خلاف بھڑکاتے اور ڈراتے رہتے تھے۔ جس سے ان میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا تھا اور خود کو سکریٹری کے ہاتھوں میں غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس سے ان بڑے بڑے حضرات کی پول کھل گئی جو سکریٹری کے خلاف سازش کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ یہ لوگ اسٹاف کے کچھ ایسے ممبروں کو آلۂ کار بنا کر جو انجمن کی منتقلی سے دل برداشتہ تھے اور نئے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پا رہے تھے، اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہوا یوں۔ ایک دن ایک چپراسی بہت پریشان سا میرے پاس آیا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہتے ہوئے ڈر رہا تھا میں نے اس سے کہا تم مجھے بتاؤ کیا بات ہے، ڈرو مت! میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گی وہ شاید فیصلہ کن موڈ میں تھا۔ اس نے کہا "بی بی ہم چپراسیوں کو نوکری سے نکال کر ڈاکٹر صاحب کو کیا ملے گا۔ ہم تو یہاں آ کر خود دکھی ہیں رات بھر یہ سوچ کر نیند نہیں آتی کہ پتا نہیں نوکری کب چلی جائے۔ آج پھر فلاں صاحب نے کہا کہ دو تین دن میں ڈاکٹر صاحب نوکری سے نکال دیں گے"۔ میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی اس لیے مجھے تعجب ہوا یہ سن کر۔ میں ڈاکٹر صاحب کے مزاج سے بھی واقف تھی کہ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ ڈاکٹر صاحب ایسا نہیں کریں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ اسے میری بات سے کچھ اطمینان ہوا تو اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس ان خطوط کی رجسٹری کی رسیدیں محفوظ ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے خلاف وزیر اعظم اور دوسرے لوگوں کو بھیجے گئے تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے ذکر کیا انھوں نے عادت کے مطابق لاپرواہی سے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ "جب کسی کو نکالنے کی بات ہی نہیں ہوئی تو کوئی کیوں کہے گا۔ اس کو غلط فہمی ہوئی چھوڑیے"۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بات مذاق میں اڑا دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت بڑی سازش تھی۔ جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

اندرونی اور بیرونی سازشیں، دشواریاں اور مشکلات کے باوجود (جو قدم قدم پر راہ میں مسدود کر رہی تھیں) ڈاکٹر صاحب ہمت نہیں ہارے کیوں کہ ان کے سامنے ایک مقصد تھا جس کے لیے انھوں نے چوبیس چوبیس گھنٹے کام کیا۔ گرمیوں کی تپتی دوپہر میں اسکوٹر پر بھوکے پیاسے مارے مارے پھرتے تھے۔ اتنی بھاگ دوڑ کرنے پر بھی ابھی تک ایسی کوئی پارٹی نہیں ملی تھی جو انجمن کو فائننس کرنے پر تیار ہو۔ ٹھیکیدار کے تقریباً ڈھائی لاکھ روپے قرض تھے۔ ٹھیکیدار کا آدمی جب پیسے مانگنے آتا تو ڈاکٹر صاحب چھپ جاتے اور وہ گالیاں دے کر واپس چلا جاتا۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہنستے ہوئے تین چار لوگوں کے ساتھ دفتر آئے معلوم ہوا کہ یہ کنارا بینک کے لوگ ہیں جو انجمن کو پانچ یا چھ لاکھ ایڈوانس (قسطوں میں) دینے پر تیار ہو گئے ہیں۔ اس دن ڈاکٹر صاحب کی خوشی کا کیا عالم تھا نہ پوچھیے۔ ڈاکٹر صاحب نے راتوں رات خود کاغذات تیار کیے۔ اگریمنٹ ہوا کہ آٹھ مہینے کے اندر فلور تیار کر کے دینا ہوگا۔ تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے رات دن کام کر کے چھ مہینے ہی میں گراؤنڈ فلور تیار کرا کے کنارا بینک کو قبضہ دے دیا۔

یہ ڈاکٹر صاحب کی کامیابی اور انجمن کی خوش حالی کی پہلی سیڑھی تھی۔ میں اس ضمن میں اس محترم ہستی کا ذکر ضرور کروں گی جن کی حوصلہ افزائی، محبت، خلوص اور شفقت نے ڈاکٹر صاحب کے حوصلے اور عزم کو پختگی اور توانائی بخشی۔ وہ ہستی جناب کرنل بشیر حسین زیدی کی ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔

اب یہ سلسلہ جاری ہو گیا ایک کے بعد ایک پارٹی ایڈوانس دیتی رہی اور فلور تیار ہوتے گئے اور ۱۹۷۷ء کا وہ دن بھی آ گیا جب سابق وزیر اعظم جناب مرار جی ڈیسائی نے اردو گھر کے خوبصورت لان میں اردو گھر کا افتتاح کیا۔ بڑی تعداد میں اردو والے جمع ہوئے۔ اس تقریب میں اردو دوستوں کے چہرے دیکھنے والے تھے، کوئی حیرت زدہ تھا، کسی کا منہ لٹکا ہوا تھا اور کوئی بے حد خوش۔

مفتی عتیق الرحمان صاحب مرحوم کا ریمارک مجھے آج بھی یاد ہے۔ مرحوم انجمن کی مجلس عام کے ممبر تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ ایک بزرگ اور اردو دوست کی حیثیت سے خلیق انجم صاحب کی پیٹھ تھپتھپاتے انھوں نے فرمایا تھا "اتنی بڑی عمارت بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ انجمن کے دفتر کے لیے دو تین کمرے کافی تھے یہ فضول خرچی ہے۔"

عمارت مکمل ہو گئی تھی لیکن مالی دشواریاں بدستور تھیں کیوں کہ بلڈنگ کی تعمیر کے لیے جو ایڈوانس رقم لی گئی تھی وہ مع سود کے کرائے میں کٹ رہی تھی۔ گورنمنٹ کی گرانٹ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے بہت کم تھی۔ البتہ بک ڈپو کی سیل اب سات ہزار سے بڑھ کر ستر ہزار روپے سالانہ ہو گئی تھی۔ علی گڑھ میں اسٹاف کی تنخواہیں بہت کم تھیں ڈاکٹر صاحب نے اس میں وقتاً فوقتاً خاطر خواہ اضافے کیے اور آج انجمن کے گریڈ تمام اردو اداروں سے زیادہ ہیں بلکہ وہ ہیں جو سینٹرل یونیورسٹی کے ملازمین کو دیے جاتے ہیں۔

آمدنی محدود اور اخراجات زیادہ تھے۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو کافی مشکلات پیش آتی تھیں لیکن ایسا دن کبھی نہیں آیا کہ مہینے کی پہلی تاریخ کو اسٹاف کو تنخواہ نہ ملی ہو۔ بارہا انھوں نے گھر سے رقم لاکر اسٹاف کو تنخواہیں تقسیم کیں لیکن خود انھوں نے دو سال تک انجمن سے تنخواہ نہیں لی۔ کسی ادارے کے لیے اتنی قربانی کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حالات بہتر ہونے پر انجمن نے ڈاکٹر صاحب کو وہ رقم ادا کر دی۔

کسی بھی ادارے کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کی قیادت کن ہاتھوں میں ہے۔ جہاں کسی ادارے کو کامیابی کی طرف لے جانے کے لیے عقل و فراست کی ضرورت ہوتی ہے وہاں جذبۂ ایثار، خلوص، ایمانداری، محنت، لگن اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کا تعاون حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

میری رائے میں اسٹاف۔ ادارے اور ادارے کے سربراہ دونوں کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے! اسٹاف کے ذہنی انتشار، ناراضگی اور بے چینی سے جہاں ادارے کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے وہاں نت نئی سازشیں بھی جنم لیتی ہیں۔ اسٹاف کا تعاون کامیابی اور عدم تعاون ناکامی کی طرف لے جاتا ہے۔ کامیاب حکمراں دماغوں پر نہیں دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔

یہ انجمن اور انجمن کے اسٹاف کی خوش نصیبی ہے کہ خلیق انجم صاحب انھیں کامیاب سربراہوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے درمیان کوئی دیوار نہیں رکھی اور انھیں اپنے اسٹاف کا بھرپور تعاون اور پیار حاصل ہے۔ ورنہ دفتروں میں باس نے قدم رکھا کہ سناٹا چھا گیا۔ چپراسی کمرے کے دروازے پر بلڈاگ کی طرح بیٹھا ہے۔ ہر آدمی ڈرا سہما با ادب با ملاحظہ ہوشیار اندر جاتا ہے۔ باس مارتا کم ہے ڈراتا زیادہ ہے۔ باس کو دیکھیے سروں میں گالیاں پڑ رہی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ نہ کوئی بلا دھڑکتا ہے نہ دروازے پر چپراسی ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کبھی دفتر نہیں آتے تو ہر شخص ان کی کمی محسوس کرتا ہے۔ یہ اسی لیے ہے کیوں کہ ڈاکٹر صاحب اپنے اسٹاف کے ساتھ اپنے بچوں جیسا سلوک کرتے ہیں کبھی کسی کو بلا لیا ورنہ ہر ایک کی میز پر خود ہی پہنچ جاتے ہیں۔ کسی پر کوئی مصیبت پڑی تو ہر ممکن مدد کرنے کو تیار۔ ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی ہے کہ ان کے اسٹاف کے لوگ ترقی کریں۔

یہی نہیں کہ وہ اسٹاف کے ساتھ ایسا کرتے ہیں بلکہ ان کا سلوک باہر کے لوگوں کے لیے بھی یہی ہے۔ انھوں نے نئے لکھنے والوں کی جتنی حوصلہ افزائی کی ہے کم لوگ ایسا کرتے ہیں۔ نہ جانے کتنے غریب طالب علم ایسے ہیں جن کی تعلیم کا خرچ ڈاکٹر صاحب برداشت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آج جس مقام پر ہیں وہاں تک پہنچنے میں ان کی محنت، ہمت اور حوصلے کے علاوہ نہ جانے کتنے لوگوں کی دعائیں شامل ہیں جن کی ڈاکٹر صاحب نے مدد کی ہے۔ ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا آپ کو بھی سنا دوں۔

مارچ ۱۹۸۵ء میں ایک ایکسیڈنٹ میں ڈاکٹر صاحب کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ علاج کے سلسلے میں وہ روزانہ کلیان ہوسپٹل جاتے تھے۔ وہاں ایک غریب لڑکا جس کی ٹانگ حادثے میں کٹ گئی تھی اور وہ مصنوعی ٹانگ لگوانا چاہتا تھا۔ لیکن

اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب اسے اپنے ساتھ دفتر لے آئے اور دفتر کے ایک صاحب کو پیسے دے کر اس کے ساتھ بھیج دیا کہ اس لڑکے کا کام کرا دیجیے۔

ایک اور صاحب رجو ادیب تھے، ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اردو گھر آتے اور ڈاکٹر صاحب ان کو خاموشی سے کچھ رقم دے دیتے۔ اگر اتفاق سے ڈاکٹر صاحب دفتر میں موجود نہیں ہوتے تو وہ شام تک ان کا انتظار کرتے تھے۔ اور نہ جانے کتنے لوگوں کو ڈاکٹر صاحب نے ملازمت دلائی۔

اس میں شک نہیں کہ انجمن کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ علامہ شبلی، مولوی عبدالحق اور آل احمد سرور جیسے لوگ اس کے سکریٹری رہ چکے ہیں۔ ان محترم حضرات نے ناساعد حالات میں انجمن کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس کے وقار کو بھی قائم رکھا۔ لیکن اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ خلیق انجم صاحب نے انجمن میں نئی روح پھونکی ہے۔ اس کی کارکردگی کو پہلے سے کہیں بہتر بنایا ہے۔ اور اس کو دوسری اچھی آرگنائزیشن سے آنکھ ملانے کی جرأت بخشی ہے۔ اس سلسلے میں جناب صباح الدین عبدالرحمن ہمیشہ خلیق صاحب کی تعریف کرتے تھے۔ انھوں نے اس موضوع پر "معارف" کے دو اداریے بھی لکھے۔

ایک بہت ہی گھسا پٹا پرانا قول ہے کہ ہر مرد کی ترقی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ قول چاہے کتنا پرانا کیوں نہ ہو لیکن اس کی سچائی اور معنویت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خلیق انجم صاحب کی کامیابی زندگی کے پیچھے بھی ایک خاتون کا ہاتھ ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کوئی سنسنی خیز انکشاف کرنے جا رہی ہوں۔ نہیں۔ وہ خاتون ان کی بیگم اور ہماری بھابی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی گھریلو زندگی بہت پُرسکون ہے۔ بیگم انجم کبھی ڈاکٹر صاحب کی راہ میں دیوار نہیں بنتیں۔ بلکہ ڈاکٹر صاحب نے ان کے اور بچوں کے حصے کا بہت سا وقت انجمن کو دیا ہے۔

انجمن آج ایک منظم اور مستحکم ادارہ ہے اور اس قابل ہے کہ اپنی ادبی اور دوسری سرگرمیاں بڑے پیمانے پر چلا سکے۔ اگر کبھی انجمن کی تاریخ لکھی گئی تو خلیق انجم صاحب کا دور اس تاریخ کا روشن ترین باب ہوگا۔

محمد ضیاء الدین انصاری

مرزا محمد رفیع سودا

(تنقید و تحقیق کی قابلِ تقلید مثال)

ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب "مرزا محمد رفیع سودا" اعلا ترین تحقیقی کارنامہ ہے۔ اردو تحقیق اور تنقید کی قابلِ تقلید مثال ہے
سودا اردو شاعری کے عظیم الشان ایوان کے ایک اہم ستون ہیں۔ طبیعت کی روانی، فنی مہارت اور کلام کی پختگی میں وہ
اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ انھوں نے جملہ اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی اور اشہبِ فکر کی جولانی دکھائی۔ اس میں کوئی شک
نہیں کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کی اردو شاعری کو سب سے زیادہ سودا نے ہی متاثر کیا۔ انھوں نے زبان و بیان کے
بہت سے تجربے کیے اور اردو شاعری کے مزاج کو زندہ دلی اور شگفتگی عطا کی۔ اسی سبب سے انھیں مسلم الثبوت
استاد کی حیثیت حاصل ہوئی۔ انھیں اپنی زندگی میں جتنی شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی وہ فقید المثال ہے اور اس کی
نظیر اردو شاعری کی تین سو سالہ تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دوسرے فنکاروں اور ادبی شخصیتوں کی طرح اپنی
شہرت کے قصرِ بلند تک پہنچنے کے لیے انھیں موت کے دروازے سے گزرنا نہیں پڑا۔ اپنی زندگی ہی میں وہ
عندلیبِ خوش نغمہ گلشن روزگار، گلِ سرسبد محافل اشعارِ یگانہ، انتخاب نسخہ صاحب کمالے، معنی یاب بے ہمتا، فخرِ
سخن گویاں، صیادِ غزالان سخن و سرآمد نکتہ سنجانِ این فن، شاہین زباں، استادِ استادانِ کامل وقادر، سرآمد شعرائے زماں
یکہ تازانِ میدان سخنوری، جیسے اعلیٰ خطابات سے نواز دیے گئے تھے۔ ان کی اس مقبولیت اور ہردلعزیزی کے باعث ان کے
دیوان کے بے شمار نسخے تیار ہوئے جن میں بہت سا الحاقی کلام بھی شامل ہوگیا۔

امتدادِ زمانہ سے سودا کی شہرت پر اثر پڑا اور رفتہ رفتہ اس میں کمی واقع ہوتی گئی۔ میر تقی میر، مرزا غالب اور علامہ
اقبال جیسے اساتذۂ فن اور نابغۂ روزگار شخصیات کی شہرت کے آگے سودا کی شہرت کسی حد تک ماند پڑ گئی۔ ہمارے
نقادوں اور سوانح نگاروں نے ان کو نظر انداز کر دیا اور ان پر اس طریقے سے کام نہیں ہوا جس انداز سے کہ دوسرے شعرا اور
اور اہم ادبی شخصیات پر کیا گیا۔ سودا پر جامع کام سب سے پہلے شیخ چاند نے کیا۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں سودا پر
تحقیقی کام کیا اور ان کے سوانح اور فن پر تحقیقی و تنقیدی مقالہ پیش کیا جسے بعد میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے ۱۹۳۶ء
میں کتابی شکل میں شائع کیا۔ اردو میں غالباً یہ پہلا مقالہ ہے جو جدید تکنیک اور سائنٹیفک اصول پر ترتیب دیا گیا
تھا۔ شیخ چاند مرحوم کی اِس کاوش کو اس زمانے میں بہت سراہا گیا تھا۔ اس کے ممتحن نواب صدر یار جنگ مولانا
حبیب الرحمن خاں شروانی نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا:

"پورے مقالے کے مطالعے کے بعد میری یہ پختہ رائے ہے کہ شیخ چاند صاحب نے مقالہ نگاری

فراہمی مواد، مطالعہ، بحث اور ترتیب و بیان مطالب میں پوری کاوش اور محنت کی ہے اور اس طرح پوری تیاری کے ساتھ مقالہ لکھا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ فاضل مقالہ نگار نے بڑے سلیقہ سے مقالہ ترتیب دیا تھا اور تمام دستیاب ماخذ سے بھرپور فائدہ اٹھا کر تحقیق کا حق ادا کیا تھا۔ اور تنقید اور تحقیق دونوں کے جوہر دکھائے تھے۔ اس کے تقریباً تین دہوں کے بعد اسی موضوع پر ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب "مرزا محمد رفیع سودا" منظر عام پر آئی۔ یہ بھی تحقیقی کام ہے۔ شیخ چاند اور ڈاکٹر خلیق انجم دونوں کا موضوع ایک ہے اور دونوں کے کام کی نوعیت بھی یکساں ہے۔ لیکن انداز بیان اور ترتیب کی نوعیت میں بین فرق ہے۔ اس مرحلہ پر ایک ظاہر بین یہ سوال کر سکتا ہے کہ جب اس موضوع پر جامع اور بسوط کام کیا جا چکا ہے پھر مزید کام کی کیا ضرورت اور کیا جواز۔ لیکن اس کا جواب بڑا سہل اور شافی ہے۔ یہ بات تو اب روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ تحقیق میں کوئی بات حتمی نہیں ہوتی، کوئی رائے حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی تحقیق کا کام ہر لمحہ جاری و ساری رہتا ہے یہ ایک عمل مسلسل ہے جس کا کہیں خاتمہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسا جادہ ہے جس پر ہر وقت تگ و دو اور پامردی جاری رہتی ہے۔ اس سے نئے نئے امکانات روشن ہوتے ہیں، ادب کا کارواں آگے بڑھتا ہے اور تلاش و تحقیق کو فروغ ملتا ہے۔

بیسویں صدی کے ربع اول تک سودا سے متعلق جتنا مواد دستیاب تھا، شیخ چاند نے اس سے حتی المقدور فائدہ اٹھایا۔ لیکن اس کے بعد جو مواد منظر عام پر آیا اور جو نئے ماخذ دریافت ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے ان سب سے استفادہ کیا اور نئی تحقیقات کی روشنی میں اپنی تحقیق کو زیادہ جامع اور زیادہ ہمہ گیر بنایا۔ اس کے علاوہ موجودہ دور میں اردو تنقید کے رویے میں بھی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اب یہ فن زیادہ سائنٹیفک، زیادہ منضبط اور زیادہ مربوط ہو گیا ہے اور متنی تنقید سے تو انقلاب عظیم رونما ہو گیا ہے۔ انجم صاحب کو متنی تنقید پر کامل عبور حاصل ہے۔ اس کا ثبوت ان کی تالیف "متنی تنقید" سے بھی ملتا ہے۔ انجم صاحب محض نظریاتی ناقد ہی نہیں، عملی تنقید نگار بھی اعلیٰ پایے کے ہیں۔ زیر نظر تالیف میں آپ نے متنی تنقید کے بھی اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ تحقیقی مقالہ "مرزا محمد رفیع سودا" کے عنوان سے ۱۹۶۶ء میں انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے شائع ہوا۔ یہ ۴۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ پورے مقالے کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں سوانح ہیں اور دوسرے حصے میں سودا کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں اصل موضوع کے پس منظر کے طور پر اٹھارہویں صدی کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے اندراجات کے اہم عنوانات پر نظر ڈالنے سے اس مقالہ کی جامعیت اور ہمہ گیری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

۱۔ سیاسی و سماجی حالات	۲۔ سوانح	۳۔ تنقید۔
۴۔ سودا کی غزل گوئی	۵۔ قصیدہ نگاری	۶۔ ہجو گوئی
۷۔ شہر آشوب	۸۔ مثنوی نگاری	۹۔ واسوخت
۱۰۔ رباعیات	۱۱۔ پہیلیاں	۱۲۔ سودا تذکرہ نگاروں اور نقادوں کی نظر میں
۱۳۔ سودا کی تصانیف	۱۴۔ سودا کا الحاقی کلام	۱۵۔ سودا کا غیر مطبوعہ کلام
۱۶۔ سودا کے شاگرد	۱۷۔ حاصل سخن	۱۸۔ اشعار سودا کا انگریزی ترجمہ

ان عنوانات کے تحت ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں جن کی تعداد ڈیڑھ سو سے متجاوز ہے۔ پورے موضوع کو ان

عنوانات کے تحت تقسیم کر کے جملہ مباحث کو بڑے سائنٹیفک طریقے پر پیش کیا گیا ہے۔

سوداؔ کے سوانح کے سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ ان کی تاریخ ولادت کا ہے۔ مختلف سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے ان کی ولادت کی مختلف تاریخیں بتائی ہیں۔ اس لیے حتمی طور پر ان کے سال ولادت کے تعین کا کام مشکل ہو گیا ہے۔ شیخ چاند اور ڈاکٹر خلیق انجم دونوں نے اس مسئلہ سے تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ دونوں نے دستیاب مآخذ کی مدد سے ان کے سال ولادت کا تعین کیا ہے لیکن یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ دونوں الگ الگ نتیجوں پر پہنچے ہیں۔ شیخ چاند نے محمد حسین آزاد، قایم چاندپوری اور میر حسن کے فراہم کردہ معلومات کا تجزیہ کر کے ۱۱۰۶ھ متعین کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے قایم چاندپوری کی رائے کو راجح مانا ہے۔ انجم صاحب نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ انھوں نے آب حیات، مخزن نکات، کلیات سوداؔ مرتبہ عبدالباری آسی، گل رعنا مؤلفہ حکیم سید عبدالحئی، خوش معرکہ زیبا، سودا مؤلفہ شیخ چاند، دتی کا دبستان شاعری، مضامین قاضی عبدالودود اور باغ معانی مؤلفہ نقش علی، جیسے بنیادی اور اہم مآخذ کی ورق گردانی کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سوداؔ ۱۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے:

> • نقش علی نے بقول قاضی عبدالودود مرزا کا ترجمہ ۱۱۹۴ھ کے لگ بھگ لکھا ہے جس سے مرزا کا سن ولادت ۱۱۱۸ھ نکلتا ہے۔ اس کی تصدیق میر حسن کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ مرزا ۱۱۸۵ھ میں فرخ آباد سے فیض آباد گئے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ مرزا آج کل نواب شجاع الدولہ بہادر کی سرکار میں وسیلۂ فن شاعری سے سرفراز ہیں۔ نواب شجاع الدولہ کا انتقال آخر ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ میر حسن نے مرزا کا ترجمہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان لکھا ہے جب مرزا فیض آباد آئے تھے۔ میر حسن اکثر ان سے ملاقات کرتے تھے جس کا ذکر انھوں نے خود تذکرے میں کیا ہے۔
> اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مرزا کا ترجمہ لکھتے ہوئے انھوں نے مرزا سے ان کی عمر دریافت نہ کی ہو۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مرزا کا سن شریف ستر سال کو پہنچ گیا ہے۔ چونکہ یہ عبارت ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان لکھی گئی ہے اس لیے مرزا کا سن ولادت ۱۱۱۵ھ اور ۱۱۱۸ھ کے درمیان قرار پاتا ہے۔ اگر ہم ۱۱۱۸ھ تسلیم کریں تو نقش علی کے بیان کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس لیے ۱۱۱۸ھ ہی قرار دینا مناسب ہے۔" (ص ۱، ۲)

شیخ چاند اور ڈاکٹر خلیق انجم کی تحقیقوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا اور اسے حرف آخر تصور کرنا دشوار کام ہے خود خلیق انجم صاحب نے کوئی آخری بات نہیں کہی ہے۔ انھوں نے بہت ہی محتاط انداز اختیار کیا ہے اور صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ "۱۱۱۸ھ ہی قرار دینا مناسب ہے۔" اس سلسلہ میں حتمی طور پر اتنا تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس اہم مسئلہ پر انجم صاحب نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ شیخ چاند نے اس پر صرف نصف صفحے میں بحث کی ہے جب کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس موضوع پر پانچ صفحے صرف کیے ہیں۔

انجم صاحب نے سوداؔ کے مختلف ناموں سے بھی بحث کی ہے۔ شیخ چاند نے اس مسئلہ کو موضوع بحث نہیں بنایا۔ اردو تذکروں میں سوداؔ کا نام مختلف طریقوں پر ملتا ہے۔ کسی نے ان کا نام مرزا رفیع لکھا ہے، کسی نے مرزا رفیع الدین اور کسی نے مرزا محمد رفیع بتایا ہے۔ خود سوداؔ اپنا نام 'محمد رفیع' لکھا کرتے تھے۔ انجم صاحب نے ان سب پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اصلاً ان کا نام 'مرزا محمد رفیع' تھا۔ یہ بات اس لیے اور بھی زیادہ قرین قیاس ہے کہ ان کے والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا۔

شیخ چاند نے سودا کے تلمذ کے سلسلہ میں بھی کسی خاص تحقیق سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سودا نے صرف شیخ ظہور حاتم سے ہی مشورہ سخن کیا۔ اس کے برخلاف انجم صاحب نے تلاش و جستجو کر کے ان کے چار استادوں کے نام بتائے ہیں۔ اردو شعرا کے تذکروں سے انھوں نے شاہ حاتم کے علاوہ خان آرزو، سلمان قلی خاں وداد، اور نظام الدین احمد صانع کے اسما بھی تلاش کیے ہیں جن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ کسی نہ کسی مرحلہ میں سودا نے ان سے مشورۂ سخن کیا تھا۔ اس طرح خلیق انجم صاحب کی تالیف کے پہلے حصہ میں، جو سرتا سر تحقیق پر مبنی ہے۔ اس میں تفحص و تلاش اور تحقیق و جستجو کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ انجم صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی قول کو محض اس لیے نہیں تسلیم کر لیتے کہ وہ فلاں شخص کا قول ہے اور وہ چوں کہ ایک عظیم محقق ہے اس لیے اس کی رائے یقیناً درست ہوگی۔ وہ تحقیق کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور جو بات اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتی وہ اسے تسلیم نہیں کرتے اسی لیے ہم دیکھتے ہیں ہر مرحلہ پر انھوں نے مستند محققین اور صفِ اول کے ناقدین کی فراہم کردہ معلومات پر محاکمہ کیا ہے اور جس رائے نے ان کے متجسس ذہن اور ناقدانہ مزاج کو اپیل نہیں کیا۔ اس کو انھوں نے بلا تامل رد کر دیا ہے۔ انھوں نے محمد حسین آزاد سے اختلاف کیا، بابائے اردو مولوی عبدالحق کی رائے سے اختلاف کیا، انھوں نے حکیم سید عبدالحی، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جیسے مستند محققین کی بہت سی آرا کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا اور ان سے اختلاف کیا۔ حتیٰ کہ بہت سے معاملات میں وہ شیخ چاند کی تحقیقات سے متفق نہ ہو سکے۔ یہ کام انھوں نے ادبی دیانت داری سے کیا اور دلائل و براہین کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر واضح کیا۔

اساتذہ کے ساتھ انجم صاحب نے سودا کے شاگردوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور ان کے ۲۴ تلامذہ کے احوال بیان کیے ہیں۔ یہ حصہ کافی طویل ہے۔ اور کتاب کے ۱۰۰ صفحات کو محیط ہے۔ شیخ چاند نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ انجم صاحب نے یہاں بھی بڑی تلاش و تحقیق سے کام لیا ہے۔ ان کی تحقیق کا یہ حصہ بھی اہم اور جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ اس کو علیحدہ کتابی شکل میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں تمہید کے طور پر اردو میں استادی اور شاگردی کی روایت کی افادیت، اہمیت اور معنویت پر بھی بھرپور تبصرہ کیا گیا ہے جس سے کتاب کی وقعت میں اضافہ ہوتا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ نقد و نظر پر مبنی ہے۔ اس میں سودا کے اردو اور فارسی کلام اور نثری تصانیف کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں ان کی غزل گوئی، قصیدہ نگاری، ہجو گوئی، مرثیہ نگاری، قطعات، رباعیات اور شہر آشوب وغیرہ سے علیحدہ علیحدہ بحث کی گئی ہے۔ سودا قصیدہ گو اور ہجو گو کی حیثیت سے اتنے زیادہ مشہور ہو گئے ہیں کہ دوسری اصناف سخن میں ان کی مہارت ماند پڑ گئی ہے حالاں کہ ان میں بھی انھوں نے اپنی مہارت اور قدرتِ کاملہ کے جوہر دکھائے ہیں۔ انجم صاحب نے ان سب سے جداگانہ بحث کی ہے اور ہر حیثیت سے ان کے مقام اور قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔

ایک کامیاب نقاد کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنی تنقید میں مکمل غیر جانبداری کا ثبوت دے۔ نہ کسی کی بے جا تعریف کرے اور نہ کسی کو غیر ضروری طور پر ہدفِ تنقید بنائے۔ نقد ایک مشکل فن ہے۔ اس کا ایک کنارا قصیدہ گوئی سے ملتا ہے اور دوسرا ہجو گوئی سے۔ تنقید اگر محض تعریف بن جائے تو نثری قصیدہ بن جاتی ہے اور اگر غیر ضروری نکتہ چینی کی جائے گی تو وہ تنقیص بن کر ہجو گوئی کی حدود میں داخل ہو جائے گی۔ اس لیے ناقد کا فرض ہے کہ وہ صراطِ مستقیم پر قایم رہے۔ وہ اپنے ممدوح کی بے جا تعریف کرنے سے گریز کرتے ہیں، نہ خواہ مخواہ کسی کی عیب جوئی کرتے ہیں۔ میانہ روی ان کا خاص وصف ہے۔ سودا کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے میانہ روی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ وہ سودا کو اردو کا عظیم ترین قصیدہ گو شاعر تو مانتے ہیں، لیکن انھیں بہترین غزل گو تسلیم نہیں کرتے۔

اُن کی قصیدہ نگاری کے بارے میں انجم صاحب کی رائے ہے کہ:

"سودا کا ادبی کارنامہ قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی ہے۔ جن میں داخلیت کی بجائے خارجیت کو دخل ہوتا ہے۔ ان سے قبل ہی یہ دونوں اصناف اردو میں رائج تھیں لیکن یہ صرف سودا تھے جنھوں نے ان کو باقاعدہ فن کی صورت دی اور فنی اعتبار سے ان اصناف کو انتہا پر پہنچا دیا۔ یہ بات بغیر کسی شک و شبہ کے کہی جا سکتی ہے کہ اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔" (ص ۱۶۵)

ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:

"سودا اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قصیدہ نگاری کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے انتہائی بلندی پر پہنچایا۔ سودا کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں صرف ذوق وہ شاعر ہیں جنھیں دوسرا بڑا قصیدہ گو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن قصائدِ ذوق میں وہ تنوع، نیرنگی، قدرتِ اظہار اور وہ پُرشور اندازِ بیان نہیں ہے جو اچھے قصیدے کے لیے لازم ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے سودا کو انفرادیت بخشی ہے۔ قصیدے کا اندازِ بیان دوسرے اصنافِ سخن سے مختلف ہوتا ہے۔ مضمون آفرینی، جوشِ بیان، پختگیٔ کلام، مشکل زمینیں، شکوہِ الفاظ، روانی و سلاست اور جدتِ ادا وغیرہ قصیدے کی خصوصیات ہیں۔ سودا کے قصاید میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ قصیدے کے لیے خارجیت بہت ضروری ہے۔ سودا کے عہد میں دلی کے تقریباً تمام شاعر دل کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ سودا پہلے شاعر ہیں جو اپنے اندر کی دنیا سے نکل کر باہر آئے ہیں۔" (ص ۲۴۳)

لیکن ایک غزل گو کی حیثیت سے وہ سودا کو یہ درجہ دینے کو تیار نہیں۔ ان کی غزل گوئی کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"سودا ایک عظیم شاعر تھے، لیکن عظیم غزل گو نہیں۔ اگر ان کی متاعِ فن غزل اور صرف غزل ہی ہوتی تو ان کا شمار اپنے دور کے دوسرے درجے کے شاعروں میں ہوتا ..... سودا کا مزاج اور ذہن غزل کو راس نہیں آ سکتا تھا۔ ان کی شوخ، چنچل اور طرارے بھرتی ہوئی ہمہ رنگ طبیعت اس دردمندی سوز و گداز اور برشتگی و خستگی کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی جو غزل کی خصوصیات ہیں۔ سودا کے ہاں جذبات کی وہ صداقت و معصومیت، خلوص، خود سپردگی اور دردمندی نہیں ہے جو لب و لہجہ میں نرمی اور گھلاوٹ اور اندازِ بیان میں سادگی دے کے تیکھا پن پیدا کر کے شعر کو تیر و نشتر بنا دیتی ہے۔ قدرت نے سودا کو حزن و ملال اور ان کے لطیف احساسات سے محروم رکھا تھا۔ اس لیے وہ زندگی کی ٹھوس حقیقت یعنی غم کی آتشِ سیال کو الفاظ کے نرم و نازک سانچوں میں ڈھالنے سے معذور رہے۔" (ص ۱۶۴-۱۶۵)

اس نازک مرحلہ پر بھی انجم صاحب نے بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے جانبداری اور بے جا تعریف سے اپنے دامن کو بچا لیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سودا نے اردو غزل کو بہت کچھ دیا۔ انھوں نے اس کے دامن کو زورِ بیان، خارجیت اور نشاط آمیز لب و لہجہ جیسی اہم صفات سے مالا مال کیا۔ انجم صاحب نے سودا کی اس صفت کا فراخدلی سے اعتراف بھی کیا ہے۔ ان ہی خصوصیات کی بنا پر وہ سودا کو ایک عظیم غزل گو شاعر بھی بتا سکتے

تھے۔ لیکن یہاں بھی انھوں نے اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور غزل گو کی حیثیت سے ان کا وہی مقام متعین کیا جس کے وہ صحیح معنیٰ میں مستحق تھے۔ یہی روش انھوں نے دوسری اصناف سخن پر بحث کرتے ہوئے اپنائی ہے۔

انجم صاحب نے کلیات سوداؔ کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے بھی بحث کی ہے۔ یہ بات پہلے ہی عرض کی جاچکی ہے کہ سوداؔ کی مقبولیت کے باعث ان کے دیوان کے بہت سے نسخے تیار ہوگئے تھے۔ پہلے قلمی نسخے لکھے گئے اور بعد میں ان کی بنیاد پر مطبوعہ نسخے منظر عام پر آئے۔ ان میں سے بیشتر نسخے غیر مستند طریقہ پر تیار ہوئے۔ اور ناشرین نے بھی غیر ذمہ داری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے غیر معتبر نسخے شائع کیے۔ ان بے شمار قلمی نسخوں میں صرف دو ایسے ہیں جن کو محققین اور ناقدین معتبر اور مستند مانتے ہیں۔ ان میں سے ایک مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (حبیب گنج کلکشن) میں محفوظ ہے۔ اور دوسرا انڈیا آفس لندن میں۔ یہ نسخہ رچرڈسن کے نام سے مشہور ہے انجم صاحب نے ان دونوں نسخوں کا تعارف کرایا ہے۔ ان کی خصوصیات واضح کی ہیں، دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور تقریباً تیس صفحات میں ان کے مندرجات کا اشاریہ ترتیب دیا ہے۔ ان قلمی نسخوں کے علاوہ چند اہم مطبوعہ نسخوں سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں مطبع مصطفائی دہلی (۱۲۷۲ھ) نول کشور کانپور (۱۹۱۶ء) نول کشور لکھنؤ (مرتبہ عبدالباری آسی۔ ۱۹۳۲ء) کے مطبوعہ نسخے شامل ہیں۔ ان تمام نسخوں کے مشمولات کا تقابلی مطالعہ کرکے سوداؔ کے الحاقی کلام کی نشاندہی کی ہے۔ یہ حصہ بھی انجم صاحب نے کافی محنت سے ترتیب دیا ہے۔

کتاب کا ایک اہم اور دلچسپ باب "سوداؔ تذکرہ نگاروں اور نقادوں کی نظر میں" کے عنوان سے ہے۔ اس میں ابتدا سے لے کر موجودہ عہد تک سوداؔ کے متعلق تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سب کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ ان میں سب سے پہلا تذکرہ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کا گلشن گفتار تالیف ۱۱۶۵ھ ہے ہے۔ جس میں سوداؔ کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بعد جتنے بھی تذکرے تالیف کیے گئے ان سب میں سوداؔ کے احوال بھی ملتے ہیں۔ تذکرہ نگاری کا یہ سلسلہ لالہ سری رام کے خمخانۂ جاوید اور مولوی محمد مبین کیفی چریاکوٹی کے جواہر سخن تک چلتا ہے۔ ان تمام تذکروں میں سوداؔ کے فن اور شخصیت سے متعلق بنیادی اور مفید معلومات ملتی ہیں۔ ان کے علاوہ ناقدین میں مولانا حالی، محمد یحییٰ تنہا، عبدالحق، رام بابو سکسینہ، پروفیسر رشید احمد صدیقی، سید عبداللہ، اور کلیم الدین وغیرہ نے اپنی تالیفات میں سوداؔ کی شاعری اور دیگر ادبی خدمات پر اظہار خیال کیا ہے۔ خلیق انجم صاحب نے ایسی تمام تحریروں کو یک جا کر دیا ہے۔ یہ بڑا مفید کام ہے۔ اس کے ذریعہ کم سے کم وقت میں معمولی محنت سے سوداؔ پر زیادہ سے زیادہ مواد دستیاب ہو جاتا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مرزا محمد رفیع سوداؔ کے سوانح اور انتقاد پر ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ تالیف تلاش و تحقیق اور صحیح سمت میں محنت و کاوش کا بہترین نمونہ ہے یہ مستند تحقیق اور معتبر تنقید کی عمدہ اور قابل تقلید مثال ہے۔ انھوں نے سوداؔ کی قادر الکلامی اور فنی مہارت کا جس حسین انداز سے جائزہ لیا ہے اور ان کے کلام پر جس غیر جانبداری بلند معیاری اور سائنٹیفک انداز میں محاکمہ کیا ہے اس سے سوداؔ کی قدر و قیمت اور عظمت کا احساس بڑھتا ہے اور یہی مؤلف کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

سید منظور احمد

اردو تحریک و تنظیم کا ایک منفرد و معتبر نام ڈاکٹر خلیق انجم

بابائے اردو نے مولانا الطاف حسین حالی پر جو مضمون لکھا ہے وہ ہماری یونیورسٹی میں داخل نصاب ہونے کی وجہ سے گزشتہ کئی برسوں سے پڑھتے پڑھاتے میرا پسندیدہ مضمون بن گیا ہے۔ اب اس کو پڑھتا ہوں تو غیر شعوری طور پر ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس مضمون میں عبدالحق صاحب نے مولانا حالی کی دو اہم خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک سادگی، دوسرا درد دل، خلیق صاحب میں بھی میں نے ان دونوں خوبیوں کو پایا اور متاثر ہوا خصوصیت کے ساتھ آخر الذکر خوبی ——— میں یہاں اُن کی خوبیوں کے تعلق سے کچھ قلمبند کروں گا۔ آپ کے تخلیقی و تحقیقی سفر کے تعلق سے کچھ نہیں لکھوں گا۔ اس لیے کہ اس پر ضرور دوسرے قلم کار لکھیں گے اور اس لیے بھی کہ آپ کی تمام تصانیف اور تالیفات رجو دو درجن سے زیادہ ہیں، پر لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ ویسے اتنا کہنے کی جسارت کروں گا کہ آپ کا تخلیقی سفر قابل قدر ہے اور قابل تقلید بھی۔ درس و تدریس کو خیر باد کہنے کے بعد نہ صرف تحریک و تنظیم سے اپنا رشتہ استوار کیا بلکہ تخلیقی و تحقیقی کام کو بھی برابر جاری رکھا۔ آپ کے تخلیقی کام کے مقدار، معیار اور رفتار کو دیکھتے ہوئے بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے بہت سے افراد کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان کی کتابوں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ پاکستان سے ان کی کتابوں کے کئی قانونی اور غیر قانونی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پچھلے سال ان کی مرتبہ خطوط غالبؔ کی تین جلدیں انجمن ترقی اردو، پاکستان سے شائع ہوئی ہیں۔

خلیق صاحب اسماً ہی نہیں جسماً بھی خلیق ہیں۔ ہلکا سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، موٹی ناک، کلین شیو، قوی الجثہ، خوش گفتار، روشن خیال، علم دوست، دوست پرور، بلند عزم، متحرک و فعال، مردم شناس، ہمہ وقت پاک صاف، دُھلے منجھے، کسی زمانے میں پکے نمازی تھے، (اب دونوں عید کی نمازیں عیدگاہ میں پابندی سے پڑھتے ہیں) یہ ہیں ڈاکٹر خلیق انجم جنھوں نے کبھی اپنے نام کے آگے دہلوی نہیں لکھا اور نہ ڈگری کے آگے علیگ لکھ کر علیگی ثابت کرنے کی کوشش کی۔

خلیق صاحب کی مرتب کردہ تمام کتابوں کا میں مطالعہ کر چکا ہوں' اس لیے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے جن مشاہیر کے فکر و فن کو لباس بقا عطا کیا ہے، اس سے آپ کی تخلیقی و تنقیدی بصیرت اور سلجھے ہوئے ذوق کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کی معلومات ان اہل قلم پر نہ ہوتیں تو اتنی اچھی اور ضخیم کتابوں کا منظر عام پر لانا دشوار نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ کتابوں کی طباعت و نفاست، ترتیب و تہذیب کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کام میں آپ ماہر ہیں۔ انجم صاحب کا یہ کام بھی لائق ستائش ہے کہ آپ نے نہ صرف اپنی مرتب کردہ تصانیف کے حسن کا خیال رکھا بلکہ انجمن کی شائع کردہ تمام مطبوعات کے حسن کو بھی دو بالا کیا۔ آج برصغیر میں انجمن کی مطبوعات ہر لحاظ سے مستند و معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ آپ کا ایک اور اہم تاریخی کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے ملک بھر کے اردو ناشروں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا اور ان کی ایک کل ہند

انجمن قائم کی۔

آپ کی ہمدردی کے تعلق سے ایک آنکھوں دیکھا واقعہ ملاحظہ کیجیے۔ دو تین سال قبل کرناٹک اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام شہر بنگلور میں مولانا آزاد پر ایک کل ہند سمینار منعقد ہوا تھا جس میں شرکت کے لیے خلیق صاحب، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر نجمہ ہیبت اللہ وغیرہ کو زحمت دی گئی تھی۔ خلیق صاحب سمینار سے ایک دن پہلے ہی بنگلور پہنچ چکے تھے آپ کے اعزاز میں ریاستی انجمن نے ایک جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ جلسے کے اختتام پر شام کے کھانے کے لیے شہر کے ایک مشہور ہوٹل گئے۔ ہوٹل کی خوبصورتی، پاکی صفائی نے متاثر کیا۔ کھانے کے دوران بیرے نے ایک چھوٹے سے لڑکے کو جو اسی ہوٹل میں ملازم تھا بڑی بے دردی سے ایک تھپڑ لگایا۔ خلیق صاحب اس منظر کی تاب نہ لا سکے۔ اور تلملا اٹھے۔ خلیق صاحب نے اس واقعہ سے جو خلش محسوس کی اور آپ کی طبیعت میں جو تغیر رونما ہوا، اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں ؎

اخفائے خلش دشوار بہت — تشریحِ خلش ممکن ہی نہیں
چپ رہنے میں دم گھٹتا ہے — کہتا ہوں تو دل بھر آتا ہے

حسنِ اتفاق سے سمینار کے تمام شرکا کو اسی ہوٹل میں ٹھہرانے کا اہتمام کیا گیا تھا جب بیرے سے آپ کی آنکھیں چار ہوئیں تو خلیق صاحب پھر بے قرار ہو گئے۔ آپ کی بے تابی کو دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ واقعہ کل کا نہیں بلکہ ابھی ابھی ہوا ہے۔ آپ نے واقعہ ظ۔ انصاری صاحب اور نجمہ صاحبہ سے کہا، بیرے سے پھر ایک بار مخاطب ہوئے اور کہا کہ جناب یہ لڑکے کے لکھنے پڑھنے، کھیلنے کودنے، ریڈیو اور ٹی وی دیکھنے کے دن ہیں۔ بدقسمتی سے وہ اس کم عمری میں ہوٹل کی ملازمت کر رہا ہے۔ آیندہ کبھی نہ مارنا۔ بیرا بھی بڑا شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ آپ نے اس لڑکے کو پاس بلایا، بڑے پیار و محبت سے باتیں کیں۔ کچھ رقم بھی دی، تو وہ لڑکا اتنا خوش ہو گیا، گویا اسے جنت مل گئی۔ نظام کلب کے رو برو جب ایک رئیس نے سائیس کو ہنٹر رسید کر دیے تو مولانا حالی نے بے تاب ہو کر کہا تھا "ہائے ظالم نے کیا کیا۔" کھانا بھی اچھی طرح نہیں کھایا اور قیلولہ بھی نصیب نہ ہوا، سائیس غالباً ہٹا کٹا ہوگا۔ مگر یہاں دبلا پتلا کمزور و کم سن لڑکا یہ واقعہ رات کا تھا اور خلیق صاحب نے مولانا حالی کی طرح جو درد و کرب کا اظہار کیا، اس سے ایسا محسوس ہوا کہ آپ نے رات بھر آرام نہیں کیا۔ میری حالیہ ملاقات آپ سے حیدرآباد میں ہوئی تھی، جہاں آپ کا قیام صدر انجمن محترم سید حامد صاحب کے ساتھ نظام کلب میں تھا۔ علیک سلیک کے بعد کافی دیر تک گفت و شنید ہوتی رہی۔ دورانِ گفتگو، آپ نے بتایا کہ آپ جب بھی حیدرآباد آتے ہیں تو آپ کا قیام نظام کلب میں ہوتا ہے۔ اس تاریخی مقام میں آپ سے مل کر مولانا حالی اور مولوی عبدالحق کی یاد تازہ ہو گئی۔

؏ کیا بتائیں ہم تمھیں اس گھر میں کون آباد تھا

جب میں پہلی بار دلی گیا تو خلیق صاحب سے ملاقات نہ کر سکا۔ اس وقت شہر میسور میں نہ انجمن کی شاخ تھی اور نہ میں انجمن کا معتمد اعزازی، انجمن کی رکنیت جب سے حاصل کی اسی دن سے گویا خلیق صاحب سے رشتہ جڑ گیا۔ اب جب بھی دلی کا سفر ہوتا ہے تو اولین فرصت میں آپ سے "اردو گھر" پر تفصیلی ملاقات کرتا ہوں۔ پہلی بار جب ملا، تو بڑے خوش ہوئے اور دیر تک ریاستی شاخ کے جمود اور میسور شاخ کی سرگرمیوں کے تعلق سے پوچھا۔ چپراسی سے کہا کہ آپ بڑی دور سے آئے ہیں فوراً چائے لاؤ۔ چپراسی نے دیر کر دی تو خود گئے اور چائے پلائی۔ آپ کی شخصیت ہر اعتبار سے مجھ سے بلند و برتر، میں انجمن کی شاخ کا سکریٹری اور آپ کل ہند انجمن کے جنرل سکریٹری۔ پہلی ملاقات میں ہی آپ کی سادگی اور شرافت سے متاثر ہوا۔ چلتے چلتے میں نے آپ کا وزیٹنگ کارڈ لیا جس پر نظر ڈالی تو آپ کی سادگی کا اظہار اس سے بھی ہوا۔ کارڈ پر آپ کا نام اور انجمن کا پتا درج تھا، نام کے ساتھ نہ ڈاکٹر اور نہ عہدے کا ذکر۔

سادگی اور دردِ دل کے ساتھ خلیق صاحب کی دو اور اہم باتوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ "آپ سچ کہتے ہیں" یہ آپ کا تکیہ کلام ہے۔ اگر آپ کے سامنے کوئی جھوٹ بھی کہے تو آپ اس وقت بھی کہیں گے "جی! آپ سچ کہتے ہیں" دوسری بات آپ کی خندہ پیشانی کی۔ چاہے آپ کے سامنے لاکھ شکوے شکایتیں کریں، تلخی سے کام لیں، اس وقت بھی وہ خندہ پیشانی سے ہی پیش آئیں گے۔ ایک کانفرنس میں مندوبین نے مرکزی انجمن پر عموماً اور جنرل سکریٹری پر خصوصاً شکایتوں کی بوچھار کر دی، جس میں بہت سی باتیں بے جا تھیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ انجمن کا اپنا پریس ہے۔ انجمن کے پاس کافی سرمایہ ہے وغیرہ۔ مگر آپ کی پیشانی پر بل تک نہ آئے۔ اور ان سب سوالات کے جوابات بھی خندہ پیشانی سے دیتے رہے اور سب کو قائل کر دیا۔

خلیق صاحب کے سامنے بڑے سے بڑا مشکل سے مشکل مسئلہ درپیش ہو، وہ کبھی بھی گھبراہٹ اور بے چینی کا اظہار نہیں کرتے۔ خاموشی اور یکسوئی سے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انجمن کی حالیہ کل ہند کانفرنس ۱۹۸۸ء میں دلی میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ہمارے ایک ساتھی کے سازو سامان کی چوری ہو گئی، جن کی لاگت تقریباً ۴۰۰۰ روپے ہوگی۔ میں نے اس کی اطلاع آپ کو دی، تو اس وقت بھی حسبِ معمول آپ کا چہرہ شگفتہ رہا اور خاموش رہے، ظاہر بات ہے کہ کانفرنس کی تمام ذمہ داریاں جو تقریباً آپ ہی کے ذمے تھیں چھوڑ کر تھانہ کہاں جاتے اور رپورٹ کرنے پر بھی مال کی بازیافت کی کیا توقع تھی؛ کانفرنس کے اختتام پر معلوم ہوا کہ آپ نے خاموشی سے اس کی تلافی یوں کر دی کہ کچھ رقم ہمارے دوست کی نذر کر دی۔

بدقسمتی سے آج ہمارے معاشرے کے ہر طبقے میں قول اور فعل کے تضاد کے جراثیم بری طرح سرایت کر گئے ہیں جس کا نقصان زندگی کے ہر شعبے پر ہو رہا ہے۔ خلیق صاحب میں میں نے قول و فعل کا تضاد کم ہی پایا۔ آج کل ہمارے دانشور اردو کے مقام و مرتبہ کے تعلق سے دھواں دھار تقریریں تو کرتے ہیں اور بڑے بڑے دعوے بھی، مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو بے حسی اور تساہل سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے ۹۰٪ دانشوروں کے بچے اردو زبان و ادب سے نابلد ہوتے ہیں۔ اگر سب نے اپنے اپنے بچوں کو اردو، پڑھانے کا انتظام کیا ہوتا تو آج صورتِ حال قدرے بہتر ہوتی۔ اس معاملے میں خلیق صاحب واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں اور ان کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے کہ انھوں نے اپنی گراں قدر مصروفیات کے باوجود اپنے بچوں کو نہ صرف اردو تعلیم سے آراستہ کیا بلکہ اپنے صاحبزادے کو اتنی اردو، سکھائی کہ اردو میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کر کے دلی اردو اکادمی سے پہلا انعام پایا۔ انجمن کے حالیہ کانفرنس میں شرکت کے لیے میں تین چار دن قبل دلی پہنچ گیا۔ "اردو گھر" پہنچا خلیق صاحب بڑے خوش ہوئے اور پہلے مندوب کو خوش آمدید کہا اور فرمایا آپ کو کانفرنس میں ایک اہم قرار داد پیش کرنی ہوگی۔ میں نے کہا ضرور، آپ نے خود قرارداد لکھی: "ان تمام افراد کا بائیکاٹ کیا جائے جن کے بچے اردو نہیں جانتے اور وہ اردو اداروں، انجمنوں اور اکادمیوں کے سربراہ بن بیٹھے ہیں"۔ میں نے آپ کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے آخری اجلاس میں قرارداد پیش کرنی چاہی تو بدقسمتی سے کئی مندوبین نے اس کی مخالفت کر دی۔ خلیق صاحب نے مجھے دوسری قرارداد دی جو گجرال کمیٹی رپورٹ کے نفاذ کے تعلق سے تھی۔ عجیب اتفاق کہ جب میں اس اہم قرارداد کو پیش کر رہا تھا محترم اندر کمار گجرال تشریف لائے ؎

خوابِ فردا کے ہیں مظہر آج کے یہ مشغلے
کل کی تیاری میں گویا آج ہیں یہ منہمک

خلیق صاحب نے اردو گھر کی تعمیر میں بڑی بڑی مشکلیں اور تکلیفیں اٹھائیں۔ مخالفوں کا سامنا کیا مگر آپ ان

سب کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے رہے اور اس عظیم منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ اردو گھر کی تکمیل سے انجمن کا وقار اور مرتبہ دوبالا ہوگیا اور انجمن خود کفیل ہوگئی۔ اردو داں طبقے میں اداروں کی تشکیل، تعمیر اور ترقی کا جذبہ تو کارفرما ہے ہی۔ ادارے قائم کرنے کے بعد اس کو صحت مند اور جمہوری طریقے اور ڈھنگ سے چلانے کا فن بہت کم افراد میں پایا جاتا ہے خلیق صاحب کے طریقے، سلیقے اور حسن انتظام پر قربان جایئے کہ اردو گھر ایسا بنایا سجایا اور سنوارا کہ دل سے دعا نکلتی ہے۔ ادھر آپ کے کمرے میں قدم رکھا، ادھر طبیعت باغ باغ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی وزیر کے کمرے میں آگئے ہیں۔ خلیق صاحب نے اپنے اطراف فرض شناس، فعال اور با اعتماد رفقاء جناب ایم حبیب خاں، محترمہ شمیم جہاں، جناب انیس احمد جناب شاہد خاں، جناب مظہر نقوی اور جناب بانکے بہاری کی ایک ایسی ٹیم تیار رکھی ہے، جو ہمیشہ ہنشاس بشاش، اپنے علمی ادبی و تنظیمی کاموں میں سرگرم رہتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب خلیق صاحب کے گھر کے افراد ہیں۔ اردو گھر میں ہر جگہ ان کی ذاتی توجہ اور دلچسپی سے صفائی اور نفاست کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اردو گھر کو آپ اپنے گھر سے زیادہ پاک صاف رکھا ہے یہاں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کار میں ہمدرد نگر سے آرہا تھا۔ ساتھ میں شمیم جہاں صاحبہ اور جناب اطہر فاروقی تھے، شب کے دس بج رہے تھے۔ راؤز ایونیو سے ہمارا گزر ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ "اردو گھر" کی دوسری منزل بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو تعجب ہوا۔ فوراً کار رکی، تمام دروازے بند تھے۔ معلوم ہوا کہ بجلی چلی گئی تھی اور چپراسی جلدی میں لائٹ بند کیے بغیر چلا گیا۔ خلیق صاحب نے شمیم جہاں اور اطہر فاروقی کو بھیجا اور تمام لائٹ بند کروائے۔

خلیق صاحب کو انجمن سے والہانہ محبت ہے۔ گزشتہ ۱۶ سالوں سے آپ جنرل سکریٹری کے فرائض بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ انجمن کو نہ صرف ترقی دی بلکہ چار چاند لگائے۔ اس کا اعتراف نہ کرنا صداقت اور حقیقت سے انحراف کے مترادف ہوگا۔ میں آپ کو دعا دینے سے قبل آپ کی والدہ ماجدہ کو دعا دیتا ہوں کہ انھوں نے کسمپرسی اور غریبی کے باوجود آپ کو بے پناہ صلاحیتوں اور خوبیوں کا مالک بنایا، آپ کی تعلیم وتربیت کے لیے دنیا کی کوئی مصیبت ایسی نہیں تھی جو مرحومہ نے نہ اٹھائی ہو، جس کا ذکر خلیق صاحب نے بطور خاص فخریہ انداز میں اپنے سوانحی خاکے میں کیا ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ وہ اپنی جنرل سکریٹری شپ کی سلور جوبلی منائیں اور انجمن اپنا صد سالہ جشن۔

قدم قدم پہ حوادث نے رہنمائی کی
رواں ہے جادۂ منزل پہ کاروانِ خیال

بشیر احمد

معمار اردو

ڈاکٹر خلیق انجم یعنی خلیق احمد خاں ۱۹۷۴ء سے انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ہیں اور یہ بھی ان کے کئی کارناموں میں سے ایک کارنامہ ہے۔ اس لیے بھی کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے معتمدوں کی فہرست میں آج تک کسی کم عمر ادیب کا نام شامل نہیں ہوا۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق سے لے کر معمارِ اردو ڈاکٹر خلیق انجم تک جگمگاتے ستاروں کی ایک کہکشاں ہے۔

مسلم حلقہ اثر والے اداروں کی سیاست، سیادت، سربراہی یا قیادت قیامت سے کم نہیں ہے۔ مگر خلیق صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) کے ۱۶ برسوں سے سربراہ ہیں اور ابھی تک خدا کا شکر ہے کہ دامن داغدار نہیں ہوا۔ بڑی کامیابی سے سب کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں ایسا نہیں کہ ان کے مخالفوں یا دوست نما دشمنوں کی تعداد کم ہے۔ اس لیے کہ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے اس لیے کہ حسد اور جلن کا مادہ انسان اور خاص طور پر معاصرین کی سرشت کا جز ہے۔ تبھی تو اسلام کی ہدایت ہے کہ خدا سے دعا مانگتے رہو کہ وہ تمہیں لوگوں کے حسد اور شر سے بچائے۔ اور خلیق صاحب تو ۱۶ برس سے کل ہند انجمن کے سربراہ ہیں جس کی ایک شاندار اور نمایاں تاریخ ہے اس لیے ان کے معاصرین کو بجا طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ حسد کریں۔

آزادی سے پہلے انجمن جیسے ادارے اور رؤسا و امرا کے عطیات پر زندہ رہتے تھے آزادی اور جمہوریت نے وہ سلسلہ ہی ختم کر دیا ہے اب تو ہر ادارے کو کاروباری نہج پر مستحکم ہونا ہوگا یا پھر فنا اس کا مقدر ہے۔

انجمن بھی موت کے گھاٹ اتر جاتی اگر خلیق انجم نے اس کی مالی پوزیشن مستحکم کرنے میں دن رات ایک نہ کر دیے ہوتے۔ اب اس کا اپنا منافع بخش کاروبار ہے۔ کرائے سے بھی آمدنی ہوتی ہے اور تھوڑا بہت سرکاری گرانٹ بھی ملتی ہے لیکن خدانخواستہ اگر گرانٹ بند ہو جائے تو بھی انجمن کے استحکام میں کمی نہیں آئے گی۔

یہ بھی خلیق صاحب کا ہی کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو کو ایک کشادہ وسیع اور کثیر منزلہ عمارت دی جس کو اردو گھر کہتے ہیں۔ حالاں کہ اسے اردو محل یا ایوانِ اردو کہنا چاہیے۔ مگر خاکساری اردو کے خمیر میں ہے۔

اس ایوانِ اردو کی تعمیراتی انجینیریوں اور دیگر معماروں سے نپٹنا ایسا کام ہے جس کا عام لوگوں کو اندازہ بھی نہیں ہو سکتا اور پھر اردو کا معاملہ۔ جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل کام ہے۔

لیکن اس تگ و دو کا انھیں صلہ کیا ملنا تھا البتہ دامن داغدار کرنے کی کوشش ضرور ہوئی لیکن خدا کا شکر دشمن ناکام رہے خلیق انجم اتفاق سے مسلمان ہیں اور ہم مسلمانوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ غیر مذہبی کاموں کے لیے چندہ دینے میں تو ہزار آنا کانی کرتے ہیں لیکن غبن کا الزام لگانے پر فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جب مدن موہن مالویہ ہندو یونیورسٹی کی تعمیر کے لیے روپیہ اکٹھا کر رہے تھے تو گاندھی جی سے لوگوں نے شکایت کی کہ مالویہ جی چندے کی رقم میں سے بہت بڑا حصہ خرد برد کر گئے ہیں۔ گاندھی جی نے کہا تم بھی ایک ایسی ہی یونیورسٹی بنا دو اور اس سے بھی بڑی رقم خرد برد کر لو۔

خلیق صاحب پر ان کے نام کا بھی اثر ہے۔ سرورِ کائنات حضرت محمد صلعم نے فرمایا ہے اچھے نام رکھا کرو ناموں کا اثر ہوتا ہے۔ خلیق صاحب غالباً اپنے نام کی رعایت سے بہت خلیق اور ملنسار ہیں۔ لیکن چوں کہ خان بھی ہیں اس لیے ایک زمانے میں منہ پھٹ اور اکھڑ بھی ہوا کرتے تھے لیکن یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا۔ جوان خون گرم ہوتا ہے اور خواہ مخواہ بھی چھیڑ چھاڑ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور دشمن بنانے میں مزہ آتا ہے اب تو عمر کی سہ پہر میں داخل ہو چکے ہیں اور مخالفوں کو بھی دوست بنانے کی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب اپنے بھی خوش ہیں اور بیگانے بھی راضی۔ خلیق صاحب کی پیدائش ۲۲ دسمبر ۱۹۳۵ء کو دلی میں ہوئی اسی رعایت سے وہ اپنے کو اہلِ زبان کہتے ہیں اور بیرونِ دلی کے اردو والوں کے بارے میں ان کا بھی یہی خیال ہے۔

"دلی نہیں دیکھی ہے زبان دان یہ کہاں ہیں"

خاص طور پر بہار والوں کے بارے میں وہ بڑے بے تکلف انداز میں کہتے ہیں آپ لوگوں نے لغت سے اردو سیکھی ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ بہار والوں کو لغت دیکھنے کی نہ ضرورت ہے نہ عادت خود میں نے ایم۔اے کرنے کے بعد لغت کی ضرورت محسوس کی سچی بات تو یہ ہے کہ جس نے بچپن میں اردو کا کلاسیکی ادب اور خاص طور پر داستانی ادب پڑھ لیا ہے اسے لغت کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ ضرور ہے کہ ہم لوگوں کی زبان پر مگدھی، اودھی بھوجپوری اور دیگر قبائلی زبانوں کا اثر ہے۔ اور ہماری اردو بھی دہلی کی اردو سے مختلف ہے اور غیر جانبداری سے دیکھیے تو دہلوی اردو سے زیادہ توانا، ثروت مند اور شیریں ہے کہ ہم لوگ "ڑ" اور "ڈھ" وغیرہ ثقیل الفاظ کا کم سے کم استعمال کرتے ہیں۔ اور "میں" کی غیر جمالیاتی آواز پر "ہم" کو ترجیح دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہماری اردو کا ارتقاء دہلوی اردو کے متوازی ہوا ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ قطعی ضروری نہیں کہ دہلی کی ہم پیروی کریں۔ جہاں کی اپنی نہ تو کوئی پرانی تاریخ ہے اور نہ ہی اپنا کوئی کلچر یا جغرافیہ۔

خلیق انجم جن کو کامریڈ راج بہادر گوڑ کبھی کبھی مذاق میں خلیق انجمن بھی کہتے رہیں منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے کہ ان کے والد ریلوے میں انجینئر تھے۔ مگر والد کا سایہ عاطفت آٹھ سال کی عمر میں ہی اٹھ گیا انھوں نے اپنی چار بہنوں کے ساتھ اپنی ماں کے شفیق آنچل کے سائے میں پرورش پائی۔ ان کی والدہ کو تعلیم سے بے حد دلچسپی تھی شاید اسی لیے انھوں نے ہر ممکن مصیبت برداشت کر کے تمام بھائی بہنوں کو ایم۔اے تک تعلیم دلائی۔

خلیق صاحب نے پی۔ایچ۔ڈی بھی کی ہے، لنگوسٹک اور لائبریری سائنس میں ڈپلومے بھی حاصل کیے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں لکچرر ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں وزارت تعلیمات (مرکزی سرکار) میں ڈائرکٹر ہوئے اور ۱۹۷۴ء میں انجمن کے سب سے کم عمر جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں مرکزی یونیورسٹی کے پروفیسر گریڈ میں ان کا تقرر کیا گیا ان کی ترقیوں اور عروج کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مگر حقیقت یہ ہے کہ قسمت کے ساتھ ساتھ زورِ بازو یا سخت اور جان توڑ محنت کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ وہ بچپن سے ہی مشقتوں کے عادی ہیں۔ وہ بچپن سے ہی محنت اور کام کی عزت کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کام کرنے میں ذلت نہیں ہے کام نہیں کرنے میں ذلت ہے۔

خلیق صاحب آل انڈیا ریڈیو میں دری یونٹ میں براڈ کاسٹر اور ٹرانسلیٹر بھی رہے۔ سیکو لرڈ کو کریں ادبی تبصرے

ہماری زبان" اردو ادب کے اڈیٹر بھی ابھی تک ۔ انھوں نے ۴۰ کتابیں مرتب کی ہیں چار کتابیں تصنیف کی ہیں اور دو کتابوں کے مترجم رہے ہیں۔ اتر پردیش سرکار کے علاوہ بہار، دہلی، مغربی بنگال اور اتر پردیش اکاڈمیوں نے انھیں ایوارڈ سے نوازا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان سے انھیں نیاز فتح پوری ایوارڈ کے علاوہ کئی اداروں سے اعزاز اور ایوارڈ مل چکے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک سب سے بڑا اعزاز تو یہی ہے کہ وہ ۱۶ برسوں سے انجمن کو خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔

میں نے خلیق انجم کے " ناکارکردی" کے خلاف زبردست مضمون لکھا جو غالباً دو قسطوں میں چھپا اور حسن نعیم اور شہباز حسین کی مداخلت پر اس کا سلسلہ روک دیا گیا۔ اس وقت تک میں ڈاکٹر خلیق انجم سے ذاتی طور پر زیادہ واقف نہ تھا۔ دراصل مجھے اس بات پر غصہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب جو اس وقت تک انجمن کے جنرل سکریٹری بن چکے تھے اردو کے لیے کوئی سرگرم دھواں دھار تحریک کیوں نہیں چلاتے۔ شاید اس غصے کے پیچھے ایک لاشعوری وجہ یہ بھی ہو کہ خلیق صاحب کے مقابلے میں سہیل عظیم آبادی کو شکست ہوئی تھی اور سہیل صاحب کے لیے میرے دل میں بے حد عزت تھی میں سمجھتا تھا کہ دلی والوں نے سازش کر کے سہیل صاحب پر خلیق صاحب کو ترجیح دی ہے۔
لیکن جب خلیق صاحب سے تعلقات بڑھے تو معلوم ہوا کہ میرا غصہ نامناسب تھا۔ اور اس میں میرے جوش کو ہوش سے زیادہ دخل حاصل تھا۔

ملک کے جو حالات تھے اور اردو عوام کی ذہنی سطح خواندگی، جذباتیت اور عدم استقلال کا خلیق صاحب کو بہت بہتر اور درست اندازہ تھا اور ان حالات میں اردو تحریک کو جنگ جویانہ رخ دینا بہار میں تو درست تھا پورے سفر کے لیے تیار نہ تھا دراصل سفر سے مجھے ہمیشہ کوفت ہوتی ہے۔ لیکن مسائل کے ایڈیٹر اور ہمارے بے حد عزیز دوست ریاض عظیم آبادی لے مجھے کسی نہ کسی طرح دلی والی گاڑی میں بٹھا ہی دیا۔ اسٹیشن سے سیدھا کناٹ پلیس پہنچا۔ ڈی۔ آر۔ گوئل سے ملا مگر خلیق صاحب وہاں نہیں تھے معلوم ہوا اب وہ وزارت تعلیمات میں زیادہ وقت دینے کے سبب سیکولر ڈیموکریسی کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ لہٰذا مجھے ہی تنہا سیکولر ڈیموکریسی نکالنا ہے۔
ملک کے لیے بہر حال نادرست تھا۔ اپنی حماقت پر ندامت کے ساتھ خلیق صاحب کی دانشمندی کا احساس بھی ہوا اور میں نے اس کا اظہار بھی کیا۔

خلیق صاحب کا شمار ان لوگوں میں تو نہیں ہوتا جو خلقی طور پر جی نی لیس (نابغہ) ہوتے ہیں جیسے ابوالکلام آزاد یا گاندھی تھے لیکن جو لوگ اپنی محنت اور ذہانت دونوں کے امتزاج سے نابغہ کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں ان میں خلیق صاحب بھی ہیں۔ موقع شناسی، تحمل اور محنت خلیق صاحب کی سرشت کے اجزائے ترکیبی میں خصوصی اہمیت کے حامل اوصاف ہیں۔ جن کی آج کے مسلمانوں میں زبردست کمی ہے۔

خلیق صاحب پابند رسوم و قیود تو ہیں لیکن ان معاملات میں وہ کٹر نہیں ہیں۔ اس لیے کہ وہ نہ صرف گنگا جمنی تہذیب پر یقین رکھتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہیں بلکہ اپنے گھر میں بھی اس روشنی پر گامزن ہیں بلکہ اسے وسیع تر کر کے گنگا دجلہ تہذیب بنا دیا ہے۔
خلیق صاحب کی حس مزاح بھی بہت تیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے بعض اوقات ایسا جملہ ادا کرتے ہیں کہ بس مزہ آجاتا ہے " بس مزہ آگیا " کا وہ اکثر استعمال کرتے ہیں۔
جہاں تک ان کی تالیفات، تراجم اور تصنیفات کا تعلق ہے ان میں بھی خلیق صاحب کی وہی جاں سوزی اور عرق ریزی نظر آتی ہے جو ان کے دوسرے کاموں میں نظر آتی ہے

محمد آصف جاہ

خلیق بھائی

ادبی دنیا میں خلیق انجم صاحب یعنی میرے خلیق بھائی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں اردو ادب میں وہ صفِ اول کے محقق، متنی نقاد ہیں، بہترین مقرر ہیں سماج سدھارک ہیں اور سماج میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ ہندوستان، پاکستان اور ہر اُس جگہ جہاں اردو دوست آباد ہیں۔ ان کا نام بخوبی جانا پہچانا اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ ایک عرصے سے وہ الیکٹرونکس میڈیا، ریڈیو اور ٹیلی ویژن، اخبارات و رسایل میں اپنا مقام بنائے ہوئے ہیں۔ خلیق بھائی دہلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنی ادبی مصروفیات کے علاوہ وہ اپنے علاقے کے ایک مقبول رہنما ہیں۔ ان کی اس مقبولیت کو ہی دیکھتے ہوئے ۱۹۷۱ء کے میٹرو پالیٹن کونسل کے الکشن کے لیے، محترمہ اندرا گاندھی نے انھیں بذاتِ خود منتخب کیا تھا۔ آج بھی وہ بہت سی سماجی انجمنوں سے وابستہ ہیں اور سماجی بہبود کے کاموں میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں، میں قارئین کو خلیق بھائی کے بارے میں، ان کی شخصیت کو اپنے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے آشنا کرانا چاہتا ہوں۔ میں ان کے خاندان کا ایک فرد ہوں اور اس حیثیت سے میں ان کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔

خلیق بھائی بہت سی عجیب و غریب صفات کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت کثیر الجہات ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ اردو زبان کے ممتاز عالم، بہترین مقرر، سیاستداں، پرانی گاڑیوں کے مسیحا، این سی سی کے افسر، ماہر گلاب، ہومیوپیتھی کے موثر ڈاکٹر، آل انڈیا ریڈیو کی فارین سروسز میں دری زبان کے مشہور براڈ کاسٹر، ایڈمنسٹریٹر، معمار، بہترین فوٹو گرافر اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ وہ ہر نئے کام میں بآسانی ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ اور مزے دار بات یہ کہ کامیاب ہوتے ہیں۔

ان دنوں خلیق بھائی دہلی یونیورسٹی کے کروڑی مل کالج میں لکچرار تھے ان کا ہمارے گھر آنا جانا اکثر و بیشتر ہوتا رہتا تھا۔ میری عمر اس وقت شاید پندرہ یا سولہ سال تھی۔ مجھے ان کی صحبت میں بے حد لطف آتا تھا۔ وہ خاندان کے تمام چھوٹوں اور بڑوں میں بے حد مقبول تھے۔ کوئی تفریح کا پروگرام ہے تو خلیق بھائی ہی شروع کریں گے خاندان میں، سیر و تفریح کا مشترک پروگرام انھیں کے دم سے شروع ہوا جس میں سبھی لوگ دلچسپی لیتے۔ اگر خاندان میں کسی کو ایک دوسرے سے رنجش بھی ہوتی تو بھی خلیق بھائی کو یہ کمال حاصل تھا کہ وہ سب کو یکجا کر دیتے اور اس طرح بہت سے لوگ ایک دوسرے کے قریب آجاتے، غلط فہمیاں ختم ہو جاتیں۔ میرے

خیال میں، خاندان کے چند لوگوں کو اکٹھا کر دینا، باہر کے ایک بڑے مجمع کو کنٹرول کرنے سے بھی بڑا کام ہے۔ ہمارے خاندان میں پکنک کا تصور، جس میں تمام لڑکے لڑکیاں، بچے، حتیٰ کہ بڑے بھی شریک ہوں، خلیق بھائی کی دین ہے۔ آج سے تقریباً تیس پینتیس سال قبل اس طرح گھومنا پھرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ جس میں گھر کی عورتیں بے پردہ، مردوں کے ساتھ، جمنا ندی کے کنارے فالیزوں پر گھوم پھر رہی ہوں، لیکن خلیق بھائی نہ معلوم کس طرح گھر کے بڑوں کو راضی کر لیا کرتے تھے اور اس طرح کے پروگرام خلیق بھائی مختلف موقعوں پر بنایا کرتے تھے۔ سب کو بے حد مزہ آتا۔ خاندان کے سب ہی چھوٹوں اور بڑوں سے ان کی دوستی رہتی اور ان سے کوئی بھی بات کہنے میں جھجک نہ ہوتی۔ ایک دن اچانک معلوم ہوا کہ خلیق بھائی این سی سی کی ٹریننگ کے لیے کامٹی جا رہے ہیں۔ بڑا عجیب سا لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹریننگ لیکر آ گئے۔ ایک فوجی افسر کی شکل میں۔ ویسے بھی وہ نظم اور ضابطوں سے ہمیشہ بندھے رہے ہیں اور ڈسپلن کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ہر چیز میں وقت کی پابندی، پوری طرح ایک بااصول شخصیت۔ شاید ان کی اس خوبی میں ان کی والدہ مرحومہ کا کافی اثر ہے۔ خلیق بھائی کی والدہ خود ایک حوصلہ مند، سمجھدار، نظم اور ضابطوں کی پابند، دردمند اور اللہ والی خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی محنت اور ہمت سے اپنی اولاد کو، اپنی شفقت کے سائے میں اچھی سے اچھی تعلیم دی۔ کیوں کہ والد صاحب کا سایہ پہلے ہی سر سے اٹھ چکا تھا۔ اس لیے تمام تر ذمہ داری، والدہ ہی نے، تنہا بغیر کسی مدد کے، خدا کے بھروسے اٹھائی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئیں وہ بے حد سخی طبیعت خاتون تھیں۔ مجھے یاد ہے، ان کے پاس ایک بڑا سا رجسٹر ہوا کرتا تھا اس رجسٹر میں بہت سی غریب، بیوہ عورتوں، یتیم بچوں اور بے سہارا لوگوں کے نام اور پتے درج تھے، جن کی ہر ماہ وہ مدد کیا کرتی تھیں۔ ان کے گھر میں آنے جانے والوں کا ایک تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ ہر ایک سے وہ اچھی طرح پیش آتیں اور پھر اپنے لگے بندھے معمول میں مصروف ہو جاتیں۔

خلیق بھائی کو گاڑی نہیں، بلکہ گاڑیاں رکھنے کا بہت شوق رہا ہے وہ بے حد کھٹارا قسم کی گاڑی خرید لیتے، اس پر بے پناہ پیسہ لگاتے اور پھر کچھ دنوں خوب دوڑے پھرتے۔ ایسے تمام کاموں میں ہم ان کے ساتھ ہوتے اور بہت لطف آتا۔ اس زمانے میں جامع مسجد کے چاروں طرف بھی ایک بڑا کباڑی بازار ہوا کرتا تھا۔ جس میں ہر میک اور ماڈل کا سامان، مل جایا کرتا تھا۔ شاید ہی کوئی کباڑی ہو، جو خلیق بھائی کی شکل سے واقف نہ ہو۔ وہ بازار میں داخل ہوتے اور ادھر ادھر سے آوازیں آنے لگتیں ”صاحب میں نے آپ کی گاڑی کے لیے ایک فرسٹ کلاس ڈائنامو رکھ رکھا ہے، کوئی کہتا وہ آپ کی گاڑی کا پیڈل مل گیا ہے۔ لگوا لیجیے... وغیرہ وغیرہ۔“ خلیق بھائی ضرورت اور بغیر ضرورت سامان اکٹھا کر لیا کرتے۔ میں ”پخ“ کی طرح ان کے ساتھ ان کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ ساتھ گھومتا رہتا۔ گاڑی کے لیے گیرج تو تھا نہیں اس لیے اور بہت سی گاڑیوں کے ساتھ، ایڈورڈ پارک کے پاس کھڑی ہوتی۔ خلیق بھائی چھٹی والے دن گاڑی پر جٹ جاتے۔ خوب صفائی اور چمکائی ہوتی اور پھر دور تک کی سیر۔ ہم اس سیر کی امید پر جی جان سے ان کے ساتھ لگے رہتے لیکن کبھی کبھی یہ سیر بہت مہنگی پڑتی۔ عید کا دن تھا۔ نماز سے فارغ ہوئے۔ گھر پر رشتے داروں اور دوست احباب کا آنا جانا شروع ہوا۔ خلیق بھائی بھی میری والدہ کے ہاتھ کا پان کھانے اور ملنے ملانے آئے۔ جب وہ چلے تو حسب عادت ہم بھی ساتھ اور پہنچ گئے گاڑی پر۔ پروگرام بنا کہ عید کا دن ہے، تھوڑا سا لطف اٹھایا جائے۔ بدر پور تک کی ڈرائیو میں مزہ آجائے گا۔ ہم خوش، خلیق بھائی نے گاڑی میں سیلف مارا گاڑی نے اندوہناک آوازوں میں اپنی

۔تکلیف بیان کی اور پھر خاموشی۔ یہ سلسلہ کافی دیر چلا۔ سہم میں گیا تھا، لیکن کرتا کیا۔" ذرا بیٹری ویک ہوگئی ہے۔ ایک دھکے میں اسٹارٹ ہو جائے گی۔ خلیق بھائی نے کہا۔ میں پہلے ہی اس پوزیشن میں آچکا تھا۔ بہرحال ایک اور شخص سے درخواست کی اور اس کی مدد سے دھکا لگانے لگا۔ آپ یقین کریں اسی طرح ہم بیلارڈ جہاں شانتی دن ہے نکل آئے۔ اور گاڑی بغیر اسٹارٹ ہوئے ہی چلتے رہنے کو بضد۔ بمشکل تمام گاڑی کو واپس ایڈورڈ پارک لائے۔ لیکن اس مشق میں پورا جسم پسینہ پسینہ، کپڑے گندے اور ایک جوتے کی ایڑی غائب ہو چکی تھی۔ آپ یہ نہ سمجھیے کہ ان کی ہر گاڑی کے ساتھ ایسا ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم کئی بار بدر پور جانے تک کامیاب ہوئے۔

خلیق بھائی کو جب وقت ملتا، وہ ہمارے گھر آتے اور رات کو کافی دیر تک محفلیں جمتیں۔ میری والدہ انھیں پان پر پان دیا کرتیں اور خلیق بھائی صرف ان کا دل رکھنے کے لیے بار بار سلام کرتے اور پان کھاتے رہتے جب کہ وہ پان کھانے کے بالکل شوقین نہیں ہیں۔ ہاں وہ چین اسموکر تھے لیکن ایک روز فیصلہ کرلیا کہ آج سے سگریٹ نہیں پیوں گا، اور بغیر کسی الجھن اور پریشانی کے۔ انھوں نے اپنی سگریٹ نوشی پر قابو پا لیا۔ ہم سب بہن بھائیوں کو ان کی آمد کا انتظار رہتا۔ طرح طرح کے پروگرام بنتے۔ کبھی سیر و تفریح کا تو کبھی کوئی بزنس شروع کرنے کا۔ سیاست پر بحث و مباحثہ ہوتا۔ سب کچھ ہوتا لیکن خلیق بھائی کبھی بھی خاندان کے معاملوں میں مداخلت نہ کرتے نہ کسی کی برائی۔ نہ کسی سے جلنا اور نہ کبھی کسی کو نصیحت۔ شاید ان کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔

اچانک معلوم ہوا کہ خلیق بھائی شادی کر رہے ہیں۔ ایک دن حسب معمول ان کے ساتھ ایڈورڈ پارک کے باہر گاڑی کو چمکا رہا تھا کہ ایک خاتون سفید ساڑی میں ملبوس ایک اسکوٹر سے اتریں۔ خلیق بھائی نے تعارف کرایا۔ یہ آپ کی بھابھی ہیں۔ اس روز سے آج تک بیگم خلیق بھی اسی شفقت اور محبت سے پیش آتی ہیں جس طرح کہ خود خلیق بھائی۔ مسز انجم ایک دوسرے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن نئے خاندان میں اگر وہ خلیق بھائی کی ہی طرح ہر دلعزیز ہیں۔ ان دنوں وہ دہلی یونیورسٹی کے پاس، ماڈل ٹاؤن ٹیگور گارڈن میں میں رہتے تھے۔ ہر سنیچر کی شام یا کسی اور دن ان کے یہاں پہنچ جاتے۔ بھابھی صاحبہ مزے مزے کے کھانے پکاتیں اور ہم سب لوگ مزے لے لے کر کھاتے خاص طور پر ان کی فش رائس ڈش بہت پسند کی جاتی۔ وہ خاندان کے ہر شخص کے ساتھ بہت محبت اور اپنائیت سے پیش آتی ہیں۔ انھوں نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم ان کے شوہر کے رشتہ دار ہیں ان کے نہیں۔ گھر کی تمام تر ذمہ داری بھابھی کے کندھوں پر ہے۔ خلیق بھائی کو آٹے دال کا بھاؤ بالکل معلوم نہیں جب کہ ہماری بھابھی بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی، میں پروفیسر ہیں۔

ٹیگور گارڈن میں جس گھر میں خلیق بھائی رہتے تھے وہ ایک وکیل صاحب کا گھر تھا۔ وکیل صاحب یوں تو پوری طرح وکیل تھے لیکن خلیق بھائی اور ان کی فیملی سے ان کا تعلق مالک مکان اور کرایہ دار جیسا نہ تھا۔ ان کے گھر کے مسائل میں خلیق بھائی کی رائے کو اہمیت دی جاتی۔ وکیل صاحب انھیں اپنی فیملی کا ہی ایک فرد سمجھتے تھے، کیوں کہ جب انھوں نے یہ مکان چھوڑا تو وکیل صاحب اور ان کے بچوں کو بے حد دکھ ہوا۔ آج بھی خلیق بھائی کا اس گھر سے بہت قریبی تعلق ہے۔ ہولی، دیوالی، عید اور بقرعید پر تو ایک دوسرے سے ملتے ہی ہیں ویسے بھی اس تعلق کا سلسلہ جاری ہے۔ خلیق بھائی کے اس مکان میں ایک حصے میں، چھوٹا سا لان تھا۔ سبز گھاس اور مختلف پھولوں سے آراستہ۔ اکثر ہم لوگ جاڑوں میں کرسیاں ڈال لیتے اور گپ شپ کرتے۔ ایک روز جب میں وہاں پہنچا تو میں نے عجیب و غریب منظر دیکھا۔ لان کھدی پڑی ہے۔ سبزہ غائب

اور بھوری مٹی کے نشیب و فراز نظر آ رہے ہیں۔ بھابھی صاحبہ نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب (خلیق انجم) نے ایسا کیا ہے۔ اور وہ بہت جلد یہاں گلاب کی مختلف قسموں کا تجربہ کرنے والے ہیں۔ اسٹڈی میں خلیق بھائی لیمپ روشن کیے ایک کتاب میں غرق تھے اور آس پاس کئی موٹی موٹی کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے آصف صاحب۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ اب دیکھیے گلاب کی کتنی قسمیں یہاں اُگاتا ہوں۔ مجھے ہنسی بھی آئی۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں ضرور کر لیں گے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ کچھ ہی دنوں میں وہاں مِنی روز گارڈن بن چکا تھا۔ وہ اپنے ان پودوں کا بچوں کی طرح دھیان رکھتے۔ طرح طرح کے تجربے کرتے رہتے۔ شاید انھیں دنوں گلابی لٹریچر پڑھتے پڑھتے، ہومیوپیتھی اور بایوکیمک میڈیسن پر بھی کمال حاصل کیا۔ جب وہ کسی بات کو اپناتے ہیں تو اس کی انتہا تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کوئی چیز ان کی راہ میں مانع نہیں ہوتی۔ کوئی کتاب یا کوئی اور ضروری چیز جہاں کہیں ہے، اور جس قیمت پر بھی مل سکے وہ حاصل کر لیتے ہیں۔ انھوں نے ہومیوپیتھی میڈیسن کی ہندوستانی تصانیف پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ تمام لٹریچر جو جرمنی میں اس طریقۂ علاج کے سلسلہ میں چھپا اسے بھی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ آج ان کے پاس ان کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ وہ ان سے استفادہ کرتے ہیں اور بہت سے لوگ ان کی اس صلاحیت سے مستفید ہو رہے ہیں۔

خلیق انجم بھائی کا ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بہت پرانا رشتہ ہے۔ اردو سروس، اردو مجلس، بزم اور دوسری سروسوں سے ان کے مقالے اور مباحثے، انٹرویو وغیرہ نشر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے یہاں اردو گھر میں بہت سی ادبی مجلسیں، سیمینار وغیرہ منعقدہ کرتے رہتے ہیں اور ملک کے مختلف حصوں میں ایسی مجلسوں اور سیمیناروں میں برابر شرکت کرتے ہیں۔ ۱۹۰۰ کی بات ہے۔ میرے بڑے بھائی، احمد سعید صاحب ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کی دری سروس میں، براڈ کاسٹر تھے۔ یہ پروگرام، افغانستان، پاکستان، ایران، خلیج کے چند ملکوں اور خود ہندوستان میں سنا جاتا ہے۔ سعید صاحب نے خلیق بھائی کو یہ زبان سیکھنے اور براڈ کاسٹنگ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ خلیق بھائی کے لیے کوئی بھی نیا محاذ نیا نہیں ہوتا۔ وہ ہر میدان میں اپنی محنت اور لگن کے بل بوتے گھس جاتے ہیں جو کہ بالکل نیا ہوتا ہے۔ یہاں بھی وہی ہوا، وہ رات دن اس زبان کو سیکھنے، جرنالیزم اور ریڈیائی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تن دہی سے لگ گئے۔ ان دنوں دری سروس کے سپروائزر، بی بی لال ماتھر صاحب تھے جو خود ایک عالم و فاضل اور بہترین انسان تھے۔ انھوں نے خلیق بھائی کا ٹیسٹ لیا۔ وہ کامیاب ہوئے اور پھر دری پروگراموں میں casual basis پر حصہ لینے لگے۔

خلیق بھائی آج کل جہاں رہتے ہیں۔ اس کالونی کا نام سوریہ نگر ہے۔ بہت پہلے انھوں نے اس کالونی میں ایک پلاٹ لیا تھا۔ لیکن پلاٹ لینے سے مکان بنانے تک سفر بہت طویل اور پُرزحمت ہوتا ہے۔ مکان بنانے کی دشواریوں اور مصیبتوں کو جھیلنا محدود وسائل کے ہوتے ہوئے، ایک بڑا کام ہے۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی ہر شخص ایک اپنے مکان کا تصور، ایک حسین خیال اپنے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ رکھتا ہے۔ ہر روز اپنے تصور میں اس کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور رنگ بھرتا ہے۔ خلیق بھائی بھی ایک محنت کش ہیں ان کے سامنے بھی یہی دشواریاں تھیں۔ لیکن ان کے سوچنے اور کام کرنے کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اپنی مالی مجبوریوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اینٹ اور سیمنٹ کی دیواروں کو اٹھانے سے بہت پہلے ہی سے

وہ اپنے تصور کو عملی جامہ پہنانے کی دھن میں لگ گئے۔ انھوں نے تھوڑا تھوڑا کر کے اپنی ضرورت اور جیب کے مطابق لوازمات اکٹھا کیے اور جس وقت انھوں نے اپنا مکان بنانا شروع کیا، یہی تھوڑا تھوڑا جمع کیا ہوا سامان، گھر کے بنانے میں بے حد کام آیا۔ اس سے ان کی پلاننگ کی صلاحیت کا پتا لگتا ہے۔ اردو گھر کو ہی لے لیجیے جس وقت انجم صاحب، انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری بنے اس وقت یہ ایک ڈھانچہ کی شکل میں تھا۔ آج یہ ڈھانچا ایک خوب صورت عمارت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ جس کی موجودہ قیمت تین کروڑ روپے ہے۔

خلیق بھائی کو اپنے اعصاب پر مکمل کنٹرول ہے۔ جو ہمہ وقت اپنا توازن کھوئے بغیر بہت سے کام انجام دے سکتے ہیں۔ کب سونا ہے۔ کتنی دیر کے لیے، کب کیا کرنا ہے وہ اپنے وقت کا پورا حساب رکھتے ہیں۔ میں نے آج تک انھیں کسی پر غصہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ شدید مخالف حالات میں بھی ٹھنڈے دماغ سے کام لیتے ہیں اور اس طرح مخالفین کا دل بھی جیت لیتے ہیں۔ کبھی کسی پر اپنی رائے نہیں ٹھونستے۔ ہاں اگر کوئی ان سے مشورہ لیتا ہے تو پوری ایمانداری سے اپنی رائے دیتے ہیں۔ خاندان میں طرح طرح کی چھوٹی بڑی تقاریب ہوتی رہتی ہیں۔ وہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ان میں شامل ہوتے ہیں اور جس طرح جس کی مدد ممکن ہوتی ہے۔ اس کی مدد کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ خاندان کے تمام افراد اور مختلف یونٹوں کو وقتاً فوقتاً ملاتے رہنے کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ کبھی سب کو کسی نہ کسی بہانے اکٹھا کر لیں گے اور خاندان کے وہ لوگ جو مدتوں مصروفیت کی بنا پر یا جان بوجھ کر نہیں ملتے یا ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے ہیں، ان کی موجودگی میں آنکھیں چار کر لیتے ہیں۔ خلیق بھائی خاندان کے لیے ایک اہم اور بے حد مقبول شخصیت ہیں۔ وہ محفلوں کی جان اور زندگی کی علامت ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ وہ میرے بھائی ہیں۔

ہاں ایک بات اور اگر ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کی تعریف کرے تو سمجھ لیجیے، وہ شخص واقعی اچھا ہے۔ وگرنہ کسی کی اصلیت جاننا ہو تو اس کے رشتہ داروں سے مل لیجیے۔

جب آتش جوان تھا

اپنی بیٹی سیما کو گود میں لیے ہوئے

(دائیں سے بائیں) بیگم مومنی انجم، ممتاز صاحبہ (ڈاکٹر خلیق انجم کی ماموں زاد بہن)، ڈاکٹر خلیق انجم اور ان کی والدہ۔

ڈاکٹر خلیق انجم اور ان کی بیگم

ڈاکٹر خلیق انجم، جناب سید مظفر حسین برنی (سابق گورنر ہریانہ) اور پروفیسر مومنی انجم

شادی کے وقت کی ایک تصویر

کیپٹن کے۔ اے۔ خان
یعنی
اردو ادب کے
ڈاکٹر خلیق انجم

محترمہ اندرا گاندھی "ضبط شدہ نظمیں" مرتبہ، خلیق انجم اور مجتبیٰ حسین، کی رسم اجرا ادا کرتی ہوئیں، جناب علی جواد زیدی اور ڈاکٹر خلیق انجم

حکومت ہند کی طرف سے بھیجا گیا اردو ادیبوں کا ایک وفد ماریشس میں،

جناب شفیع قریشی (گورنر مدھیہ پردیش) ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، عزت مآب انرودھ جگن ناتھ (صدر ماریشس) ڈاکٹر خلیق انجم، جناب سید حامد اور پروفیسر صغرا مہدی

ڈاکٹر خلیق انجم اور محترمہ اندرا گاندھی

پروفیسر جگن ناتھ آزاد، کنور مہندر سنگھ بیدی مرحوم، جنرل ضیاء الحق مرحوم (صدر جمہوریۂ اسلامی پاکستان) اور ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم اور جسٹس ہدایت اللہ خاں مرحوم
(نائب صدر جمہوریۂ ہند)

عزت مآب گیانی ذیل سنگھ مرحوم (صدر جمہوریۂ ہند)
اور ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم اپنی بڑی بہن مسز طلعت سعید کے ساتھ

والدۂ ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر خلیق انجم کے بہنوئی
احسان الحق، ایک عزیزہ، پروفیسر موہنی انجم اور
ڈاکٹر خلیق انجم کی سب سے چھوٹی بہن محترمہ
ذکیہ ای حق۔

عزت مآب مرارجی ڈیسائی (سابق وزیر اعظم ہند) اور ڈاکٹر خلیق انجم

(دائیں سے بائیں)
پروفیسر موہنی انجم
راجیو گاندھی مرحوم (وزیر اعظم ہند)
اور
ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم اور عزت مآب
ڈاکٹر شنکر دیال شرما (صدر جمہوریۂ ہند)

ڈاکٹر خلیق انجم اور
عزت مآب وینکٹ رمن
(سابق صدر جمہوریۂ ہند)

ڈاکٹر خلیق انجم
اور
عزت مآب کے۔ آر۔ نرائن
(نائب صدر جمہوریۂ ہند)

گل پوشی

پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی

ڈاکٹر حیات اللہ انصاری

ایم۔ حبیب خاں

جناب عبدالرحمٰن

کانگریسی امیدوار کی حیثیت سے

کراچی میں ڈاکٹر خلیق انجم کو نیاز ایوارڈ دینے کے موقع پر۔
جناب جمیل الدین عالی کو بھی دیکھا جا سکتا ہے

صدر جمہوریۂ ہند
عزت مآب گیانی ذیل سنگھ مرحوم
انجمن ترقی اردو (ہند) کے
دفتر میں ڈاکٹر خلیق انجم کی
میز پر

موہنجوداڑو (پاکستان)
میں
ہندوستانی ادیبوں
کے
وفد کے ساتھ

ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

جناب خشونت سنگھ اور ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر مسعود حسین خاں

ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر نذیر احمد

(دائیں سے بائیں)
جناب احمد سعید، محترمہ شمیم
جہاں، محترمہ ثریا اسلم، محترمہ
طلعت سعید، ڈاکٹر خلیق انجم،
عزت مآب گیانی ذیل سنگھ مرحوم
(صدر جمہوریۂ ہند)
محترمہ موہنی انجم، سیما انجم، ثمر انجم اور ڈاکٹر اسلم پرویز

(دائیں سے بائیں) پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر سروپ سنگھ (گورنر گجرات) جناب حیات اللہ انصاری، جناب حکیم عبدالحمید، پنڈت آنند نرائن ملا، ڈاکٹر خلیق انجم جناب مالک رام مرحوم، جناب کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم، جناب یشپال کپور مرحوم

(دائیں سے بائیں) جناب ضامن مرادآبادی مرحوم، خواجہ حسن ثانی نظامی، ڈاکٹر خلیق انجم، جناب حیات اللہ انصاری، جناب متین امروہوی اور ڈاکٹر کامل قریشی مرحوم۔

(دائیں سے بائیں) جناب ضامن مرادآبادی مرحوم، جناب ذہین نقوی، مولانا سید علی تقوی، جناب شریف الحسن نقوی، محترمہ ثریا اسلم، محترمہ طلعت سعید، ڈاکٹر خلیق انجم، جناب رفیق عالم (سابق مرکزی وزیر) پروفیسر موہنی انجم اور ڈاکٹر اسلم پرویز

(دائیں سے بائیں) جناب مالک رام مرحوم، جناب کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم، پنڈت آنند نرائن مُلّا، ڈاکٹر خلیق انجم اور جناب ساغر نظامی مرحوم (ڈاکٹر خلیق انجم کو ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے دیے گئے انعام کے موقع پر)

(دائیں سے بائیں) جناب مالک رام مرحوم، جناب علی سردار جعفری اور ڈاکٹر خلیق انجم

(دائیں سے بائیں) جناب سجاد ظہیر مرحوم، جناب مالک رام مرحوم اور ڈاکٹر خلیق انجم

(دائیں سے بائیں) جناب خواجہ عبدالغفور مرحوم، نرگس دت مرحومہ اور ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم اور جناب فراق گورکھپوری مرحوم (فراق صاحب کی وفات سے چند روز پہلے)

ہمت رائے شرما کی آرٹ نمائش کا
افتتاح کرتے ہوئے
ہمت رائے شرما اور ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم کی دو بہنیں مسز ذکیہ ای حق، مسز طلعت سعید، ثمر انجم،
ڈاکٹر خلیق انجم اور جناب سیّد مظفر حسین برنی (گورنر ہریانہ)

ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر نامور سنگھ، جناب سیّد حامد، پروفیسر نگیندر اور جناب راجندر یادو

(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر خلیق انجم، جناب مجیب صدیقی، جناب صباح الدین عبدالرحمن مرحوم،
پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، جناب رضا علی عابدی

(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر خلیق انجم، جناب مالک رام مرحوم، جناب ساغر نظامی مرحوم اور
جناب رئیس امروہوی مرحوم

(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر سروپ سنگھ (گورنر گجرات)، ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر علی اشرف (سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ)

(دائیں سے بائیں۔ بیٹھے ہوئے) جناب سید شہاب الدین دسنوی، جناب صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم، جناب حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم، پنڈت آنند نرائن ملا، ڈاکٹر خلیق انجم، جناب مالک رام مرحوم، مفتی عتیق الرحمٰن مرحوم، پروفیسر مسعود حسین خاں (کھڑے ہوئے پہلی قطار) جناب سری نیواس لاہوٹی مرحوم، جناب سہیل عظیم آبادی مرحوم، جناب عابد علی خاں مرحوم، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر جاوید وششٹ مرحوم، ڈاکٹر عبدالمغنی۔ (کھڑے ہوئے دوسری قطار) جناب عتیق احمد، جناب انیس اعظمی، جناب شاہد خاں، محترمہ شمیم جہاں جناب اشتیاق حسین رضوی مرحوم، ایم جلیب خاں، جناب محمد قاسم، چودھری عبدالرحیم، جناب شمیم احمد، جناب لئیق احمد اور جناب مہی لال۔

(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر خلیق انجم جناب مالک رام مرحوم پروفیسر مونس رضا مرحوم اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد

لندن میں ایک استقبالیہ کے بعد (دائیں سے بائیں) پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر خلیق انجم ڈاکٹر عبدالرحمٰن جسٹس صمدانی صاحب جناب افتخار عارف اور جناب شہرت بخاری

پروفیسر موہنی انجم، عزت مآب ڈاکٹر شنکر دیال شرما (صدر جمہوریہ ہند)
اور ڈاکٹر خلیق انجم

عزت مآب وشوناتھ پرتاپ سنگھ (سابق وزیر اعظم ہند) اور ڈاکٹر خلیق انجم

پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر خلیق انجم

محترمہ آمنہ مشفق، پروفیسر موہنی انجم (بیٹھی ہوئی ہیں)، ثمر انجم
(ڈاکٹر خلیق انجم کا بیٹا)، سیما انجم (ڈاکٹر خلیق انجم کی بیٹی) اور جناب شفیق خولجہ

انجمن ترقی اردو اتر پردیش کی مجلسِ عاملہ کے اراکین کے ساتھ

پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر خلیق انجم اور حکیم عبدالحمید صاحب

(دائیں سے بائیں) جناب مالک رام مرحوم، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مومنی انجم، جناب صباح الدین عبدالرحمن مرحوم، ڈاکٹر خلیق انجم اور ایم۔ حبیب خاں

جناب کفایت اللہ اور ڈاکٹر خلیق انجم

لکھنؤ میں ۲۹ جنوری ۱۹۹۵ء کو انجمن ترقی اردو اترپردیش کے دفتر کا افتتاح کرتے ہوئے

ڈاکٹر گرجا ویاس (سابق نائب مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات) پاکستان کے مشہور نقاد ڈاکٹر فرمان فتحپوری پر ڈاکٹر خلیق انجم کی مرتبہ کتاب (مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) کی رسم رونمائی کے موقع پر۔

عبداللطیف اعظمی

ڈاکٹر خلیق انجم

جیسا سُنا، دیکھا اور پرکھا

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب متعدد کتابوں کے مصنف اور مرتب، ایک موقر ماہی مجلہ "اردو ادب" اور ایک مقبول ترین ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" کے اڈیٹر اور اہم ترین یہ کہ ایک کل ہند تصنیفی اور اشاعتی ادارہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے سربراہ ہیں۔ اس عہدے کو اہم ترین میں نے اس لیے کہا کہ موجودہ دور میں، بلکہ ہر دور میں کسی ادارے کو کامیابی کے ساتھ چلانا، خاص طور پر ایک ایسے ادارے کو جس کا تعلق اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت سے ہو اور اس کی مجلس عام اور مجلس عاملہ کے اراکین اور صدر انتخاب کے ذریعے مقرر ہوتے ہوں بڑا مشکل اور جان لیوا کام ہے اور اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ روگ ہر ایک کے بس کا نہیں۔ لیکن ایک طویل عرصے سے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب بحیثیت سکریٹری پوری کامیابی کے ساتھ اس ادارے کو چلا رہے ہیں۔ اس عرصے میں نہ جانے کتنے نرم اور گرم صدر آئے اور اپنی مقررہ مدت کو ختم کر کے چلے گئے، مگر جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، موصوف سکریٹری صاحب کو بھی کا حسن اعتماد حاصل رہا۔ اسی طرح مجلس عام اور مجلس عاملہ میں بڑے بڑے تیس مار خاں منتخب ہو کر تشریف لائے، لیکن سکریٹری صاحب کے حسنِ انتظام اور ان کی صلاحیت و قابلیت کے مدح خواں نظر آئے۔ تنقیدی حلقوں میں ایک ادیب کی بڑی دھوم ہے۔ اردو کا بڑے سے بڑا دانشور شاید ہی ہو جو ان کے نوک قلم سے محفوظ رہا ہو۔ جب خلیق انجم صاحب اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے تو ان کے خیر مقدم اور ان کو ہدیۂ تبریک پیش کرنے کے لیے اردو کے ادیبوں اور صحافیوں کا ایک جلسۂ عام منعقد ہوا، تو یہ نامور نقاد صاحب بھی مقررین میں شامل تھے۔ انھوں نے مبارکباد دیتے ہوئے پورے خلوص کے ساتھ حسب عادت یہ بھی فرمایا کہ اگر منتخب سکریٹری صاحب نے صراطِ مستقیم سے ذرا بھی انحراف کیا اور انجمن کے اغراض و مقاصد اور اس کی روشن روایات پر عمل کرنے سے قاصر رہے تو ہم انھیں بھی کسی حالت میں معاف نہیں کریں گے۔ اس سے بہت عرصہ پہلے جامع مسجد پر اردو نا ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا، جس میں حضرت مقرر نے غلام ربانی تاباںؔ مرحوم کی شاعری پر ایک مقالہ پڑھا تھا، جس پر خلیق انجم صاحب اور ان کے دوست اور عزیز ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب نے شدید اعتراضات کیے تھے۔ فاضل مقرر کے مذکورہ بالا جملہ سننے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ اب خلیق صاحب کی خیر نہیں، مگر میری طرح اس مضمون کے قاری بھی انگشت بدنداں ہوں گے کہ وہ ادیب شہیر اب خلیق صاحب کے بہترین مداحوں اور مخلص دوستوں میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر خلیق صاحب کی دو کمزوریاں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دلّی والے ہیں۔ دوسرے خالص پٹھان ہیں۔ اس لیے اگر کسی نے ان کی "دہلویت" کو ذرا بھی ٹھیس پہنچانے کی کوشش کی، یا کسی نے جذباتی انداز میں ان پر جا و بیجا اعتراضات کیے تو ان کی رگِ پٹھانیت فوراً جوش میں آجاتی ہے اور وہ قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے کے دو واقعات

ایک طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود، میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ پہلا واقعہ دلّی اردو اکادمی کے ایک جلسے میں پیش آیا۔ دہلی یونیورسٹی کے سینیر دانشور نے اپنی تقریر کی رو میں یہ کہہ دیا کہ دلّی والے ہیں کتنے؟ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہیں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ یہ شیر، جس کا نام خلیق انجم ہے۔ بپھر گیا اور آستین چڑھا کر کھڑا ہو گیا اور للکار کر بولا۔ اسٹیج سے نیچے آؤ بتاؤں کہ دہلی والے کتنے ہیں۔ دوسرا واقعہ خود اردو گھر کے جلسے میں پیش آیا۔ اردو کے ممتاز ادیب و دانشور اور آزادی کے بعد انجمن کے پہلے نامور سکریٹری قاضی عبدالغفار مرحوم پر ایک کل ہند سمینار منعقد ہوا تھا۔ علی گڑھ کے ایک صحافی نے جنھیں اپنی زبان اور قلم پر بالعموم قابو نہیں رہتا۔ انجمن پر سخت الفاظ میں اعتراضات شروع کر دیے، جس کا ماحصل یہ تھا کہ انجمن نے مرحوم کی خدمات کے اعتراف میں بڑی کوتاہی سے کام لیا ہے۔ اگرچہ موصوف کے یہ اعتراضات بے محل اور نامناسب تھے۔ مگر خلیق انجم صاحب اس سمینار کے ڈائرکٹر اور سب سے اہم بات یہ کہ میزبان تھے۔ اس لیے ان کو صبر و ضبط سے کام لینا چاہیے تھا۔ لیکن ان کی تخلیق کھری مٹی سے ہوئی ہے ان کے نزدیک مصلحت پروری بزدلی کا دوسرا نام ہے۔ فاضل مقرر اسٹیج سے اترے تو یہ اسٹیج پر پہنچ گئے اور صحیح معنی میں جواب الجواب تقریر شروع کر دی۔ مجھ جیسا کمزور آدمی حیران اور ششدر تھا کہ اب کیا ہوگا۔ مگر آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں جب پہلے مقرر مجمع سے اٹھ کر آئے اور خلیق انجم صاحب سے بغل گیر ہو گئے اور معذرت کے انداز میں کہنے لگے کہ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل خلیق صاحب اردو والوں کے مزاج کو بہت اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ کس وقت کیا کرنا چاہیے اور کس وقت کیا نہیں۔ اگر وہ اس گُر سے کام نہ لیتے تو انجمن کو ایک دن بھی چلانا ان کے لیے ممکن نہ ہوتا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب ایک ممتاز دانشور ہی نہیں، انتظامی امور کا بھی انھیں گہرا اور وسیع تجربہ ہے انجمن کے مسائل سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں اور اس کے سکریٹری کی انتظامی اور علمی صلاحیتوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ ایک مرتبہ خلیق انجم صاحب سڑک کے کسی حادثے کے شکار ہو گئے۔ اس موقع پر مسعود صاحب نے ۱۶ مارچ ۱۹۸۹ء کو عیادت کے لیے جو خط لکھا، اس کا ایک جملہ بہت اہم اور قابل غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "یہ آپ کیا کر بیٹھے؟ آپ حادثات کی باگ کو موڑنے والے لوگوں میں ہیں۔ کیسے مانوں کہ آپ حادثے کے شکار ہو گئے" خط کشیدہ الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ دراصل ان کی کامیابی کی یہی کنجی ہے۔

مگر یہ مزاج انتظامی امور میں بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسے علمی معاملات میں شامل کر لیا جائے تو اس سے بدنامی اور بے اعتباری پیدا ہوتی ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ میری نظر میں ہے۔ جسے میں اپنی بدگمانی سے تعبیر کرتا ہوں۔ دسمبر ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم اور مفید کتاب: "غالب اور شاہان تیموریہ" شائع ہوئی تقریباً اسی زمانے میں خاکسار نے ایم اے اردو کے لیے ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا، جس کا عنوان تھا: "جدید دور کے اردو خطوط کا تنقیدی جائزہ" (۱۹۱۴ء ـــ ۱۹۷۵ء) مگر اس کے مقدمے میں بہت ہی بسط و تفصیل سے میں نے اس مسئلے پر بحث و گفتگو کی تھی کہ اردو میں خطوط نگاری کا آغاز کب ہوا اور ابتدا میں اس کی نوعیت اور کیفیت کیا تھی۔ اسی سلسلے میں غلام امام شہید (۱۸۰۴ء-۲، اکتوبر ۱۸۷۹ء) کے مکاتیب اور مضامین کا مجموعہ: "انشائے بہار بے خزاں" کے بارے میں جو ۱۸۶۶ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ اظہار خیال کرتے ہوئے خاکسار نے لکھا تھا: مکتوباتی ادب کے مطالعے کے وقت مجھے محسوس ہوا کہ عام طور پر امام شہید کے ان خطوط کے بارے میں غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ بہت سے ادیبوں نے ان پر اس طرح تنقید و تبصرہ کیا ہے گویا یہ اصلی خطوط ہیں۔ حالانکہ بنیادی طور پر خطوط نویسی

سکھانے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ جس کی فاضل مصنف نے شروع ہی میں اپنے اس مقصد کی وضاحت کردی ہے۔ ان میں تھوڑے سے خطوط اصلی بھی ہیں۔ جن کی زبان بہت ہی رواں اور سلیس ہے اس غلط فہمی کا شکار ڈاکٹر خلیق انجم بھی ہوگئے۔ میں نے اپنے ایم اے کے تحقیقی مقالے کی تیاری کے زمانے میں اس کا بہت تفصیل سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اپنے مقالے کے مقدمے میں اس کی خامیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح اس مقالے کے زیر بحث مسئلے پر بھی کوئی واضح روشنی نہیں ملتی چنانچہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے انشائے بہار بے خزاں کا ذکر خطوط نگاری سکھانے والی کتابوں کے تحت کیا ہے، مگر بعض مقامات پر ان خطوط کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔ گویا یہ اصلی خطوط ہیں۔ چوں کہ میرا گمان ہے کہ خلیق انجم صاحب کو اس مجموعۂ خطوط کا اصل نسخہ نہیں ملا اس لیے انھوں نے غالباً خواجہ صاحب کے مقالے پر انحصار کیا ہوگا۔ اس لیے میرے نزدیک انھوں نے زیر بحث خطوط پر جو رائے زنی کی ہے وہ قابل بھروسہ نہیں ہے۔ گزشتہ اوراق میں کسی جگہ میں لکھ چکا ہوں کہ یہ مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۸۶۶ء میں چھپا تھا، لیکن اس قدر اسے حسن قبول حاصل ہوا کہ ۱۸۸۹ء تک تقریباً تئیس سال کی مدت میں اس کے آٹھ اڈیشن شائع ہوئے۔ پھر بھی دہلی، علی گڑھ اور لکھنؤ کے کتب خانوں میں مجھے اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ اگر ملا تو پٹنہ کے مشہور کتب خانہ خدا بخش اور سینٹرل پبلک لائبریری میں۔ اس لیے جب خلیق صاحب کی وقیع کتاب "غالب اور شاہانِ تیموریہ" میں اس مجموعے کا ذکر پڑھا تو مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ نایاب کتاب ان کو دستیاب ہوئی ہوگی۔ چناں چہ اپنے شک کو دور کرنے کے لیے موصوف کی خدمت میں ایک دن حاضر ہوا اور ان سے دریافت کیا کہ کیا یہ کتاب آپ کے پاس ہے؟ اثبات میں جواب پاکر عرض کیا کہ میں اپنے ایک مضمون کے کچھ حوالوں کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں، اس لیے چند لمحوں کے لیے یہ کتاب مل جائے تو عنایت ہوگی۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ کتاب میرے سابق مکان، ٹیگور پارک میں ہے۔ میں نے گزارش کی تکلیف کرکے، جب بھی وہاں جانا ہوتا ہے کلاں محل (پرانی دہلی) کے موجودہ مکان میں ہولا دیجیے یا اپنے اس دفتر میں، مطلوبہ حوالوں کو چیک کرکے فوراً ہی واپس کردوں گا۔ ازراہ کرم موصوف نے وعدہ کرلیا، مگر بدقسمتی سے کبھی یہ ایفا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ سے میرا یہ شبہ یقین میں تبدیل ہوگیا۔ مگر اس کے باوجود موصوف کی شخصیت، مرتبہ اور ان کے ادبی کارناموں کے پیش نظر میں یہ اعتراف کرنے کے لیے تیار ہوں کہ بہت ممکن ہے کہ میرا یہ شک و گمان بالکل بے بنیاد ہو۔ کیوں کہ شک و شبہ بہرحال شک ہی ہوتا ہے حقیقت نہیں۔

اس مخصوص مسئلے سے قطع نظر، علم و ادب اور تحقیق و صحافت کی ڈاکٹر خلیق انجم نے جو شاندار خدمت کی ہے شاید ہی کوئی ہو جسے صدق دل سے اس کا اعتراف نہ ہو۔ آج سے تقریباً دس سال پہلے دہلی اردو اکادمی کی منظوری سے راقم الحروف نے ایک اردو ڈائرکٹری مرتب کی تھی۔ جس میں پورے ہندوستان کے مصنفین کے سوانحی خاکے شامل ہیں۔ اس کے مطابق خلیق انجم صاحب کی پیدائش دہلی کی ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ موصوف نے اردو میں پی۔ ایچ ڈی کے علاوہ لسانیات اور لائبریری سائنس میں ڈپلوما بھی کیا ہے۔ موصوف کی ۴۲ تصانیف اور مرتبہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ جن میں سے بعض کتابیں متعدد جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ان کی پہلی کتاب "معراج العاشقین" (مرتبہ)، ہے۔ جو ۱۹۵۷ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔ ان کی آخری کتاب پچھلے سال ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی ہے۔ جو صف اول کے رہنما اور ممتاز مجاہد آزادی مولانا حسرت موہانی پر ہے۔ چوں کہ اس موضوع پر خاکسار نے بھی ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ جو بوجوہ اب تک شائع نہ ہوسکی۔ مجھے امید ہے کہ

اس سال کے آخر تک انشاءاللہ ضرور شایع ہو جائے گی۔ کام اور موضوع کی یکسانیت کی وجہ سے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حسرت پر اب تک جس قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان سب سے زیادہ جامع و مانع ہے اور مختصر الفاظ میں اسے بہترین کہا جا سکتا ہے۔

موصوف کی کتابوں کے معیار اور ان کی افادیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پروفیسر مسعود حسین صاحب جیسے ممتاز ماہر لسانیات اور اردو کے مسلّمہ دانشور کو موصوف کی کتابوں کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے چناں چہ اپنے خط مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۸۵ء میں لکھتے ہیں۔ "غالب کے خطوط کا سلسلہ کہاں تک پہنچا یا میں اس کی اگلی جلد کا بے تابی سے منتظر ہوں"[۲] حاشیے میں درج ہے: "ڈاکٹر خلیق انجم نے مرزا غالب کے تمام خطوط کو یکجا کر کے، ان کا تنقیدی اڈیشن چار جلدوں میں "غالب کے خطوط" کے نام سے شایع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا" مسعود صاحب نے جب یہ خط لکھا تھا تو اس وقت تک اس سلسلے کی دو جلدیں شائع ہو چکی تھیں۔ پہلی ۱۹۸۴ء اور دوسری ۱۹۸۵ء۔ خلیق انجم صاحب کی بیشتر کتابوں پر ملک کی متعدد اکاڈمیوں نے انعامات اور اعزازات سے نوازا ہے۔ چناں چہ روزنامہ قومی آواز مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۸۵ء میں اسی قسم کی ایک خوش خبری شائع ہوئی تو پروفیسر مسعود حسین صاحب نے فوراً ہی خلیق انجم صاحب کو مبارکباد دیتے ہوئے اور اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا: "آج کے قومی آواز میں آپ کو بنگال اردو اکادمی کے ادبی اعزاز ملنے کی خبر پڑھی۔ نہایت مسرت ہوئی، مبارکباد قبول کیجیے۔ آپ "علائق انجمن" سے جب فرصت پا کر قلم ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ اعزاز اسی کا اعتراف ہے۔ اس قسم کے اعتراف کے لیے او رمواقع فراہم کرتے رہا کیجیے"[۳]

مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی داستان حیات اتنی دل چسپ اور دل پذیر ہو گی کہ قلم کو روکنا مشکل ہو جائے گا۔ جی تو نہیں چاہتا، مگر باتیں کافی طویل ہو گئی ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ پروفیسر مسعود حسین خاں: نذر مسعود (مرتبہ: مرزا خلیل احمد بیگ)، صفحہ ۴۲۴

۲۔ ایضاً۔ ص ۴۱۰

۳۔ ایضاً۔ ص ۴۱۱

ڈاکٹر شان الحق حقی (کراچی)

متنی تنقید مختصر جائزہ

یہ اپنے موضوع پر اردو میں پہلی تصنیف ہے جس میں کتابوں کے متن کی تحقیق و تصحیح کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ کسے انکار ہوگا کہ اردو میں ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی۔ متن کے معاملے میں ہمارے ہاں جو ابتری پائی جاتی ہے وہ اردو کے ماتھے کا کلنک بن گئی ہے۔ ہم نے شاید ہی کوئی کتاب ایسی چھاپی ہو جو اغلاط سے یکسر مبرا کہی جا سکے۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے جس کے خیال سے سخت ندامت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے اسباب بہت سے ہیں۔ تاویلات بہت سی ہو سکتی ہیں، مگر بات نہایت افسوس ناک ہے۔

جناب ڈاکٹر خلیق انجم نے بجا طور پر سب سے پہلے صحت متن کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اس ذہنی عادت کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی ہے جو ایک آدھ لفظ کے ردو بدل میں مضائقہ نہیں سمجھتی کہ غالب نے "بہت بے آبرو ہو کر" لکھا تھا" یا "بڑے بے آبرو ہو کر" بلکہ اس باریک بینی اور خوردہ چینی کا مذاق اڑاتی ہے حالاں کہ یہ لاپروائی علم وادب کے حق میں زہر ہے۔ سودا کے کلام سے جو مثالیں انھوں نے دی ہیں ان میں سیاہی کی جگہ سپاہی اور "لگ گئی ہے بڑ" کی جگہ "لگ گئے ہیں پر" بن جانے سے مفہوم کچھ کا کچھ ہو گیا۔ کس کو معلوم کہ ایسی بے احتیاطیوں کے طفیل علم وادب میں معنی کا کتنا کچھ خون ہوا ہوگا۔ کتابت وطباعت نقل واقتباس کے ضمن میں الفاظ اور مفہوم پر کیا کیا ستم ہوتے ہیں، ہر لکھنے پڑھنے والے کو اس کا علم ہے۔ اکثر آپ سوائے خون کا گھونٹ پینے کے کچھ نہیں کر سکتے۔

ہمارے مخطوطات میں شکستہ تحریر، علامات اور نقطوں کی طرف سے بے نیازی، اوقاف کی عدم موجودگی، مقابلے و تصحیح سے لاپروائی، محاورے اور تلفظ کی تبدیلی اور املا کی بے قاعدگی کے باعث متن کی تحقیق میں چند در چند دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ کاتب عموماً نیم خواندہ ہوتے تھے۔ طباعت کے بجائے ہاتھ سے نقل در نقل کی روایت نے غلطیوں میں اور بھی بہتات پیدا کر دی ہے۔ مطبوعہ نسخوں میں یہ اغلاط نہ صرف یہ کہ بے تکلف در آئی ہیں بلکہ کچھ اور بڑھ گئی ہیں۔ کیونکہ جس قدر توجہ تنقید پر کی گئی، تحقیق متن کو نصیب نہ ہو سکی، حالاں کہ وہ بعد کی بات ہے اور یہ مقدم۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے متن کی تحقیق کے سلسلے میں، فراہمی مواد سے لے کر موازنے ومقابلے کے طریق، اختلاف نسخ کے مسائل، اغلاط عام کی نوعیت وکیفیت سے لے کر جعلی متنوں کی تحقیق، سرقہ، فرضی نام، گم نام مصنفین یا فرضی ناموں سے لکھنے والوں کی تصانیف، سنہ تصنیف کا تعین غرض بہت سے ایسے مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے جو متن کی تحقیق کے سلسلے میں پیش آتے رہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی دلچسپ تفصیلات بیان ہوئی ہیں جن کی بدولت یہ کتاب چند خشک مباحث کا مجموعہ نہیں رہی بلکہ بڑی قابل مطالعہ ہو گئی ہے۔ اور صرف محققین ہی کے لیے مفید نہیں، عام قارئین کے لیے بھی دلچسپی کا سامان رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں متن کی حرمت کو قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا عام طور سے مطالعہ کیا جائے۔

ہم ڈاکٹر صاحب کو مشورہ دیں گے کہ وہ آئندہ اڈیشن میں سہو و التباس کی مثالوں کو فراہم کر کے اور زیادہ فراوانی سے درج کریں جس سے دوہرا فائدہ حاصل ہوگا۔ یعنی اغلاط کی بہت سی اقسام سامنے آجائیں گی جو محققین کی آگاہی کے لیے مفید ہوں گی، اس کے علاوہ ان لطائف سے کتاب کی دل چسپی میں اور اضافہ ہوگا۔

عبدالمجید نعمانی

حسرت موہانی از ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر خلیق انجم علم و تحقیق کا ایک مستند و معتبر نام ہے۔ انجمن ترقی ہند جیسے عظیم ادارے کے ذمے دار عہدے جنرل سکریٹری پر فائز ہونے کے باوجود ایسا کچھ علمی و تحقیقی کام کرتے رہتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ فعال جنوں کی ایک جماعت ہے۔ ورنہ اس قدر علمی و ادبی اور تحقیقی کاموں کا انجام پا جانا کیا معنی رکھتا ہے۔

گزشتہ برسوں میں انھوں نے جو علمی، تحقیقی کشور کشائی اور فتوحات حاصل کی ہیں۔ وہ انھیں ادبی، تحقیقی دنیا میں زندہ جاوید کرنے کے لیے کافی ہیں۔ چاہے غالب کے خطوط کی ترتیب و تدوین (چار جلدیں) ہو، یا مرزا رفیع سودا، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، دہلی کے آثار قدیمہ، رسوم دہلی، آثار بلیا، مرقع دہلی، دلی کی درگاہ شاہ مرداں آثار الصنادید، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، محی الدین قادری زور، جوش ملیح آبادی ــــ تنقیدی جائزہ بھی بہترین تحقیق، تالیف، ترجمہ اور تصنیف کے شاہد عدل ہیں۔ اسی سلسلے کی حسرت موہانی بھی ایک خوب صورت کڑی ہے۔

پچھلے دنوں انجمن ترقی اردو ہند نے جہاں حسرت موہانی کے سیاسی، ادبی اور شعری خدمات سے روشناس کرانے کے لیے سمینار منعقد کیا وہیں ڈاکٹر صاحب نے حسرت موہانی کے حالات زندگی اور سیاسی، شعری ادبی کارنامہ پر ایک خوبصورت کتاب بھی ترتیب دی تھی۔ یہ زیر تبصرہ کتاب انھوں نے موقر رسالہ "آجکل" کے مدیر شہیر جناب محبوب الرحمان فاروقی کی فرمائش پر لکھی ہے۔

"حسرت موہانی" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جناب ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے حسرت سے عقیدت و تعلق ہونے کے باوجود تحقیق و انصاف کا خون نہیں کیا ہے۔ اور ان کی زندگی کے ہر پہلو کو علم و استدلال اور حقیقت و تحقیق کے معیار پر پوری غیر جانبداری سے پرکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ ورنہ عموماً عقیدت کے ساتھ حقیقت کو نبھا پانا بڑا مشکل کام ہے۔ مثلاً مولانا حسرت موہانی کے متعدد سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ مولانا حسرت موہانی دور طالب علمی ہی سے سیاست حاضرہ میں دل چسپی لینے اور نعرہ حیرت بلند کرنے لگے تھے۔ جس کے نتیجے میں وہ تین بار ایم اے۔ او کالج سے نکالے گئے، اس دعوے کی خلیق صاحب نے پرزور انداز میں تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حسرت کو پر لگا کر اڑانے کی کوشش ہے۔

اس طرح کی تحقیقات کے ساتھ اس کتاب میں پہلی بار جناب خلیق انجم نے بیگم حسرت موہانی کے خد و خال اور دلیرانہ کردار و عمل کو پیش کیا ہے۔ اور یہ کہ ان کی تصویر بھی پہلی بار ہمیں اس کتاب میں نظر آئی۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے جس خوبصورت انداز میں بیگم حسرت موہانی کا تعارف کرایا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بیگم حسرت، مولانا حسرت سے زیادہ دلیر، بے خوف، بے باک اور دل گردے والی خاتون تھیں۔ حسرت پر چھپنے والی اب تک کی کتابوں میں یہ بہترین کتاب ہے۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

مرقعِ دہلی

درگاہ قلی خاں کی تصنیف اٹھارویں صدی کی تہذیبی اور سماجی زندگی کا ایک مرثیہ ہے۔ یہ عہد محض ایک سیاسی زوال کی داستان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب کا ماتم بھی ہے۔ ہندوستان نے سیاسی عروج وزوال کی بہت سی تصویریں دیکھی ہیں مگر اس عہد میں جس طرح تہذیبی اقدار کا خون ہوا ہے وہ شاید کسی زمانہ میں نہیں ہوا۔ اس زوال کی ذمہ داری شاہانِ مغلیہ پر بھی تھی اور ان کے امرا پر بھی۔ اس الزام سے عوام بھی بری الذمہ نہیں کیے جا سکتے۔ اس اعتبار سے "مرقعِ دہلی" کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ اتنی تفصیل سے غیر جانبدارانہ انداز سے کسی دوسرے مورخ نے دلی کی کہانی نہیں لکھی۔

"مرقعِ دہلی" کا متن فارسی کا ہے۔ اساتذہ اور طلبہ فارسی سے بیگانہ ہوتے چلے جا رہے ہیں اس لیے ضرورت تھی کہ اس کا اردو ترجمہ بھی فراہم کیا جائے۔ چنانچہ سید مظفر حسین نے اس کو اردو جامہ پہنایا۔ اس کے بعد خواجہ حسن نظامی نے اس کی تلخیص شائع کردی۔ نصف صدی کے بعد ڈاکٹر نورالحسن انصاری نے فارسی متن کے ساتھ اردو ترجمہ پیش کردیا۔ اسی سلسلہ میں خواجہ عبدالحمید یزدانی کا اردو ترجمہ اور چندر شیکھر اور شیاما مترا کا انگریزی ترجمہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ مگر معلوم نہیں کیوں ان متون اور تراجم کے باوجود ایک کمی سی محسوس ہو رہی تھی، محسوس ہوتا تھا کہ ابھی کہنے کو بہت کچھ تھا اور کہہ نہیں سکے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس خلش کو ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتبہ اور مترجمہ نسخہ نے دور کردیا۔

میں نے جس خلش کا سطور بالا میں تذکرہ کیا اس کے اسباب کئی تھے۔ کہیں متون کی عدم صحت۔ کہیں ترجمہ کی فروگذاشتیں۔ کہیں یہ خیال کہ درگاہ قلی خاں نے اس عہد کی دلی سے تو متعارف کرا دیا اب درگاہ قلی خاں اور ان کی تصنیف کا تعارف کون کرائے۔ خوشی ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتبہ نسخہ نے ان فروگذاشتوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ کتاب کی ابتدا میں ایک تفصیلی مقدمہ ہے۔ اس مقدمہ کو پڑھ کر اس عہد کی مختصر تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مقدمہ نگار نے محض کسی ایک بیان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مختلف الذہن مورخین کے حوالے سے اس عہد کی تاریخ کے نقوش ابھارے ہیں، جہاں "مرقعِ دہلی" کے اقتباسات پیش کیے ہیں وہاں دوسرے مورخین کے اقتباسات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ مقدمہ کے اقتباسات میں مجھے خوشی ہے کہ مقدمہ نگار نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ جہاں اقتباس میں مبالغہ یا مورخ کی بدنیتی ان کو نظر آئی اس کا اظہار حواشی میں کر دیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ مغلوں کے سلسلہ میں انگریز مورخین نے جو گل افشانیاں کی ہیں وہ تاریخ کو مسخ کرنے کی بدترین مثال ہے۔ موضوع سے قطع نظر مقدمہ اور ترجمہ کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔

پہلا مسئلہ متن کا پیدا ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی حیثیت بنیادی کی ہوتی ہے۔ جس پر مرتب یا مترجم اپنی تعمیر کرتا جاتا ہے۔ اب تک میری نظر سے جو نسخے گذرے ان میں کچھ سہوِ کاتب تھا۔ اور کچھ مرتب

کے فیصلہ کی غلطی تھی۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی جستجو نے چار مخطوطات فراہم کر لیے اور بنیادی متن کے لیے سالار جنگ میوزیم کے نسخہ کا انتخاب ہوا۔ وجہ انتخاب اس کی قدامت اور صحتِ متن ہے۔ باقی اختلاف حاشیہ کے کام آئے۔ ترتیب متن سے خلیق انجم کی شناسائی پرانی ہے۔ دلی یونیورسٹی نے جب یہ فیصلہ کیا کہ شعبۂ اردو میں مخطوطات شناسی کا کورس ہونا چاہیے۔ تو سب سے پہلے خلیق انجم نے "متنی تنقید" کے نام سے کتاب مرتب کر دی۔ حال میں ان کی مرتب کتابیں "آثار الصنادید" (سرسید) اور خطوط غالب (غالب) موجودہ تحقیقی مطالبات کو معیار مان کر مرتب کی گئیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ "مرقع دہلی" کی تدوین کا کام کر رہے تھے تو یہ کام ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

دوسری اہم چیز اس کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ یوں تو اس تصنیف کی فارسی عام فہم ہے۔ مگر بعض جگہ پر اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے کہ مصنف کا مخاطب کون ہے اور اشارہ کس کی طرف ہے، مجھے یاد ہے کہ بعض لوگوں نے "سادہ رو" اور "گل رخاں" کے مطالب حسین عورتوں سے لیا ہے حالاں کہ یہاں مراد حسین امرد سے ہے۔
خلیق انجم نے ترجمہ کے آداب کو پوری طرح برتا ہے سادہ انداز بیان ایسا کہ کہیں اشکال نہ پیدا ہو۔
اس سلسلہ کی تیسری اہم بات اس کتاب کے حواشی اور تعلیقات ہیں۔ ہر کتاب کا ترجمہ مطالبہ کرتا ہے کہ جن باتوں کو مصنف نے محض اشاروں میں ادا کیا ہے یا زمانہ کے گزر جانے کی وجہ سے وہ حوالے اور اشارے اجنبی ہو گئے ہیں۔ ان کی اب وضاحت کر دی جائے۔ خلیق انجم نے چوں کہ آثار الصنادید مرتب کی ہے اس لیے اس کتاب کے تعلیقات میں دہلی کی قدیم عمارتوں کے ذکر میں ماضی کو حال سے جوڑ دیا ہے مراد یہ ہے کہ اس عمارت کی قدیم کیفیت کیا تھی۔ اور موجودہ صورتِ حال میں اس کی حالت کیا ہے۔
مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ "مرقع دہلی" کے نسخہ انجم کے متن اور ترجمہ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ مجھ کو یہ بھی امید ہے کہ اس کتاب کی روشنی میں اس عہد پر کام کرنے والے دوسرے لوگوں کو بھی رہنمائی ملے گی۔

رفعت سروش

مرقعِ دہلی

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

اقبال کا یہ شعر ایک کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اندازہ ہوتا ہے کہ شاعرِ مشرق کو تاریخ اور انسان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے عروج و زوال پر کس قدر عبور حاصل تھا۔ یہی وہ دور ہے جب دلی میں حضرت شاہ ولی اللہ اپنی اصلاحی اور انقلابی تحریکات کے ساتھ سرگرم عمل تھے۔ اور ان کے ساتھ ان کے شاگرد

مولانا حسین قلعی مولانا نوراللہ سوہاروی اور مولانا محمد امین کشمیری اور ان سب کے ساتھ ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز سرگرم عمل رہے۔ یہ کتاب "مرقع دہلی" دہلی کے اس دور کی جھلکیاں پیش کرتی ہے۔ جب ہماری قوم شمشیر وسناں سے ہاتھ اٹھا چکی تھی، بابر، اکبر اور اورنگ زیب کی تلواروں کو زنگ لگ چکا تھا۔ نادر شاہ کے حملے نے رہی سہی طاقت بھی سلب کرلی تھی۔ اور بانیتی کا بنیتی قوم نے اپنے حواس مجتمع کرنے کے لیے اپنے وجود کو شراب میں غرق کردیا تھا۔ ارباب نشاط کی ارزانی تھی۔ عوام وخواص نے امرد پرستی جیسے مذموم اور غیر فطری فعل کو جنسی آسودگی کا ذریعہ بنالیا تھا اور ہوس پرستی کے اخلاق سوز مناظر کھلی تفریح گاہوں اور اعراس کی محفلوں میں عام تھے۔ اکثر خانقاہیں عیاشیوں کے مرکز تھیں اور بقول مرتب کتاب ــ"

> "چونکہ اس سماج میں صوفیا کی بہت عزت تھی اس لیے تصوف سماجی عزت و وقار حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ بن گیا اور بدسے بدکردار لوگوں نے اس مسلک کو اختیار کرکے پیسہ کمانے کا ایک بڑا ذریعہ بنالیا۔"

ایسے میں اتفاق سے ایک صاحب درگاہ قلی خاں دہلی وارد ہوئے جون ۱۷۳۸ء میں اور ۲۳ جولائی ۱۷۴۱ء کو نواب آصف جاہ کے ساتھ واپس دکن چلے گئے ــــ اس تین سال کے عرصے میں درگاہ قلی خاں نے دہلی میں انحطاطِ حیات کے جو مناظر دیکھے۔ وہ انھوں نے قلم بند کردیے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کے قلم بند واقعات کی اہمیت تاریخی ہوگئی۔ آج اس تحریر کے چار اہم مخطوطات کا علم ہے اور چاروں کی روشنی میں متنی تنقید کے شہسوار ڈاکٹر خلیق انجم نے فارسی متن کی نوک پلک درست کی اور پھر اس کا اردو ترجمہ کیا۔ اردو ترجمہ اتنا خوبصورت، بامحاورہ اور رواں دواں ہے کہ اس پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد ڈاکٹر خلیق انجم کا پر مغز مقدمہ، حواشی، درگاہ قلی خاں کے حالاتِ زندگی، تعلیقات اور آخر میں اشاریہ۔ ان تمام خصوصیات نے مل کر اس کتاب کو بے نظیر بنادیا ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ ــــ سب کچھ اعلیٰ درجے کا ــــ خلیق انجم صاحب ہر اعتبار سے داد وتحسین کے مستحق ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر اس کتاب کو "مرقع دہلی" کہنے میں قدرے تامل ہے۔ اس لیے کہ باوجود سماجی ابتری اور اخلاقی انحطاط کے دہلی کبھی اتنی یک رخی نہیں رہی جتنی درگاہ قلی خاں کو نظر آئی۔ اصل فارسی متن میں صرف دو بازاروں کا ذکر کیا ہے جن کی رنگا رنگی اور چہل پہل سے دلّی کی عوامی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے ــــ چوک سعداللہ خاں اور چاندنی چوک ــــ اس کے علاوہ چار مقامات ایسے ہیں جو تفریح خانے ہیں اور جہاں کھلم کھلا عیاشیاں ہوتی ہیں۔ چودہ پندرہ مزاروں کا ذکر ہے۔ وہاں اعراس کی محفلوں کا تذکرہ ہے۔ اور اکثر جگہ ارباب نشاط کی موجودگی ہے تقریباً دس گیارہ صوفیوں اور مشائخ کا ذکر ملتا ہے اور نو شاعروں کا جو اس وقت حیات تھے۔ ــــــــ مصنف نے طوائفوں، لونڈوں، مخنثوں کا ذکر خوب مزے لے لے کر کیا ہے۔

ان اربابِ نشاط کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ پھر کچھ گویّے، سازندے اور مرثیہ خواں ہیں، بڑی تعداد میں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس وقت دہلی میں شرفا بالکل ہی ناپید تھے۔ عالمِ دین، دیگر علوم، جیسے تاریخ، نجوم اور علم ہندسہ کے ماہر اور طبیب وغیرہ، قلی خاں شاید دہلی کے اس طبقے تک نہیں پہنچ سکے۔ عمارتیں اگر نظر آئیں تو بس وہی جن سے ضعیف الاعتقادی وابستہ ہے مثلاً قدم شریف، یا کچھ درگاہیں، جو چند مستثنیات کے ساتھ فحاشی اور بدکرداری کا مرکز تھیں۔ کیا درگاہ قلی خاں کی نظر سے قطب الاقطاب کی درگاہ

کے پاس قطب کی لاٹ، جہاز محل اور شمسی تالاب وغیرہ اوجھل ہو گئے تھے۔ کیا توحض خاص، پرانا قلعہ، شیر شاہ کی بنوائی ہوئی مسجد، ہمایوں کا مقبرہ، شاہجہاں آباد کی فصلیں اور دروازے۔ کوٹلہ فیروز شاہ اور سب سے بڑھ کر لال قلعہ، جامع مسجد، مسجد فتحپوری، سنہری مسجد، اور دیگر مساجد، جو آباد تھیں اور جہاں اس دورِ انحطاط میں بھی لوگ نمازیں پڑھتے تھے۔ بالکل ہی غائب ہو گئی تھیں۔ —— کیوں — !! کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ قلی خاں صاحب ایک مخصوص عینک لگا کر آئے تھے۔ ایک مخصوص قسم کی لہو ولعب سے بھرپور زندگی جینے دلّی آئے تھے، اور اپنے مافی الضمیر کو انھوں نے دلّی کے عشرت گاہوں اور عیاشی کے مختلف زاویوں کی مدد سے پیش کیا —— بیشک یہ بھی ایک تصویر ہے مگر یک رخی۔ اگر اٹھارہویں صدی میں دہلی کی عیاشیوں کا حال جاننا ہو تو یہ کتاب بے شک مرقع ہے —— لیکن اگر محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے والوں کا حال جاننا ہو، اگر دہلی کی صنعت وحرفت سے واقفیت حاصل کرنا ہو، اگر شرفائے دہلی سے ملنا ہو، اگر دہلی اور شاہجہاں آباد کی تاریخی عظمت کی سیر کرنا ہو تو مرقع دہلی کا مطالعہ کر کے مایوسی ہوگی۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ مغل حکومت کی کمزوری اور پے بہ پے بیرونی حملوں نے۔ بالخصوص نادر شاہی تلوار نے جو تباہی مچائی تھی اس سے اخلاقی گراوٹ کس قدر آئی تھی۔ اس کی تصویر اس "مرقع دہلی" میں مل جائے گی۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اس کتاب کے حدود میں رہ کر ہی اگر بات کریں تو یہ کتاب "مرقع دہلی" نہ ہونے کے باوجود ایک عمدہ کتاب ہے اور اپنے مصنف کے تخلیقی ذہن کی خوبصورت تحریروں سے مزین ہے۔ جگہ جگہ چونکا دینے والے فقرے اور تشبیہیں ملتی ہیں۔ اور ڈاکٹر خلیق انجم نے اردو ترجمہ کرتے وقت ان کے حسن کو باقی رکھا ہے۔ کچھ مثالیں:

(۱) مرزا بیدل کے بارے میں کہتے ہیں۔ " پرانی دلّی میں آپ کی تربت موزوں ایک چھوٹے سے احاطے میں اس طرح واقع ہے جیسے خوبصورت الفاظ میں معنیٔ خاص موزوں ہوتے ہیں"

اور اس موقع پر ایک سچی اور عوامی تصویر بھی کھینچ گئی ہے۔

" ان کے (مرزا بیدل) کے بھتیجے محمد سعید معنیٔ بیگانہ کی طرح مرزا سے نسبتِ معنوی نہیں رکھتے، حاضرینِ محفل کی تواضع اور محفل میں شمع وچراغ روشن کر کے گویا اپنے دماغ کو جلاتے ہیں۔ مرزا (بیدل) نے بڑی بوٹیوں سے جو معجونیں اور گولیاں اختراع کی تھیں وہ ساری دلّی میں مشہور ہیں انھیں فروخت کر کے (محمد سعید) گذارا کرتے ہیں" درگاہ قلی خاں کے بیان میں محمد سعید کے لیے دبے دبے لفظوں میں ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہی اصل زندگی کی تصویر ہے۔ بلکہ دل دوز تصویر، دل سوز حقیقت۔"

(۲) خلد منزل کی بیوی ہر برس اپنے شوہر کا عرس اس شان سے کرتی ہیں کہ محفل میں ہر طرف خوب صورت لونڈوں کا ہجوم نظر آتا ہے۔ درگاہ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں:

"خباثت کے اسباب اس درجہ موجود ہوتے ہیں کہ دنیا بھر کے بدکار جسمانی لذت حاصل کر سکیں۔ یہاں حالت تو یہ ہے کہ ذرا ہوش میں آئے تو کسی امرد نے آنکھ ماری۔

ابھی اس کے حسن نے آنکھیں روشن کیں کہ کسی بے شرم عورت کا پیغام پہنچا۔"

(۳) "ذکر کیفیت بسنت" میں لوگوں کی بداعتقادی پر خوب صورت طنز کرتے ہیں:

"اس مہینے کی ساتویں رات کو رقاص احدی پورہ میں مدفون ایک عزیز کی قبر پر حاضری دیتے ہیں۔ قبر کو خالص شراب سے دھوتے ہیں اور ساری رات سانس لیے بغیر لگاتار، باری باری رقص و سرود میں مشغول ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ایسی حرکتوں سے مرحوم کو راحت ملے گی۔"

(۴) سجاد خاں گویے کے بارے میں کیا خوب صورت فقرہ لکھا ہے۔

"ایک وقت تھا کہ مشاہیر دہلی میں تھے۔ اب پرانی دلی کی طرح عزت و وقار کھو بیٹھے ہیں۔"

(۵) گھاسی رام پکھاوجی کے فن کی تعریف میں تو گویا شاعری کی ہے۔

"انگلیاں ایسی ملائمت اور آہستگی سے حرکت کرتی ہیں جیسے ہمواری اور سنجیدگی کے ساتھ عقل مندوں کی فکر۔"

(۶) ایک صاحب تقی مخنثوں کے سردار ہیں ان کے پاس اہل ذوق کے لیے ہر طرح کے لڑکے موجود ہوتے ہیں۔ درگاہ قلی خاں نے لڑکوں کے حسن کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔

"گورے رنگ کے لڑکے صبح فطرت کی سفیدی کی طرح خوش رنگ ہیں اور نمکین لڑکے نعمت خانے کے دستر خوان کا نمک ہیں۔"

(۷) سلطانہ نامی ایک بارہ سالہ لڑکے کی نسبت فرماتے ہیں۔

"اگرچہ چراغ کی لَو سے زیادہ نہیں لیکن آفتاب سے ہمسری کے مدعی ہیں۔"

(۸) ایک طوائف مسمی گلاب کی تعریف میں یوں شاعری کرتے ہیں۔

"ان کے گانے کی خوشبو مشام جاں کو معطر کر دیتی ہے۔"

(۹) رحمان بائی مراثن کے حسن اور آواز کا ذکر:

"ان کے چہرے کی سیاہی کو صاحبِ نظر اسی طرح پسند کرتے ہیں جیسے کالی سیاہی سے بنائی گئی تصویر کو ران کی لمبی تان نشتر فصاد کی طرح رگ جاں کو تحریک دیتی ہے۔"

(۱۰) اوما بائی طوائف کی آواز کی تعریف:

"ان کے بے نظیر گانے کی آواز نزہت و نشاط کے پھولوں کا گلدستہ ہے۔"

(۱۱) تنو طوائف کے انداز کی ایک جھلک یوں پیش کرتے ہیں۔

"تنو ناز و ادا سے اپنی پیشانی پر لہراتی ہوئی زلف کی لٹ کی طرح دیکھنے والوں کی جان کو پیچ و تاب میں ڈال دیتی ہیں۔"

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ درگاہ قلی خاں کی طبع رسا کے جوہر اس وقت خوب کھلے ہیں جب انھوں نے لڑکوں اور طوائفوں کی تعریف کی ہے۔ اور ڈاکٹر خلیق انجم کا کمال یہ ہے کہ ترجمہ کو تخلیق کا درجہ دیدیا ہے، معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ سب فقرے جو اوپر پیش کیے گئے کسی دوسری زبان سے اردو کے قالب

میں آئے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے مقدمے میں صحیح فرمایا ہے کہ یہ کتاب اٹھارویں صدی کی تہذیبی زندگی کے سلسلے میں ایک اہم ماخذ کا درجہ رکھتی ہے ۔ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو موسیقی کے بارے میں معلومات فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک کہکشاں ہے موسیقاروں کی جن کی صفات قابل تحسین ہیں۔ اسی طرح اس زمانے کی طوائفوں ، مخنثوں اور لڑکوں کی دلربائی کی داستانیں (مختصر الفاظ میں) جس انداز سے پیش کی گئی ہیں۔ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر صاحب نظر کو کرنا چاہیے کہ ایک دور کا ایک مخصوص شعبۂ حیات زندہ اور متحرک سامنے آجاتا ہے۔

کتاب کی طباعت نہایت معیاری ہے اس لیے قیمت ۱۶۰ روپے زائد نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسلم پرویز

مرقّعِ دہلی

انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم یوں تو اپنے مزاج اور اپنی منصبی ضروریات کے تحت زبان اور ادب کے مختلف شعبوں میں اپنی قلمی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن جو لوگ ان کی ادبی حیثیت سے واقف ہیں وہ یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ ان کی خصوصی دل چسپی کا میدان شروع ہی سے تحقیق اور تدوین رہا ہے اور اس کام کی بھرپور داد انھیں "مرزا محمد رفیع سودا" "غالب اور شاہانِ تیموریہ" "آثار الصنادید" اور "خطوط غالب" جیسے کاموں کے ذریعے مل بھی چکی ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے انھوں نے اپنی دل چسپی کا ایک نیا میدان دریافت کیا ہے۔ یعنی دلّی کے آثارِ قدیمہ اور مغلوں کے آخری عہد کی دلّی کی ثقافت اور تہذیب جس کا ملا جلا نام سرسید نے آثار الصنادید رکھا تھا۔ خلیق انجم کی اس خصوصی دل چسپی کے حوالے سے ان کے جن ادبی کاموں کا نام لیا جا سکتا ہے ان میں سرسید کی "آثار الصنادید" کی ترتیب نو جسے بجا طور پر تدوینِ متن کا ایک کارنامہ کہا جا سکتا ہے اور ان کی دو اور کتابیں "دلّی کے آثار قدیمہ" اور "دلّی کی درگاہ شاہ مرداں" شامل ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ان کی تازہ کتاب جس کے وہ مرتب اور مترجم ہیں، درگاہ قلی خاں کی "مرقع دہلی" ہے اور یہاں فی الحال اسی کتاب کا تذکرہ مقصود ہے۔

"مرقع دہلی" عہدِ محمد شاہ سے متعلق درگاہ قلی خاں کی ایک اہم فارسی تالیف ہے۔ یہ کتاب درگاہ قلی خاں کے تین سالہ قیام دہلی یعنی ۱۷۳۸ تا ۱۷۴۱ عیسوی سے متعلق ہے۔ اسی دوران نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا جس کی حشر سامانیوں کا نظارہ درگاہ قلی خاں نے اپنی آنکھوں سے کیا۔ تاہم جیسا کہ خلیق انجم نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے "مرقع دہلی" کے مشمولات میں نادر شاہی حملے کا ذکر سانحۂ نادر شاہ کے نام سے

بس ایک دو بار ہی آیا ہے وہ بھی سرسری طور پر۔ "مرقع دہلی" میں درگاہ قلی خاں کی توجہ کا مرکز دراصل محمد شاہی عہد کی وہ دہلوی تہذیب رہی ہے جس میں ایک طرف طرح طرح کے باکمال یہاں موجود تھے۔ اور دوسری طرف وہ رقاصائیں تھیں جو دہلی کی محفلوں کی جان تھیں۔ چناں چہ دلی کی عیش و عشرت کی اس تفسیر کا اختتام، جس سے درگاہ قلی خاں شاید خود بھی لطف اندوز اور محظوظ ہوئے ہوں گے، وہ اس جملے پر کرتے ہیں:

• بہر حال اگر وصال نہ ہو تو اس کا خیال ہی سہی اگر خورشید نہ ہو تو ہلال ہی سہی۔ عیش کا ذکر بھی نصف عیش ہوتا ہے۔"

خلیق انجم کی مرتبہ و مترجمہ "مرقع دہلی" کی موجودہ اشاعت سے قبل "مرقع دہلی" مختلف شکلوں میں پانچ بار شائع ہو چکی ہے۔ موجودہ کتاب کے مقدمے سے پتا چلتا ہے کہ "مرقع دہلی" کو پہلی بار حکیم سید مظفر حسین نے ۱۹۲۶ء میں سالار جنگ میوزیم میں محفوظ اس کتاب کے ان دو مخطوطوں کی بنیاد پر شائع کیا تھا جن میں سے ایک ۲۰ شعبان ۱۱۸۵ ہجری کا اور دوسرا ۲۶ شوال ۱۲۳۱ ہجری کا ہے۔ پہلے مخطوطے پر کتاب کا نام "سفرنامہ درگاہ قلی خاں" اور دوسرے پر "انشائے درگاہ قلی خاں" درج ہے۔ بعد میں خواجہ حسن نظامی نے "پرانی دہلی کے حالات" کے نام سے اسی متن کی اردو تلخیص شائع کی۔ ۱۹۸۱ء میں پروفیسر نورالحسن انصاری نے سالار جنگ میوزیم کے دونوں نسخوں کی بنیاد پر "مرقع دہلی" کا تنقیدی اڈیشن تیار کیا جس میں اس کا اردو ترجمہ بھی شامل تھا۔ اس اردو ترجمے سے متعلق خلیق انجم نے اپنے مقدمے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس میں اکثر مقامات پر بے احتیاطی سے کام لیا گیا ہے اور غالباً یہی فارسی متن کے موجودہ اردو ترجمے کا جواز ہے۔ ۱۹۸۹ء میں چندر شیکھر اور شیاما مترا نے "مرقع دہلی" کا انگریزی ترجمہ بسیط مقدمے اور حواشی کے ساتھ شائع کیا جس کا پیش لفظ مغربی بنگال کے سابق گورنر پروفیسر نورالحسن مرحوم نے لکھا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "مرقع دہلی" کی ان اشاعتوں کے بعد اس کی موجودہ اشاعت کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے خلیق انجم نے ایک اہم بات یہ کہی ہے کہ "مرقع دہلی" کا موجودہ متن تیار کرتے ہوئے انھوں نے اس کے دو اور ایسے نسخوں کو بھی سامنے رکھا ہے۔ جن سے اب تک استفادہ نہیں کیا گیا تھا۔ ان میں ایک نسخہ ۱۲۱۴ ہجری کا ہے۔ جو بمبئی کے آر کے کاما انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہے اور دوسرا لندن کی برٹش لائبریری کا ہے جو ۱۱۹۸ ہجری کا ہے۔ چناں چہ خلیق انجم نے حکیم سید مظفر حسین کے متن کو بنیاد بناتے ہوئے۔ جو سب سے قدیم ہے۔ بقیہ کے اختلاف نسخ حواشی میں درج کر دیے ہیں۔

خلیق انجم نے اپنے مقدمے میں اس کتاب کے نام "مرقع دہلی" سے متعلق بھی ایک دل چسپ انکشاف کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ کتاب کا یہ نام دراصل اس کے پہلے مرتب حکیم سید مظفر حسین نے قائم کیا تھا۔ خود درگاہ قلی خاں نے اس کا کیا عنوان رکھا تھا یہ امر تصدیق طلب ہے۔ متن کے چار نسخے چار مختلف عنوانات کے ساتھ مختلف کتب خانوں میں ملتے ہیں جو اس طرح ہیں: ایک "سفرنامہ درگاہ قلی خاں"۔ دو "انشائے درگاہ قلی خاں"۔ تین "آبادی دہلی و مجملی احوال و تاریخ ایران و ہند"۔ اور چار "رسالہ سالار جنگ"۔ بہر حال خلیق انجم نے بھی یہاں "مرقع دہلی" ہی کے رائج نام کو ترجیح دی ہے۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی

مرقّعِ دہلی

ڈاکٹر خلیق انجم اردو کے معتبر محقق، ممتاز نقاد اور معروف مجاہد اردو ہیں۔ موصوف کی دو درجن سے زائد کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ادب کی نگاہوں کا سرمہ بن چکی ہیں۔ اگرچہ وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کے اہم ترین عہدے پر فائز ہیں اور مختلف النوع سرگرمیوں میں بے حد معروف رہتے ہیں لیکن تحقیق و تنقید کے شعبوں میں جولانیٔ طبع کے جوہر دکھاتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک سیلف میڈ مجاہد ہیں اور اپنی محنت، ریاضت، لگن اور دھن کے باعث اردو ادب کی تاریخ میں اہم ترین مقام حاصل کر چکے ہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ موصوف ایک بلند پایہ و دیدہ ور ادیب ہونے کے ساتھ نہایت منکسر المزاج اور خلیق انسان بھی ہیں ـــــ ھذا نظر بد سے بچائے، سچ ہے کہ ایسی دیدہ ور ہستیاں بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہیں۔

"مرقع دہلی" نواب درگاہ قلی خاں کی تالیف ہے جو محمد شاہ کے عہد میں لکھی گئی اور بہ قول ڈاکٹر خلیق انجم اٹھارہویں صدی عیسوی کی دلی کی سماجی اور تہذیبی زندگی کا اہم ترین فارسی ماخذ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نادر شاہ نے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ شاہی خزانے اور امرا و رؤسا کی دولت کو سینکڑوں اونٹوں پر لاد کر لے گیا تھا۔ مغل حکومت تقریباً دو صدیوں میں کمائی ہوئی دولت و طاقت اور عزت و شوکت کھو چکی تھی۔ تخت طاؤس اور کوہ نور جیسی بیش قیمت اشیا پر نادر شاہ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ جن عظیم بادشاہوں کا جاہ و جلال تاریخ میں ضرب المثل تھا، ان کے وارث بے بسی اور لاچاری کی دردناک تصویر بنے ہوئے تھے۔

مؤلف نے کتاب میں جو اہم معلومات یکجا کی ہیں وہ کہیں اور نہیں ملتیں۔ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی پھر اس کے دو اڈیشن اور چھپے جن میں فارسی متن کے ساتھ اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے اس کی اردو تلخیص اور ڈاکٹر چندر شیکھر اور شاما مترا نے انگریزی ترجمہ شائع کیا۔

پیش نظر اڈیشن ڈاکٹر خلیق انجم نے متنی تنقید کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا ہے جس کی بنیاد چار مخطوطات پر ہے۔ انھوں نے اس اڈیشن کے آغاز میں ایک طویل اور فکر انگیز مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے دہلی کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی حالات کا جائزہ تفصیل سے لیا گیا ہے ساتھ ہی نواب درگاہ قلی خاں کے مستند سوانح کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"مرقع دہلی کے چار مخطوطوں، مطبوعہ اڈیشنوں، اردو تلخیص اور انگریزی ترجمے کی تفصیلات

بیان کی ہیں۔ متن کے اختلافات نسخ پیش کیے گئے ہیں۔ متن کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے۔ آخر میں ان افراد اور مقامات پر حواشی لکھے گئے ہیں، جن کا ذکر متن میں آیا ہے۔"

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے "مرقع دہلی" کی ترتیب، ترجمے اور حقائق کی تلاش میں بڑی محنت، جانفشانی اور دیدہ ریزی کا ثبوت دیا ہے۔ اور اس اہم ماخذ کو ایک بیش قیمت و خوب صورت تحفے کی شکل میں منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے بقول "مرقع دہلی" صرف ایک ایسی کتاب نہیں ہے، جس میں اس عہد کی عیاشیوں گانے والوں اور رقاصاؤں کا ذکر ہے۔ یہ سیاسی اور اخلاقی زوال کی آخری منزل پر پہنچے ہوئے سماج کی تصویر بھی ہے۔"

"مرقع دہلی" کی افادیت و اہمیت کا صحیح اندازہ تو اس کے مطالعے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ درج ذیل ایک مثال سے مصنف کے طرز تحریر و اسلوب نگارش کی جھلک عیاں ہو جاتی ہے۔ نواب درگاہ قلی خاں 'قدم شریف' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آب و رنگ گلشن دہلی بر میامن برکات قدم شفاعت توام جناب حضرت نبوی صلی اللہ علیہ آلہ وسلم است کہ گرد ش آستانش توتیائی ارباب بصیرت است و غبار راہش مایہ اہل فطرت۔ جبہ عاصیان از کثرت سجود آئینہ دار امتیاز و دیدہ حاجت مندان بدر یوزہ گری خاک جنابش سرمہ طراز۔ بارگاہ کیوان پایگاہش واجب التعظیم و علی الدوام کافہ انام سرگرم مجرا و تسلیم۔"

اور اس عبارت کے ترجمہ سے، ترجمہ نگار کی زبان و بیان کی روانی، رعنائی، شگفتگی اور شستگی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے:

"آنحضرت رسول صلے اللہ وآلہ وسلم کے شفاعت بخشنے والے قدم کی برکت سے گلشن میں رونق ہے (قدم شریف کی درگاہ کے) آستانے کی گرد ارباب بصیرت کی آنکھ کا سرمہ اور اس کے راستے کا غبار اہل دانش و بینش کی دولت ہے۔ گنا ہگاروں کی پیشانیاں اس آستان پر کثرت سجود سے آئینہ دار امتیاز اور حاجت مندوں کی آنکھیں اس چوکھٹ کی دریوزہ گری سے سرمہ طراز ہیں۔ وہ بارگاہ جس کی ڈیوڑھی مرتبے میں ساتویں آسمان کے برابر ہے، واجب التعظیم ہے اور (یہاں) ہر شخص ہمیشہ سرگرم مجرا و تسلیم رہتا ہے۔"

'مرقع دہلی' کے نام کے بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی تحقیق ہے:

"سالار جنگ میوزیم لائبریری کے ایکسیشن رجسٹر میں پہلے مخطوطے (سفر نامہ ۲) کا نام 'سفر نامہ درگاہ قلی خاں' درج ہے اور یہ مخطوطہ سفر ناموں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ دوسرا مخطوطہ 'ادبی نثر' کے تحت (ادبی نثر ۳۱) درج کیا گیا ہے اور اس کا نام "انشائے درگاہ قلی خاں" لکھا گیا ہے۔ تیسرا مخطوطہ آر کے کاما انسٹی ٹیوٹ بمبئی کی لائبریری کے ملا فروز کلیکشن میں محفوظ ہے۔ فہرست میں اس کا نام "آبادیٔ دہلی و مجلی احوال نادر شاہ و تاریخ ایران و ہند" چوتھا مخطوطہ برٹش لائبریری میں محفوظ ہے۔ کیٹالاگ میں اس کا نام "رسالہ سالار جنگ" اور تتمے میں تذکرہ سالار جنگ مرحوم" درج ہے۔ حکیم سید مظفر حسین نے یہ کتاب "مرقع دہلی" کے نام سے

شائع کی ہے۔ بیرونی ٹائیٹل پر انھوں نے کتاب کا نام "دہلی بارہویں صدی ہجری میں" اور اندرونی ٹائیٹل پر "مرقع دہلی" لکھا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ یہ نام یعنی مرقع دہلی "خود حکیم صاحب ہی نے رکھا ہے۔ چوں کہ یہ نام بہت خوبصورت ہے اور اس کتاب کے لیے بہت مناسب ہے اور پھر اس نام سے یہ کتاب بہت مشہور ہو چکی ہے اس لیے میں بھی اسی نام سے شایع کر رہا ہوں۔"

آخر میں مرتب کے بہ قول یہ کہنا ہی کافی ہے کہ

"غرض یہ کہ نواب درگاہ قلی خاں کی "مرقع دہلی" اٹھارہویں صدی عیسوی کی دلّی کی سیاسی، سماجی، ادبی اور خانقاہی حالات کی داستان ہی نہیں بلکہ اس ذہنی کرب کی تفصیل بھی ہے جس سے سیاسی زوال کے شکار دلی والے گزر رہے تھے۔ "مرقع دہلی" کے مطالعے سے ہمارے ذہن میں اس عہد کے لوگوں سے نفرت اور حقارت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ زوال کی کشتی پر سوار ان لوگوں سے دلی ہمدردی پیدا ہوتی ہے جو انتہائی بے بسی اور لاچاری کے عالم میں کشتی کے ڈوبنے اور اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔"

"مرقع دہلی" حسن کتابت، حسن طباعت اور حسن ادارت کا دیدہ زیب مرقع ہے۔ اور دیدۂ عبرت نگاہ کے مطالعے کی چیز۔ یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی دیگر تصانیف و تالیفات کی طرح اسے بھی قبولِ عام کا درجہ حاصل ہو گا۔

متین امروہوی

ڈاکٹر خلیق انجم کی نذر

(قطعہ ۱)

کارنامے ادب کی دنیا میں
ہیں نمایاں خلیق انجم کے
یوں تو یہ ہر زبان کے قائل ہیں
عشق اِن کو مگر ہے اُردو سے

(قطعہ ۲)

آپ نے اُردو گھر کیا تعمیر
یہ ہے غالبؔ کے خواب کی تعبیر
روحِ اقبالؔ اس میں رہتی ہے
بام و در پہ ہے میرؔ کی تصویر

علی جواد زیدی

حسرت موہانی از ڈاکٹر خلیق انجم

مولانا حسرت موہانی مجاہد آزادی، شاعر، صحافی، عالم، صوفی اور عظیم انسان تھے۔ ان کی تمام زندگی ایک جہاد تھی، ان کی آواز ایک انقلابی کی آواز تھی اور ان کی شاعری، بے لوث اور بے خوف عاشقی کا ترانہ۔ وہ بے شمار خوبیوں کے پیکر، لیکن بے پناہ سادگی اور نفس کشی کے مثالی کردار تھے۔ سیاست میں اشتراکی اور طبیعت میں یوگی تھے۔ وہ اٹل عزم و ارادے کے مالک تھے لیکن کسی ایک سیاسی جماعت سے وابستہ ہو کر نہ رہ پائے کیونکہ ان کی بے لچک اصول پرستی کسی پلیٹ فارم پر ٹکنے نہ دیتی تھی۔ وہ بڑے خوش عقیدہ اور سچے مسلمان تھے لیکن ہر سال کرشن جنم کے تیوہار میں شرکت کرنے کے لیے متھرا ضرور جاتے تھے۔ کئی بار حج و زیارات کی سعادت بھی حاصل کی۔ وہ ہندوستانی سیاست میں تلون مزاجی کے باوجود صف اول کے لیڈر تھے۔ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے رکن بھی اور اہم ترین سیاسی جماعتوں سے وابستہ بھی لیکن اس سوانگی شاہی کے باوصف ایک درویش صاف باطن سے

پیدا کہاں اب ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

دراصل بزرگ ہستیوں میں جو ہمہ جہاتی کیفیت ہوتی ہے، اسی کو لوگ پراگندگی طبع سمجھ لیتے ہیں، اور جب ہوش آتا ہے تو افسوس کرتے ہیں کہ ان کو ان کا حق نہیں ملا۔ حسرت کی شخصیت، جس پہلو سے بھی دیکھی جائے عظیم الشان ہے۔ اس عظمت کو اجاگر کرنے کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کی تازہ ترین تصنیف "حسرت موہانی" ایجاز و تفصیل کا کامیاب ترین امتزاج ہے۔ اب تک "حسرت موہانی" کی سوانح حیات میں یہ سب سے نمایندہ اور متوازن کتاب ہے۔

حسرت جیسی متنوع شخصیتوں کے سوانح حیات کا جائزہ لینا آسان نہیں ہے۔ خود حسرت کو اپنی طبیعت کی طرفگی کا احساس تھا۔ ع "اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی"

سوتیت آپ کا مقصد بغاوت آپ کا مسلک
مگر اس پر بھی حسرت کی غزل خوانی نہیں جاتی

وہ تو چکی پیستے وقت بھی مشق سخن جاری رکھتے تھے۔ چکی کی مشقت کو وہ حصول مدعا کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ اتھل پتھل سے گھبرانے والے کب تھے۔

اے حسرت جلد کر تہ و بالا زمیں کو
کچھ بھی نہ ہو، امید تو ہے انقلاب میں

طبیعت کے اس کرب و بے چینی کو منتخب سوانح حیات کے سانچے میں ڈھالنا مشکل کام تھا۔ لیکن خلیق انجم نے

اس حسن وخوبی سے انجام دیا ہے کہ مولانا کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آگئی ہے۔ یہ تصویر "جیتی جاگتی" ضرور ہے لیکن ہر پہلو پوری طرح حاوی نہیں۔ اس میں قصور خلیق انجم کا نہیں بلکہ سرکاری مطبوعات کی تنگ دامنی کا ہے۔ وہاں لال فیتہ ہر چیز پر حاوی ہوجاتا ہے۔ پہلے ان سے سو ڈیڑھ سو صفحوں پر کتاب لکھنے کو کہا گیا۔ خلیق انجم نے مواد کے طویل حجم کو دیکھتے ہوئے صفحات کی کمی کو محسوس کیا۔ پبلی کیشنز ڈویژن نے بڑی رعایت کی کہ تین سو صفحات کی اجازت دے دی۔ مصنف نے بہت کھینچ تان کی پھر بھی تین سو صفحے سے بڑھ ہی گئے، اس لیے خلیق انجم کی لفظوں ہی میں "مجبوراً حسرت کی سیاسی زندگی اور تنقیدی حصے کو کم کرنا پڑا۔" اس لیے یہ کتاب مولانا کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے باوجود تشنۂ تکمیل رہ گئی۔ مجبوری کا نام صبر ہے لیکن اس کتاب میں یہ مژدہ جانفزا موجود ہے کہ ایک علیحدہ کتاب لکھ کر خلیق انجم اس جبری کمی کی تلافی کردیں گے۔ مواد انھوں نے جمع کر لیا ہے۔ لال فیتہ اصل میں ٹیپ سے کر بیٹھتا ہے۔ دوسروں کے لیے جتنے صفحے دیے گئے ہیں بعینہٖ اتنے ہی حسرت کو بھی دیے جائیں۔ اس میں رعایت حاشیائی ہی کی جا سکتی ہے۔ لال فیتہ تو مطمئن ہوجاتا ہے لیکن مصنف اور قاری دونوں ہی پوری طرح مطمئن نہیں ہو پاتے۔ حسرت ہمارے بیحد اہم سیاسی رہنما رہے، وہ اتنے ہی بڑے شاعر بھی تھے کہ "امام المتغزلین" کہلائے۔ ان کی نئی روش قابلِ تقلید قرار دی گئی۔ مولانا کے "اردوئے معلّی" کو ہماری تاریخِ صحافت کا اہم باب مانا گیا ہے۔ ان کے سوانح کو دو جلدوں میں مرتب کرنا ہی چاہیے تھا۔ یہ سب اس لیے زور دے کر لکھ رہا ہوں کہ اس اجباری اختصار کے باوجود مصنف نے جو سوانح پیش کیے ہیں وہ حسنِ ترتیب و ایجاز کا کارنامہ ہیں اور ادبی تحقیق کا قابلِ تقلید نمونہ۔

سوانح حسرت کا شاندار باب مولانا کی رفیقۂ حیات کی داستان زندگی ہے۔ نشاط النسا بیگم پہلی مسلمان خاتون ہیں جو جنگ آزادی میں ہمت و بہادری سے شریک ہوئیں اور پردے تک کو خیرباد کہا۔ اہم ترین قومی پلیٹ فارموں سے اپنے شوہر کی تائید کی اور حکومت وقت سے ٹکر لی۔ حسرت بار بار جیل گئے۔ جیل کے باہر کی زندگی بھی مصیبتوں بھری تھی، شوہر کے جیل چلے جانے کے بعد انھوں نے حسرت کے امور خانہ داری اور کاروبار کو بڑی کامیابی سے سنبھالا اور ان کے سیاسی کام کو بھی آگے بڑھاتی رہیں۔ ملک کے عظیم رہنماؤں سے رابطہ قائم رکھا۔ زبان کبھی شکوہ و فطانت سے آشنا نہیں ہوئی بلکہ بڑی دلداری سے حسرت کا دل بڑھاتی رہیں۔ یہ داستان خلیق انجم نے بڑی ہمدردی اور امور خانہ ایمان داری سے سنائی ہے اور اس عظیم خاتون کے کارناموں سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔ نشاط النسا بیگم کا کردار سمجھے بغیر حسرت کی شخصیت کے تمام خدوخال اپنی پوری دلکشی سے نمایاں نہیں ہو سکتے۔ ایک کمی یہ ضرور محسوس ہوئی کہ دو جگہ دوسری بیوی کا ذکر ہوا ہے لیکن اس سلسلے میں کتاب مصلحت یا بضرورت خاموش ہے۔

حسرت کے سوانح نگاروں نے مولانا کی سیاسی سرگرمیوں کی ابتدا کے بارے میں جو بیانات دیے ہیں ان سے خلیق انجم نے مدلل طور پر اختلاف کیا ہے۔ عام بیانات میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش ہے کہ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے سیاست میں دلچسپی لینے لگے تھے بلکہ بعض تو سیاسی تحریکوں سے دلچسپی کی بات بھی کرگزرتے ہیں۔ خلیق انجم نے ان بیانات کو "انشا پردازی اور مبالغہ آرائی" سے تعبیر کیا ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا ہے کہ "طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ حسرت برطانوی حکومت کے خلاف تھے۔" اس سچائی سے انکار ناممکن ہے۔ لیکن حسرت نے حکومت برطانیہ کی موافقت

بھی تو نہیں کی۔ انیسویں صدی کے آخر میں حسرت کیا، کسی بھی سیاسی جماعت کا لیڈر تاج برطانیہ کی مخالفت نہیں کرتا۔ خود کانگریس کے ابتدائی اجلاسوں میں اس تاثر کو دور کرنے کے لیے تقریریں کی جاتی تھیں کہ کانگریس حکومت کی مخالف ہے۔ مراعات و اصلاحات پر زور دیا جاتا تھا۔ سن ستاون کے بعد مسلمانوں کی قیادت کے ایک طبقے میں مخالفت کا ایک جذباتی پہلو ضرور کبھی کبھی ابھر آتا تھا لیکن اس کا کوئی علیحدہ کھلا پلیٹ فارم نہیں تھا۔ بحیثیت مجموعی ساری سیاسی فکر اصلاحات کے محور پر گردش کرنے لگی تھی۔ یہی وہ خطوط تھے جن پر ہیوم کے تخیل کی کانگریس نے تعلیم یافتہ طبقے کو ڈھالنا چاہا۔ انگریزوں کی مخالفت کا ایک جذبہ دبا ہوا اور بے سمت، عوام میں ضرور تھا لیکن عام سیاست داں اور سفید کار طبقے میں بہت مدھم ہو چلا تھا۔ پھر بھی انگریزی تعلیم ہی کی بدولت، یہ مخالفت جذبۂ حب وطن کے سانچے میں ڈھل رہی تھی اور نیا تعلیم یافتہ طبقہ نیم سیاسی تصورات کے ساتھ آہستہ آہستہ حکومت، خود اختیاری زیر سایہ تاج برطانیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی لے احتجاجی نہیں تھی۔ محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے پنجاب میں نئی نظم کی جو تحریک چلائی تھی اس میں بھی جذبۂ حب وطن کی حیثیت بنیادی تھی، طفیلی نہیں تھی۔ احتجاج بلکہ تشدد تک کی رو تقسیم بنگال کے وقت سے ابھری۔ ہندوستان کے باہر راجہ مہیندر پرتاپ سنگھ، مولانا برکت اللہ بھوپالی اور مولانا عبیداللہ سندھی نے حکومت موقتہ ہند قائم کرنے کے جو خواب دیکھے تھے، اس نے دلوں میں نئی جوت جگادی تھی، ہندوستان میں کوئی متوازی تحریک نہیں تھی لیکن اس جوت کو حسرت موہانی جیسے حساس ذہنوں نے محسوس ضرور کیا ہو گا امکان ہے۔ "اور" اردوئے معلیٰ" میں ۱۹۰۳ء سے ایک ہلکا سا پرتو نظر بھی آنے لگتا ہے۔ لیکن یہ شہادت اس اعلان کے لیے کمزور ہے کہ اس دور میں حسرت واقعتہً سیاست میں دل چسپی لینے لگے تھے۔

ان کی صاحبزادی رابعہ بیگم کا یہ بیان کہ حسرت "تین بار نعرۂ حریت بلند کرنے پر پرانے ایم اے او کالج سے نکالے گئے تھے"۔ چشم دید تو ہرگز نہیں تھا۔ معلوم نہیں کہ انھوں نے کس سے اور کیا سنا؟ یہ بھی صاف نہیں ہے کہ انھوں نے تین بار نعرہ لگایا یا تین بار نکالے گئے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ کالج سے ایک بار نکالے جانے کا ذکر ان کے ہم عصر خانی خاں (سجاد حیدر یلدرم) نے ضرور کیا ہے۔ لیکن یہ سیاسی سزا یا بی نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ سزا دینے کے لیے مشاعرے اور باغ تاراجی کے واقعات کو بہانہ بنا کر سیاسی اسباب کا اخراج ہوا ہو لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ایک اچھے اور سچے محقق کی طرح خلیق انجم نے یہ محتاط فیصلہ دیا ہے کہ اس دور میں سیاست سے دل چسپی لینے کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا اور کالج سے تین بار اخراج تو ہرگز نہیں ہوا۔

ایم، اے، او کالج کے پرنسپل بک کا مرثیہ اور ان کے جانشین ماریسن کی مدح، انگریز نوازی کی مثالیں نہیں ہیں بلکہ استاد پرستی کی ہیں۔ حسرت کا یہ شعر تو گواہی دیتا ہے کہ حسرت ان دونوں کی اسلام دوستی سے متاثر تھے۔

آپ کا اسلام پر احسان سارے دیکھ کر
ہر مسلماں خود بخود ممنونِ احساں ہو گیا

مختصر یہ کہ یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں حسرت نے نہ تو سیاسی تحریکوں میں حصہ لیا

اور نہ باغیانہ خیالات کا اظہار کیا۔ ۱۹۰۳ء سے "اردوئے معلیٰ" کے بعض اندراجات سے حسرت کے ابتدائی سیاسی رجحانات کا گوشہ ضرور نکلتا ہے۔ لیکن یہ رجحانات کانگریس کے نرم دل کے خیالات سے مختلف نہیں تھے۔ وہ سرسید کے سیاسی خیالات سے بھی متفق نہیں تھے اور کانگریس سے علیحدہ رہنے کے مشورے کے بھی خلاف تھے۔ (دیکھئے "اردوئے معلیٰ" ستمبر ۱۹۰۴ء)

مکمل آزادی کا نعرہ حسرت نے اس وقت بلند کیا جب دوسرے گھبراتے تھے۔ انھوں نے جب احمد آباد کانگریس میں یہ رزولیوشن پیش کرنا چاہا تو گاندھی جی نے بنفس نفیس اس کی مخالفت کی اور اس مخالفت کی وجہ سے یہ رزولیوشن پاس نہ ہو سکا۔ حسرت ہارے نہیں بلکہ مسلم لیگ، خلافت کانفرنس غرض جو پلیٹ فارم بھی ملا وہاں وہ یہی نعرہ بلند کرتے رہے۔ کانگریس نے ۱۹۲۹ء میں اسے قبول کیا اور سبھاش چندر بوس ناقل ہیں کہ یہ رزولیوشن کسی اور نے نہیں بلکہ خود گاندھی جی نے پیش کیا تھا۔ پورن سوراج اور مکمل آزادی کے نعروں کے سلسلے میں حسرت اور تلک کا نام تاریخ ہند سے کبھی مٹایا نہیں جا سکے گا۔ اور کوئی دوسرا ان کی ہم سری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکے گا خلیق انجم نے یہ حکایت بڑی تفصیل سے اور جذباتی ہم آہنگی کے ساتھ پیش کی ہے نشاط النساء بیگم کی داستان کی طرح یہ داستان بھی ذہنوں پر نہ مٹنے والے نشان چھوڑ جاتی ہے۔

اگر تحریک آزادی کا نقطۂ آغاز پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کو مانا جائے تو حسرت کے علاوہ دوسرے اردو صحافی بھی مل جائیں گے۔ جو برطانوی غیظ وغضب کا شکار ہوئے۔

ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ حسرت و آزاد سے پہلے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کانگریس سے دامن بچائے ہوئے تھی، لیکن صورت حال ایسی بھی نہ تھی جیسی کہ مولانا سید سلیمان ندوی کے بیان سے ٹپکتی ہے:

> "ایک مدراس کے سید محمد کا نام کانگریس میں کبھی کبھی سنائی دیتا تھا۔ یا جسٹس طیب جی کا خیال کبھی کبھی ظاہر ہوتا تھا۔ مولانا شبلی مرحوم خیال کی حد تک کانگریس کے ساتھ تھے۔"

خود کانگریس، شروع شروع میں عوامی جماعت نہیں بلکہ ایک مختصر سے تعلیم یافتہ حلقے میں محدود تھی جس میں بیشتر وکیل بیرسٹر شامل تھے۔ گاؤں گاؤں شہر شہر میں اس کی شاخیں نہیں تھیں۔ رکنیت کا لمبا چوڑا جال نہیں تھا۔ بس سال میں ایک بار اجلاس ہو جاتا تھا۔ اور وہ بھی پریسیڈنسی شہروں میں، یعنی کلکتہ، بمبئی، مدراس میں سمٹا ہوا۔ اس کا پہلے سے کوئی کانسٹی ٹیوشن بھی نہیں تھا۔ ریاستوں میں موجودہ یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، پنجاب اور دلّی کے بڑے شہروں سے کچھ مندوب آجاتے تھے۔ چوتھا اجلاس پہلی بار پریسیڈنسی شہروں کے باہر الٰہ آباد میں ہونا قرار پایا۔ بنگال کے مسلمان، سرسید کی قیادت کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسرے شکوک کی بنا پر پہلی کانگریس میں گویا شریک نہیں ہوئے۔ بس دو مندوب مسلمان تھے۔ لیکن کل مندوبین کی تعداد ہی ، تھی اور یہ بھی انفرادی حیثیت سے آئے تھے۔ ان میں ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، جین سب تھے۔ برطانوی باشندے بھی تھے۔ لیکن دوسرے اجلاس کانگریس (کلکتہ، ۱۸۸۶ء) میں شریک ہونے والے مسلم مندوبین کی تعداد بڑھ کر ۳۳ ہو چکی تھی اور ان میں انجمن اسلام بمبئی کی طرح کے اداروں کی نمائندگی تھی۔ اسی زمانے میں سرسید نے کانگریس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ مسلم مندوبین میں رحمت اللہ محمد سیانی (بمبئی)، شرف الدین (بہار)،

نواب محمد رضا علی خاں (لکھنؤ) حامد علی خاں بیرسٹر (لکھنؤ) خواجہ عبدالعلیم (ڈھاکہ) نے تمام کارروائیوں میں عملی دلچسپی لی اور تقریریں بھی کیں۔ اگلے سال مدراس میں مسلم مندوبین کی تعداد ۸۳ پہنچ چکی تھی۔ بدرالدین طیب جی تو صدر ہی تھے خاندان شیر میسور ٹیپو سلطان کے چشم و چراغ خاں بہادر میر ہمایوں جاہ تھے۔ انھوں نے شرکت کے علاوہ تمام مندوبین کے قیام کے لیے اپنے تین عالیشان مکانوں میں انتظام کیا تھا۔ ان کے علاوہ شیخ احمد حسین مذاق تعلقہ دار ہریانواں (اودھ)، جو صاحب تصانیف بھی تھے۔ سید عبداللطیف (سیلم)، مرزا محمد علی وکیل (آگرہ)، پیرزادہ سید حبیب صاحب بلگام خلیفہ سید محمد میر (ناگور)، پیش محمد امام مرکباد (سیلم)، ڈاکٹر سید محمد حسین غوث (چنوبا منگلی)، سید محمد تکی (علی گڑھ)، حافظ محمد ابراہیم وکیل (علی گڑھ)، سید مرتضیٰ (دھراپورم)، خاندان نواب سولی بیتم کے مرزا جمیع الدین خاں سخان بہادر حاجی محمد عبیداللہ بادشاہ (انجمن مفید اسلام (ٹربلی)) اور اعظم گڑھ (احمد پور گھوسی) کے محمد حسین علی مختلف علاقوں اور طبقوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ یہ بات خصوصیت سے ذکر کرنے کے لائق ہے کہ ۱۸۸۷ء کے اجلاس کانگریس میں خود علی گڑھ کے دو مندوب شریک ہوئے تھے۔ اور شرکت کانگریس کے معاملے میں مولانا حسرت موہانی کے پیش رو تھے۔ اس لیے یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ علی گڑھ کانگریس کی تحریک سے کلیۃً کنارہ کش تھا۔ وہاں کنارہ کشی کا سوال ضرور اٹھ پڑا تھا۔ لیکن ایک چھوٹا ہی سا حلقہ سہی کانگریسی خیالات کا بھی تھا یہ اور بات ہے کہ ہمارے مورخین اور صحافیوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ یہ گوشہ بہر حال مزید تحقیق کا طالب ہے۔ مندوبین میں سید مرتضیٰ صاحب قادری اخبار "جریدۂ روزگار" رائے پیٹھ کے ایڈیٹر بھی تھے۔ اگر اس اخبار کا کوئی شمارہ مل جائے تو شاید اس سلسلے پر مزید روشنی پڑے۔ ایک بات اور ظاہر ہوتی ہے کہ مندوبین میں کچھ حضرات انجمن اسلام، انجمن مفید الاسلام وغیرہ کے نمائندے بھی تھے۔

مسلمانوں میں علما اور امرا کا بھی ایک رول رہا ہے۔ کچھ خفیہ تحریکوں کی جذباتی کڑیاں ادھر ادھر اب بھی موجود تھیں، مسلمانوں کے کچھ خصوصی مسائل بھی تھے، جیسے بعض اور طبقوں، علاقوں اور اقلیتوں یا ذاتوں کے تھے۔ سن ستاون نے مسلمانوں کو سماجی، اقتصادی اور تعلیمی بہت سے مسائل سے دوچار کر دیا تھا۔ ان کے تشخص کا سوال اٹھ گیا تھا۔ انگریزی سیاست دانوں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور اپنی غیر ہمدردانہ پالیسیوں کی بدولت انھیں عام دھارے سے کاٹنے کی کوشش کی۔ مسلم لیگ کا قیام اسی کا نتیجہ تھا، لیکن آزادی ہند کے سوال پر مسلم لیگ کوئی ایسا طرز فکر اپنا نہ پائی جو آزادی کے تصور ہی کے خلاف ہو۔ اس نے آزادی کے معنویات کو ہلکا کرنے کی کوشش کی، لیکن خلافت نے اس رو کو بدلا۔ اس دور کی لیگ میں مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا حسرت موہانی کی شرکت سے آزادی کی تحریک کو تقویت ملی۔ اس دور کی لیگ کو چوتھی دہائی کی لیگ سے الگ کرنا اور سمجھنا ہوگا۔ اس کے بغیر مولانا حسرت موہانی کی شمولیت لیگ کو بھی سمجھا نہیں جا سکتا۔ وہ لیگ میں مسلم لیگ کی پالیسیوں سے مکمل اتفاق کر کے نہیں گئے تھے بلکہ اس پلیٹ فارم سے اپنے خیالات و نظریات کی ترویج و تبلیغ کے لیے گئے تھے۔ اور کانگریس ہی کی طرح وہاں سے بھی ناکام لوٹے۔ آزادی کے بعد مسلم لیگ کے تمام رہنماؤں نے پاکستان کی راہ لی اور وہاں اس نئی مملکت میں اپنے لیے جگہ بنانے کی کوششوں میں لگ گئے، لیکن حسرت ہندوستان ہی میں رہے۔ یہاں آئین ساز اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے ایک صاحب فکر و نظر کا کردار ادا کرتے رہے۔

خلیق انجم نے یہ صحیح تجزیہ کیا ہے کہ "حسرت کا المیہ یہ تھا کہ وہ مصلحت، تحمل اور صبر سے کام نہیں لیتے

تھے۔ اگر ایک سیاسی پارٹی سے انھیں اختلاف ہوتا تو وہ دوسری پارٹی میں شریک ہو جاتے۔ اس سب کے باوجود حسرت ہمارے ان صف اول کے سیاسی رہنماؤں میں ہیں، جنھوں نے ملک کو آزاد کرانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ حسرت کی زندگی اور عمل نے ہزاروں ہندوستانیوں کی رہنمائی کی تھی۔" ... " لیکن ایک مشکل یہ تھی کہ حسرت بہت ضدی، متلون مزاج تھے۔ وہ شاید واحد شخص ہیں جس کا جھگڑا اس عہد کے تمام صف اول کے رہنماؤں سے رہا۔ حسرت نے گاندھی جی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور جناح غرض سبھی سے جھگڑے کیے اور پبلک جلسوں میں ان کی مخالفت کی۔ اس مخالفت کی بنیاد کسی بدنیتی پر نہیں بلکہ حق گوئی پر تھی۔ یہ اور بات ہے کہ حسرت حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگا پاتے تھے۔" وہ جو اندازہ بھی لگاتے تھے اس پر ان کے باغیانہ جذبات حاوی ہو جاتے تھے۔

کتاب میں مولانا حسرت موہانی کی شاعری کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مختصر سوانح عمری کی تنگ دامانی تفصیلی تجزیے کی تو متحمل نہ تھی پھر بھی تمام اہم نکات کو خوش سلیقگی سے سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کے تصور عشق پر کھل کر آزادانہ بحث ہوئی ہے۔ حسرت، صحیح بالکل عام اصطلاح میں بھی مولانا نہیں تھے بلکہ ان کی حق گوشی و حق گوئی، قلندری اور فقر پسندی نے انھیں یہ خطاب دلوا دیا۔ اب حسرت کے بعض ناقدین ان کی غزل گوئی کو فقہی عاشقی کا لبادہ پہنانا چاہتے ہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔ حسرت غزل کے احیائی دور کے سب سے اہم شاعروں میں ہیں۔ انھوں نے دوبارہ حسن کو اس کا لطیف، حیاتی اور جسمانی پیکر دیا اور عشق میں بوالہوسی سے بچتے ہوئے سچی حسن شناسی اور حسن کی خلقی دلکشی سے متاثر عاشقی اور بے لوث محبت کا جذبہ دیا۔ یہ محبت جسم سے نزدیک ہے اور جسم کی تمام رعنائیوں اور رنگ و بو کی تمام لطافتوں کے صحیح ادراک کا حوصلہ رکھتی ہے۔

حسرت کے مذہبی رجحانات کا باب بھی سلیقے سے لکھا گیا ہے۔ وہ سچے سیکولر رہنما تھے۔ حسرت کی سیکولرزم صرف زبانی نہیں تھی وہ اس پر عامل بھی تھے۔ وہ صوفی صافی تو تھے ہی۔ سماع کے عاشق، زیارات و اعراس کے شائق۔ اسی کے ساتھ وہ متھرا سے بھی دلی لگاؤ رکھتے تھے اور وہاں بار بار عقیدت کیشانہ جاتے تھے۔ حج و زیارات کا بھی متعدد بار شرف حاصل کیا۔ بین المسلمین اختلافات سے بھی بیزار اور کنارہ کش تھے۔

حنفی ہیں نہ مالکی نہ ہمیں   حنبلی سے نہ شافعی سے غرض
ہم کہ خالص ہیں پیرو اسلام   اور رکھتے نہیں کسی سے غرض

ان کا گھرانا رضوی سیدوں کا تھا اور اس میں اکثر رسوم ایسے رائج تھے، جو سیدوں میں (خواہ وہ سنی ہوں یا شیعہ) عام ہیں۔ مثلاً بازو پر امام ضامن باندھنے کی رسم، کسی مہم پر یا لمبے سفر پر جاتے وقت کوئی سکہ باندھ دیا جاتا ہے اور امام ضامن حضرت علی رضا علیہ السلام کی وساطت سے دعائے حفاظت کی جاتی ہے۔ غرض کچھ ماحول کے اثر سے اور کچھ ذاتی ترجیحات کی بنا پر حسرت کے دل میں مکمل اور سچی سیکولرزم نے گھر بنا لیا تھا اور یہی ان کا وظیفۂ زندگی بھر رہا کہ تمام خلق خدا محبت کرنے کے لائق اور عزت و احترام کی مستحق ہے۔

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا   دم بھرتی ہے آرزو اسی کا

ان کا فلسفۂ حیات یہ تھا:

تکمیل علاج دنیوی کو حسرت   ہے خواہش حسن عاقبت بھی لازم
درویشی و انقلاب مسلک ہے مرا   صوفی مومن ہوں، اشتراکی مسلم

خلیق انجم کی تصنیف اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ انھوں نے نہایت ہی ایمان داری اور محققانہ بے باکی سے حسرت جیسے عظیم مجاہد آزادی اور اہم شاعر و ادیب کے سوانح مرتب کیے ہیں۔ اس طرح کی حق گوئی کے بغیر حسرت کی شخصیت کی پہلو داری کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ ہماری عام عادات یہ ہے کہ ہم جس سے خوش ہوجاتے ہیں اسے انسان سے فرشتہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حسرت خود ایک نڈر اور بے باک مجاہد تھے۔ حق گوئی ان کا امتیازی نشان تھا۔ اس حق گوئی کے لیے انھیں بے انتہا شدائد و مصائب جھیلنا پڑے بار بار قید ہوئے قید بھی بامشقت اور کبھی کبھی قید تنہائی اور نظر بندی۔ جیل میں سال بھر تک چکی پیسنا پڑی۔ گرمیوں میں رمضان کا مہینہ یوں ہی گزرا۔ نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ کا بھی سامنا رہا۔ سیاست میں ایسا مرد قلندر کوئی اور شاذ نظر آتا ہے۔ جنگ آزادی کا نعرہ کانگریس کے پلیٹ فارم پر نہایت ہی دلیری سے گاندھی جی کی مخالفت کے باوجود انھوں نے ہی بلند کیا۔ شاعری سے لے کر صحافت اور خطابت سے بھی جہاد آزادی کو تقویت پہنچائی۔ سودیشی کی تحریک میں بھی عملاً حصہ لیا۔ اور آزادی کی جدوجہد میں، بیوی کو بھی برابر کا شریک کیا۔ گھر کو لٹنے کی حسرت ہی رہ گئی، تمام زندگی سر پہ کفن گزاری۔ مسلم لیگ میں بھی شریک ہوئے تو اس خیال کو لیے ہوئے کہ اس پلیٹ فارم کو حصول آزادی کا ذریعہ بنائیں گے۔ قلندری کے ساتھ متصوفانہ سرمستی بھی تھی اور عقیدتمندانہ سپردگی بھی۔ شاعری زیادہ تر عاشقانہ تھی۔ یہاں بھی وہی حق گوئی۔ ان کا عشق نہ تو نمائشی تھا نہ روایتی۔ انھوں نے اپنے اشعار میں واردات قلبی بیان کیے ہیں اور اس طرح کہ آنے والوں کے لیے نئی راہیں کھل گئیں۔ ع گزرے ہیں جس طرف سے شمعیں جلا گئے ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

"حسرت موہانی" سوانح عمری کیا ہے۔ کوزے میں دریا کو بند کیا ہے۔ اور یہ بے حد کامیاب اور لائق ستائش کوشش ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے متن کی تحقیق کے سلسلے میں فراہمی مواد سے لے کر موازنے و مقابلے کے طریق، اختلاف نسخ کے مسائل، اغلاط عام کی نوعیت و کیفیت سے لے کر جعلی متنوں کی تحقیق، سرقہ، فرضی نام، گم نام مصنفین یا فرضی ناموں سے لکھنے والوں کی تصانیف، سنہ تصنیف کا تعین غرض بہت سے ایسے مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے، جو متن کی تحقیق کے سلسلے میں پیش آتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی دلچسپ تفصیلات بیان ہوئی ہیں، جن کی بدولت یہ کتاب چند خشک مباحث کا مجموعہ نہیں رہی بلکہ بڑی قابل مطالعہ ہوگئی ہے اور صرف محققین ہی کے لیے مفید نہیں، عام قارئین کے لیے بھی دل چسپی کا سامان رکھتی ہے۔ ہمارے یہاں متن کی حرمت کو قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا عام طور سے مطالعہ کیا جائے۔ (ڈاکٹر شان الحق حقی)

ڈاکٹر اکبر رحمانی

ڈاکٹر خلیق انجم سے گفتگو

ڈاکٹر خلیق انجم ایک ہشت پہلو شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ اعلیٰ پائے کے نقاد محقق، صحافی اور مترجم ہونے کے علاوہ خوش بیان مقرر، بہترین تنظیمی صلاحیتوں کے مالک اور ہندوستان میں اردو تحریک کے مخلص قائد بھی ہیں۔ اور بقول ایم حبیب خاں وہ ایک اچھے فوٹو گرافر، موٹر میکنک اور فن تعمیر کی جانکاری رکھنے والے انسان بھی ہیں۔ میری ان سے چند ہی ملاقاتیں ہوئیں، لیکن میں نے ان جیسا عاشق اردو اور مجاہد اردو بہت کم لوگوں کو دیکھا۔ وہ گفتار کے غازی نہیں کردار کے غازی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ انہی کی فعال شخصیت ہے۔ جس نے انجمن ترقی اردو (ہند) کو نئی زندگی دی۔ ۱۹۷۴ء میں انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری مقرر ہونے کے بعد انھوں نے اپنا سب کچھ انجمن کے لیے وقف کر دیا۔ گویا انجمن ہی ان کے لیے اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ یہ اسی لگن کا نتیجہ ہے کہ آج دہلی میں دین دیال اپادھیائے مارگ (سابق نام راؤز ایونیو) پر اردو گھر کی صورت میں انجمن کی ایک عالی شان عمارت ہر آنے جانے والے کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو مجاہد اردو انجم صاحب کے نام کو اردو کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

میں جب بھی دہلی جاتا ہوں، خلیق انجم صاحب سے ملنے انجمن کے دفتر ضرور جاتا ہوں۔ تین سال پہلے جون ۱۹۹۱ء میں ایران کلچرل ہاؤس دہلی کی دعوت پر فارسی اساتذہ کے ساتویں سیمینار میں شرکت کی تھی۔ قریب پندرہ دن ایران کلچرل ہاؤس میں قیام رہا۔ یہاں سے قریب ہی انجمن ترقی اردو کا دفتر تھا۔ میں نے گھر ہی سے چلتے وقت دلی کی بعض اہم ادبی و تحریکی شخصیتوں سے 'آموزگار' کے لیے انٹرویو لینے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ ان شخصیتوں میں ڈاکٹر خلیق انجم کا نام سرفہرست تھا۔ ۱۳ / جون ۱۹۹۱ء کو میں انجم صاحب کو پیشگی اطلاع دیے بغیر ان کے دفتر پہنچ گیا۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ دوپہر کا وقت تھا اور سب لوگ کھانا کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جو اعلیٰ عہدے دار ہوتے ہیں وہ اپنے ماتحتوں اور اپنے ملازمین کے ساتھ کھانا پینا تو دور کی بات ہے اٹھنا بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ میں نے دیکھا کہ انجمن ترقی اردو کا جنرل سکریٹری اپنے تمام ماتحتوں کے ساتھ بلا امتیاز عہدہ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔ من و تو کا پردہ نہیں۔ پورا ماحول محبت اور اپنائیت میں ڈوبا ہوا۔ ان آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ کھانے کے بعد ہر کوئی اپنے اپنے برتن صاف کر رہا ہے۔ جنرل سکریٹری نے کسی ملازم سے نہیں کہا کہ وہ برتن صاف کر دے۔ خود خلیق انجم صاحب اپنے برتن صاف کر رہے ہیں۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ یہ مساویانہ سلوک بہت کم دکھائی دیتا ہے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم جنرل سکریٹری کے آفس میں جا بیٹھے، اور وہیں میں نے خلیق انجم صاحب سے اردو زبان و تعلیم کے مسائل پر گفتگو کی۔ میں اپنے ساتھ ٹیپ ریکارڈ لے گیا تھا، یہ پوری گفتگو اسی ٹیپ سے نقل کی گئی ہے۔

میں : ڈاکٹر صاحب، ہندوستان میں اردو تعلیم کا مستقبل آپ کو کیسا نظر آرہا ہے ؟

خلیق انجم : رحمانی صاحب، ہندوستان میں اردو تعلیم کا مستقبل اتنا مایوس کن نہیں ہے۔ بعض لوگ اس طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں کہ ہندوستان میں اردو مرگئی ہے تباہ ہوگئی ہے۔ مگر یہ باتیں وہی کرتے ہیں جو رونا پیٹنا جانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی حالت اب بھی بری نہیں ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ یوپی میں اردو کی حالت نہایت خراب ہے۔ لیکن بہار میں اردو کی حالت خراب نہیں ہے۔ وہاں اردو تعلیم کے پورے انتظامات ہیں۔ دہلی میں بھی اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ مہاراشٹر میں تو اردو کی حالت بہت اچھی ہے۔ کرناٹک، مغربی بنگال اور آندھرا پردیش میں بھی اردو تعلیم کی صورتحال اچھی ہے۔ اردو کی بدنصیبی یہ ہے کہ اب اردو پڑھنے والے صرف مسلمان رہ گئے ہیں۔ نارتھ (شمالی ہندوستان) میں تو زبانیں مذہبی فرقوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ اب پنجابی صرف سکھ پڑھتا ہے، اردو مسلمان اور ہندی ہندو۔ دوسرے ہندی پڑھتے ہیں تو وہ مجبوری کے تحت۔ زبان کو سیاسی مسئلہ بنانے کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ زبانیں مذہبی فرقوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ اردو کے پڑھنے والے اس ملک میں صرف مسلمان رہ گئے ہیں — ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ دوسرے فرقوں کے لوگ بھی اردو پڑھیں اس کے لیے اردو انجمنوں اور اداروں کو جدوجہد کرنی چاہیے۔

میں : اب تو جو اردو کے سیکولر کردار کی بات کہی جاتی رہی ہے - - - -

خلیق انجم : رحمانی صاحب! آپ بالکل صحیح فرما رہے ہیں۔ میں یہ بات یہاں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اردو کا کیریکٹر ہمیشہ سے سیکولر رہا ہے۔ اردو کی تعمیر اس کی ساخت و پرداخت میں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی سب کا حصہ ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اردو نثر میں جتنا Contribution غیر مسلموں کا رہا ہے اتنا مسلمانوں کا نہیں۔ ناول، فکشن، صحافت، سب میں غیر مسلموں کا زبردست حصہ ہے۔ رتن ناتھ سرشار سے لے کر بیدی تک کتنے ہی لوگ ہیں۔ مگر آج اردو کی انتہائی بدنصیبی یہی ہے کہ وہ صرف مسلمانوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

میں : اردو کو اس کا سیکولر کردار واپس دلانے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔؟

خلیق انجم : ہمیں غیر مسلموں کو اردو سکھانا چاہیے۔ ان میں اردو کا شوق پیدا کرنا چاہیے۔ اس سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط بڑھیں گے اور دوسرے کئی فوائد حاصل ہوں گے۔

میں : لیکن ڈاکٹر صاحب سوال یہ ہے کہ غیر مسلم اردو کیوں سیکھیں؟ اردو سیکھنے سے انھیں روزی روٹی تو ملنے والی نہیں۔ خود مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو اپنے بچوں کو اس لیے اردو تعلیم نہیں دیتا کہ اس کا معیشت سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ کسی زبان کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ اس کا رشتہ معیشت سے ہو۔

خلیق انجم : رحمانی صاحب یہ بھی ہمارے خلاف ایک پروپیگنڈہ ہے۔ اس پُر فریب جال میں ہم سب پھنسے ہوئے ہیں۔ پورے ملک میں مجھے ایک اسٹوڈنٹ ایسا بتلائیے۔ جو جدید تعلیم حاصل کر رہا ہو اور صرف ایک زبان جانتا ہو۔ آپ مجھے بتائیے کہ صاحب فلاں بچہ ہے جو صرف اردو پڑھا ہوا

ہے اور دوسری کوئی زبان نہیں جانتا چاہے وہ پبلک اسکول کا ہو یا پرائیوٹ اسکول کا۔

میں : ڈاکٹر صاحب، ایسا تو ایک بچہ بھی نہ ملے گا۔ آج ہر بچہ کو کم از کم تین زبانیں سیکھنا ضروری ہے۔

خلیق انجم : اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کا بچہ اردو بھی پڑھے گا، ہندی اور انگریزی بھی۔ اگر وہ مہاراشٹر کا رہنے والا ہے تو اردو کے علاوہ مراٹھی اور انگریزی پڑھے گا۔ اب آپ دو بچوں کی مثالیں لیجیے۔ ایک وہ ہے جو اردو، مراٹھی اور انگریزی پڑھا ہوا ہے اور دوسرا وہ ہے۔ جو صرف مراٹھی اور انگریزی پڑھا ہوا ہے۔ یہاں بھی ملحوظ رہے کہ دونوں ذہین بچوں کے مارکس بھی یکساں ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ان میں سے کس بچے کے لیے روزگار کے امکانات زیادہ ہیں ؟

میں : دونوں کو Job مل سکتا ہے۔

خلیق انجم : پھر یہ بات ہی غلط ٹھہرتی ہے کہ اردو کی تعلیم حاصل کرنے سے Job ملنے میں دشواری ہوتی ہے۔

میں : لیکن ڈاکٹر صاحب ایک ایسے مدرسہ کا بچہ جس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے وہ اس بچے کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ جو انگریزی میڈیم سے پڑھا ہو۔ اردو میڈیم کے بچے کی انگریزی کمزور ہوگی۔

خلیق انجم : رحمانی صاحب، یہ ایسی کمزوری ہے جو شوق، محنت اور مشق سے دور کی جا سکتی ہے۔ آج بھی اتر پردیش مدھیہ پردیش، راجستھان اور بہار میں لاکھوں اردو طلبہ ہیں۔ آج کے بچوں کی بات چھوڑیے۔ ہمارے بزرگوں نے سنسکرت میں کیا کم کام کیا ہے۔

میں : ہندوستان کی بیشتر ریاستوں میں اردو اکادمیاں قائم ہو چکی ہیں، کیا آپ ان کے کاموں سے مطمئن ہیں ؟ اور کیا آپ ان اکادمیوں کے کاموں میں اصلاح کی کوئی ضرورت محسوس کرتے ہیں ؟

خلیق انجم : رحمانی صاحب، میں اردو اکادمیوں کے کاموں سے ناامید نہیں ہوں۔ میں اس لیے ناامید نہیں ہوں رحمانی صاحب کہ میرا تعلق اس نسل سے ہے جسے اپنی کتاب چھپوانے کے لیے پبلشر نہ ملتا تھا جب کہ اس وقت پڑھنے والے آج کے مقابلے میں دُگنے تھے۔ جب میری پہلی کتاب تیار ہوئی تو اس کا مسودہ بغل میں دبائے میں اِدھر اُدھر پھرتا تھا۔ لیکن کوئی پبلشر نہ ملتا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک پبلشر تیار ہوا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میری پہلی کتاب "مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط" پر مجھے صرف ۱۵۰ روپے رائلٹی ملی تھی۔ جب کہ میں نے فارسی خطوط تلاش کرنے کے لیے جو سفر کیے تھے اس پر دو ڈھائی ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ ایک وہ زمانہ تھا اور آج یہ حالت ہے کہ ایک نیا لڑکا اٹھتا ہے اور ۲۰/۳۰ غزلیں کہتا ہے اور جا کر اکادمی کے سکریٹری کو مسودہ تھما دیتا ہے اور اسے اکادمی سے مالی امداد مل جاتی ہے اور اس کا مجموعہ چھپ جاتا ہے اس طرح کی مثالیں بھی ملتی ہیں، لیکن اس میں بعض مستحق بھی ہوتے ہیں۔ غرض اکادمی ہر طرح سے مدد کرتی ہے۔ اب آپ یہ سوچیں کہ اکادمی بہت پرخلوص ہوگی، وہ تو ہو نہیں سکتی۔ اس لیے کہ اس پر سیاسی دباؤ بھی ہوتے ہیں۔ اگر کوئی منسٹر اکادمی کا انچارج ہے تو لوگ بھاگے بھاگے جاتے ہیں۔ جس پارٹی کی حکومت ہوتی ہے اس کے لوگ چیف منسٹر کو پریشان کرتے ہیں کہ اکادمی کا ہمیں ممبر بنائیے۔ غرض کہ اس میں پریشرز بھی ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ

اردو کے حق میں فضا سازگار کرنے میں اکادمیوں کا اہم رول ہے۔ ان اکادمیوں کی وجہ سے اردو کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ کہیں جلسے ہو رہے ہیں تو کہیں سمینار، مشاعرے اور مذاکرے اخبارات میں اس تعلق سے اشتہارات بھی چھپ رہے ہیں، پوسٹرز بھی شائع ہو رہے ہیں غرض کہ یہ سرگرمیاں اردو کے حق میں فضا بنا رہی ہیں۔ اب رہا یہ کہ اکادمیوں کی کارکردگی اور بہتر بننا چاہیے تو یہ Depend کرتا ہے کہ اکادمی کا سکریٹری کیسا ہے اور اس ریاست کا Political Set up کیسا ہے۔ میرا تعلق دلی اکادمی سے رہا ہے، اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کے سکریٹری شریف الحسن نقوی نے ایسا کام کیا ہے کہ جو کم لوگ کر پاتے ہیں۔ اس میں خرابیاں بھی ہوئی ہوں گی جو مجھے تعصب کی وجہ سے نظر نہ آئی ہوں، لیکن سیاسی دباؤ کم تھا اس لیے اچھا کام ہوا۔

میں : اردو تعلیم کا معیار دن بہ دن گرتا جا رہا ہے؟ آپ کی نظر میں اس کے کیا اسباب ہیں؟

خلیق انجم : یہی شکایت ہمارے ہندی کے ایک دوست نے بھی کی ہے۔ میری نظر میں معیار تعلیم کی پستی میں آج کے الیکٹرانک میڈیا ہمارے سیر و تفریح کے ساز و سامان اور ہماری سوشل لائف کا بڑا دخل ہے۔ ہم جب اسکول میں پڑھتے تھے۔ تو تین چار مہینے میں پیسے اکٹھا ہوتے تو چھپ کر جگت ٹاکیز میں فلم دیکھتے تھے۔ مگر آج ہمارے بچے ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ رحمانی صاحب، صرف اردو ہی کا معیار نہیں گر رہا ہے بلکہ ہر زبان کا معیارِ تعلیم گر رہا ہے۔

میں : ڈاکٹر صاحب، اردو تعلیم کے معیار میں گراوٹ سے میری مراد یہ تھی کہ آج کی نسل کا اردو املا درست ہے نہ تلفظ۔ اردو میں بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں پانے والوں کے بارے میں بھی یہ شکایت اکثر سننے میں ملتی ہے اور پھر یہی لوگ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔ کیا یہ صورتِ حال تشویش ناک نہیں ہے؟

خلیق انجم : یقیناً یہ تشویشناک صورتحال ہے۔ میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آزادی سے قبل پورے ملک میں اردو کا جو زبردست ماحول تھا آج وہ نہیں ہے۔ دلی اور لکھنؤ جو اردو کے بڑے مراکز تھے۔ آزادی کے بعد یہاں سے بڑے پیمانے پر لوگ ہجرت کر گئے، اور اس سے دو سو گنا تعداد میں دوسرے لوگ یہاں آکر آباد ہو گئے۔ اب ان نوآبادکاروں سے لین دین اور رابطہ ہے۔ ان میں سے اکثر اردو سے ناواقف ہیں۔ اگر میں ان سے نہایت فصیح زبان میں گفتگو کروں تو وہ اسے سمجھنے سے قاصر ہوں گے۔ مجھے تو اپنا کام نکالنا ہے اس لیے میں اپنی زبان میں پنجابی کے الفاظ ملا رہا ہوں، کچھ انگریزی الفاظ ملا رہا ہوں، کچھ مقامی زبانوں کے الفاظ، اور اس طرح اپنا کام چلا رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ یہی بگڑی زبان بولنے کا میں عادی ہو جاتا ہوں ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے میں صحیح تلفظ نہیں ادا کر پاتا ہوں۔ رہا اساتذہ کرام کا معاملہ تو وہ اپنے کام میں تو سیریس (Serious) نہیں ہوتے اس لیے ان کی املا بھی غلط انشا بھی غلط۔ رہا کالجوں اور یونیورسٹیوں کا معاملہ، تو وہاں لیکچرار سے لے کر پروفیسر تک جینوئن کیسیز (Genuine Cases) دس پندرہ فی صد سے زیادہ

نہیں ہوتے، باقی سب خوشامد پسند ہوتے ہیں۔

میں : ڈاکٹر صاحب، کیا اردو تعلیم میں گراوٹ کی وجہ یہ نہیں ہو سکتی کہ آج اردو کا رشتہ عربی اور فارسی زبانوں سے ٹوٹ چکا ہے؟

خلیق انجم : وہ رشتہ تو ٹوٹنا ہی چاہیے تھا۔ وہ پہلے بھی غلط تھا۔ ہم نے فارسی اور عربی کو زبردستی اپنے سر پر تھوپ رکھا ہے۔ ہم نے تو انگریزی کے الفاظ بھی لیے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انگریزی کو اپنے سر پر تھوپ رکھیں۔ دراصل اردو کا بیسک اسٹرکچر Basic Structure مقامی زبان کھڑی بولی کا ہے۔ جو زبان زندہ ہوتی ہے اس کی املا بھی بدلتی ہے۔ تلفظ اور انشار بھی۔ اردو بھی ایک زندہ زبان ہے۔ اس لیے وہ بھی بدل رہی ہے۔۔۔ ایک مثال میں دوں ایک صاحب سے میں نے کار خریدنے کی بات چیت کی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ یہ گاڑی نہ خریدیے، یہ "جگاڑ" کی گاڑی ہے۔ میں نے پوچھا "آپ نے لفظ "جگاڑ" کس معنی میں استعمال کیا ہے۔" انھوں نے کہا "دراصل اس گاڑی کا انجن اسٹینڈرڈ کا تو گیئر بکس فلاں گاڑی کا اور اسٹیئرنگ فلاں کا ہے"، اس مفہوم کے لیے تو اردو میں کوئی لفظ موجود نہیں تو پھر کیوں نہ اس نئے لفظ "جگاڑ" کو اردو میں شامل کیا جائے۔ اگر کوئی "جگاڑ" کا لفظ استعمال کرتا ہے تو وہ کوئی غیر فصیح نہیں ہو جاتا۔ زندہ زبان میں اسی طرح نئے نئے الفاظ شامل ہوتے ہیں اور زبان ترقی کرتی جاتی ہے۔

میں : لیکن ڈاکٹر صاحب، بعض علمار تلفظ کی معیار بندی پر اس قدر اصرار کرتے ہیں کہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان علمار کی نظر میں ہم نرے جاہل ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ساؤتھ (جنوبی ہند) کے رہنے والوں کے لب و لہجے پر مقامی بولیوں کے اثرات ہونے کی وجہ سے وہ بہت سے الفاظ صحت کے ساتھ ادا نہیں کر پاتے۔ اس بارے میں آپ کا کیا نقطہ نظر ہے؟

خلیق انجم : رحمانی صاحب، میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ علاقے میں جو تلفظ رائج ہے وہی اس کا صحیح تلفظ ہے چاہے وہ اہلِ زبان کی نظر میں غلط کیوں نہ ہو۔ آپ مہاراشٹر میں مراٹھی کے زیر اثر کسی لفظ کا جو تلفظ ادا کرتے ہیں وہی اردو کا صحیح ترین تلفظ ہے۔ رحمانی صاحب آج کونسا شہر اردو کا مرکز ہے کہ جسے اردو کا معیار بنایا جائے۔ کل دہلی کو یہ حیثیت حاصل تھی آج وہ ختم ہو چکا ہے۔ پورے یوپی میں صرف لکھنو اردو کا مرکز تھا مگر اب اس کی یہ حیثیت بھی ختم ہو چکی ہے۔ اس کے بعد حیدرآباد اردو کا مرکز بنا، آزادی کے بعد وہ بھی ختم ہو گیا۔ اب مجھے بتائیے کہ کون سا ایسا شہر ہے جسے اردو والے Follow کریں۔ اس لیے جو شخص مقامی حیثیت سے جو تلفظ ادا کرتا ہے وہی صحیح تلفظ ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ایک لفظ "کرسی" ہے جو ک ر س ی حرفوں سے مل کر بنا ہے۔ اگر کوئی 'س' کے بجائے 'ص' سے کرصی لکھے تو یہ غلط املا ہوگا۔ لیکن اگر ۶۰ فیصد لوگ کرسی کا املا 'س ی' سے لکھیں اور ۴۰ فیصد 'ص ی' سے لکھیں تو کہا جائے گا کہ اس لفظ کے دو املا ہیں۔ کچھ لوگ 'س ی' سے لکھتے ہیں تو کچھ

س۔ی ے مگر زیادہ تر لوگ س۔ی ے لکھتے ہیں۔ رحمانی صاحب، تلفظ اور املا کے معاملے میں اگر آپ ایکسپرٹ بننا چاہتے ہیں تو فارسی کی لغت اٹھا کر بیٹھ جائیے، آپ ایکسپرٹ ہو گئے ایک قصہ آپ کو سناتا ہوں۔ ایک صاحب مجھے ملے میں نے کہا "مجھے فلاں شخص سے محبت ہے" ان صاحب نے کہا یہ لفظ 'مُحَبت' ہے مُحِبت نہیں۔ میں نے کہا صاحب یہ اردو میں نہیں ہے۔ اردو میں اسے "مُحِبت" ہی بولتے ہیں۔ دراصل فارسی اور عربی ہی نے نہیں برباد کیا ہے۔

"موقع نکال کر محترمی ملا صاحب سے اور خلیق انجم سے مل لیا۔ انجمن کی حالت ناگفتہ بہ ہے خلیق کہہ رہے تھے کہ اگلے ماہ تنخواہ دینے کو بھی پیسے نہیں ہیں۔ ٹھیکہ داروں کا تقاضا ہے اور عمارت نامکمل پڑی ہے۔ کوئی مدد کرنے والا نہیں۔"

۱۷ جون ۱۹۷۴ء، سہیل عظیم آبادی بنام سید شہاب الدین دسنوی
(ذخیرہ خطوط انجمن ترقی اردو (ہند)

"تم کو بہادر شاہ ظفر کی حکومت ملی ہے۔ مگر تمہارے ہمدرد ہیں ان کا کوئی نہیں تھا۔ بہادر شاہ کے جھنڈے کے نیچے تو پوری جنگ آزادی لڑی گئی، شکست دوسری بات ہے۔ میں جانتا ہوں انجمن کا غذ پر ہے .... بات سیدھی ہے، کھنڈر پر عمارت تیار کرنی ہے۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ سمجھ کر کام شروع کرنا ہے کہ بگڑے ہوئے کام کو سدھارنا ہے۔ اللہ کا نام لے کر شروع کر دو۔"

۶ اپریل ۱۹۷۴ء، سہیل عظیم آبادی بنام خلیق انجم
ذخیرہ خطوط انجمن ترقی اردو (ہند)

پروفیسر کامل قریشی مرحوم

غالب کے خطوط

'غالب کے خطوط' کی ترتیب و تدوین کا کام ہمارے عہد کا ایک ایسا بے مثال کارنامہ ہے جس کا علم و ادب کی دنیا میں تاریخی اور غیر معمولی خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اپنی معنوی خوبیوں اور ظاہری زیب و زینت کے سبب اس معرکۃ الآرا کام کی جس قدر تعریف و توصیف کی گئی ہے، اس نے جہاں غالب کو ایک نئے نقطۂ نظر سے پہچاننے اور سمجھنے کا موقعہ فراہم کیا ہے تو دوسری طرف 'غالب کے خطوط' کے مرتب ڈاکٹر خلیق انجم کو غالب شناسوں کی صف اول میں شامل کر دیا ہے۔ مرتب موصوف نے ایک طویل عرصے کی عرق ریزی، محنت اور چھان بین سے پہلی بار غالب کے تمام خطوط کو جن سائنٹیفک اور ترتیب متن کے جدید اصولوں کی بنیاد پر مرتب کیا ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔ جسے اس کی اہمیت، خصوصیت اور افادیت کے پیش نظر ایک مستند، معتبر اور صحیح معنوں میں 'خطوط غالب' کی دور حاضر کی تحقیق کا حرف آخر قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پہلی بار 'خطوط غالب' پر نہایت عالمانہ پُر اثر معلومات اور سیر حاصل مقدمہ تحریر کیا گیا ہے۔ جو ۱۸۱ صفحات کی اس کتاب میں ۲۲۸ صفحوں پر مشتمل ہے اور جس میں غالب کے خطوط سے متعلق جملہ پہلوؤں، مسئلوں اور بحثوں پر نہایت فاضلانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ وہ معاملات یا سوالات جو خطوط غالب کے متعلق ذہنوں میں اٹھتے رہے ہیں حقائق و شواہد کی روشنی میں ان کے ہر گوشے اور ہر رخ کو نمایاں کیا جائے اور حتی الامکان کوئی چیز تشنہ نہ چھوڑی جائے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے گہرے مشاہدے اور بسیط مطالعۂ غالب کے تحت اس کا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہر وہ بات جو اب تک 'غالب کے خطوط' سے متعلق پردۂ خفا میں تھی اُسے منظر عام پر لے آنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مقدمہ اس کتاب کی روح کی حیثیت رکھتا ہے اور مرتب موصوف نے اسے اپنے انداز بیان سے اس قدر دلچسپ اور دلکش بنا دیا ہے کہ جب تک اسے ختم نہ کر لیا جائے کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ انداز بیان کے ساتھ جہاں تک نثر نگاری کا تعلق ہے تقسیم ہند کے بعد یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ دہلی شاید اچھے نثر نگاری اور اہل زبان سے خالی ہو گئی ہے لیکن اس مقدمے کو پڑھنے سے یہ خیال بھی باطل نظر آتا ہے اور دل گواہی دیتا ہے کہ اردو نثر اور زبان و بیان پر جہاں تک قدرت و کمالات کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم دہلی کی نئی نسل کے بہترین نمایندے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس مقدمے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا تحقیقی اور دوسرا تنقیدی۔ غالب کے خطوط (جلد اوّل) کے تحقیقی حصے میں غالب کے پہلے سے مرتبہ خطوط میر غالب (مرتبہ عبدالغفور سرور اور منشی ممتاز علی) سے لے کر سید مرتضیٰ حسین فاضل کے مرتبہ خطوط اردوے معلّٰے تک تمام مجموعوں کا گہرا محققانہ اور عالمانہ جائزہ لیا گیا ہے ان مرتبین میں عام پریس کے آدمیوں اور معمولی صلاحیت کے لوگوں سے قطع نظر جن نامور ہستیوں کے نام

شامل ہیں ان میں چودھری عبدالغفور سرور، منشی ممتاز علی، حکیم غلام رضا خاں، محمد عبدالاحد، محمد ، مرزا محمد عسکری مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مولوی مہیش پرشاد، آفاق حسین آفاق، مولانا غلام رسول مہر، مالک رام، اور سید مرتضیٰ حسین فاضل قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے ان مرتبین کے خطوط کے مجموعوں کا جس انداز سے جائزہ لیا ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا لب و لہجہ متوازن اور ہر طرح کے تعصب سے پاک ہے انھوں نے اگر تمام مرتبین کی خدمات کا اعتراف کیا ہے تو ان کی کوتاہیوں کی بھی بہت نرم، دھیمے اور مہذب انداز میں نشاندہی کی ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے مولانا امتیاز علی عرشی کے مرتبہ 'مکاتیب غالب' کے بارے میں لکھا ہے۔" میں یہ بات پورے وثوق اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مکاتیب غالب کے پہلے کسی اور متن کا ایسے سائنٹیفک انداز میں تنقیدی اڈیشن تیار نہیں ہوا۔"

ایک متنی نقاد کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرنے والا خود اپنے کام کے بارے میں جو رائے رکھتا ہے وہ جہاں دلچسپ ہے وہاں محقق کی ایمانداری کا بھی بہت بڑا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ۱۹۶۱ء میں 'غالب کی نادر تحریریں' مرتب کی تھی اس کتاب میں غالب کے ۹۴ خطوط اور ۱۹ مختلف تحریریں شامل ہیں اس کتاب کے بارے میں خود ان کی اپنی رائے ملاحظہ ہو۔

"اس مجموعے میں متنی تنقید' کے کسی بنیادی اصول کی پابندی نہیں کی گئی متن کی ترتیب میں بہت لاپرواہی سے کام لیا گیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ متن میں بے شمار غلطیاں راہ پا گئی ہیں اور ایک اچھا کام ناتجربہ کاری کی نذر ہو گیا ہے۔"

ڈاکٹر خلیق انجم کی تنقید کے ان دو نمونوں سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ انھوں نے مذکورہ مرتبین کے کام پر ایماندارانہ اور غیر جانبداری سے نظر ڈال کر تحقیق و تنقید کا حق ادا کیا ہے۔

خلیق صاحب نے ایک ایک مرتب کی تحقیقی کوششوں اور محنت و عرق ریزی کا ذکر کرتے ہوئے ان کے کام کی قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔ اور ترتیب و تدوین متن نے ان کے مرتبہ غالب کے خطوط، تک جتنے فاصلے طے کیے ہیں۔ ان پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے جو نتائج نکالے ہیں وہ اس تحقیقی حصے کی جان ہیں۔ ترتیب و تدوین کے کام نے بتدریج ارتقاء کی جو منزلیں ان کے زمانے تک حاصل کی ہیں انھوں نے اس کا بھی تفصیلی بیان کیا ہے اور اس طرح کتاب کے تحقیقی حصے کا یہ پہلو خطوط نگاری کی تاریخ کے گہرے مطالعہ اور بھرپور واقفیت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

غالب کی املاکی خصوصیات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن جتنا تفصیل سے ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے۔ ایسا سائنٹیفک انداز میں آج تک کہیں نہیں لکھا گیا۔ انھوں نے تقریباً ۱۶ صفحات پر مشتمل اس باب میں ذیلی عنوانات قائم کرتے ہوئے یائے مجہول و یائے معروف، الفاظ کو ملاکر لکھنے کے رجحان، اعراب بالحروف، ہمزہ کا استعمال، ہاکار آوازوں کی لکھاوٹ، لفظ کے آخر میں الف یا یائے مختفی، ہائے مختفی یا الف پر ختم ہونے والے الفاظ، واحد محرف یا جمع قائم کی صورت میں، نون غنہ اور نون ساکن بعض حروف کو ملا کر لکھنے کا رجحان، پانو اور گانو اور معکوسی آوازیں، یائے تحتانی اور ہمزہ اور ایسے الفاظ جن کی املا غالب نے دو طرح کی ہے۔ وغیرہ پر تفصیلی اظہار رائے کیا ہے جس سے تصدیق ہوتی ہے کہ

ڈاکٹر خلیق انجم کی لسانیات پر بھی گہری نظر ہے اور انھوں نے غالب کی املا کا مطالعہ بھی بہت اچھی طرح کیا ہے غالب کی زبان پر جو فارسی اثرات تھے اور غالب انگریزی کے جو الفاظ استعمال کرتے تھے ان پر بھی اس کتاب میں ایک مکمل باب تحریر کیا گیا ہے انھوں نے ایسے فارسی اور انگریزی الفاظ نمونے کے طور پر پیش کیے ہیں جو خطوط غالب میں اپنی معنویت کے اعتبار سے انفرادیت کے حامل ہیں نیز انگریزی الفاظ کے تلفظ، املا اور ترجمے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد غالب کے اردو خطوط کی مجموعی تعداد بتائی گئی ہے اور یہ بھی نشان دہی کی گئی ہے کہ غالب کے کتنے خطوط کس مکتوب الیہ کے نام ہیں۔

اس تحقیقی حصے کے شروع میں 'حرف آغاز' کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے کچھ اس تنقیدی اڈیشن کے بارے میں عنوان قائم کرتے ہوئے جن اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے ان میں متن کی تصحیح، خطوں کی تاریخ وار ترتیب، خطوں کی تاریخ تحریر، تنقیدی اڈیشن کے متن کی املا، اوقاف کی علامتیں، رقمیں غالب کا نام بحیثیت مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے حالات سے متعلق اطلاعات شامل ہیں جو کتاب کے مطالعہ کے دوران رہنما کا کام انجام دیتی ہیں۔

اس تحقیقی حصے کے بعد تنقیدی حصہ شروع ہوتا ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے خاص اہمیت کا حامل ہے اس حصے کی ابتدا، میں بتایا گیا ہے کہ غالب سے قبل اردو کا نثری سرمایہ کیا تھا اور اردو مکتوب نگاری کا آغاز کب اور کس کے ہاتھوں ہوا تھا، حالاں کہ مرتب نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس باب میں وہ ان جملہ باتوں کو زیرِ بحث لے آئیں جن کا بیان کرنا اہم ہے۔ لیکن یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس باب میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اتنے اہم اور بڑے موضوع کے ساتھ صرف گنے چنے صفحات میں انصاف نہیں ہوسکتا تھا اور نہیں ہوا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے روانی میں بہت سے نام گنا دیے ہیں جن سے تسلی نہیں ہوئی ضرورت اس بات کی تھی کہ ان مکتوب نگاروں اور نثر نگاروں کے بارے میں ذرا تفصیل سے لکھا جاتا، بہرحال امید ہے کہ اگلے اڈیشن میں خاص توجہ دے کر اس باب کے حق کو ادا کیا جا سکے گا۔ غالب کا پہلا دستیاب اردو خط کے عنوان سے جو باب لکھا گیا ہے وہ اگرچہ بہت مختصر اور مناسب تفصیل اور وضاحت چاہتا ہے لیکن مرتب کی محنت اور دیدہ ریزی کا ثبوت ہے عام خیال یہ تھا کہ غالب کا قدیم دستیاب خط یکم دسمبر ۱۸۴۸ء کو لکھا گیا تھا، خلیق صاحب نے نہایت مدلل طریقے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اب تک غالب کے جتنے اردو خطوط بازیافت ہوئے ہے ان میں قدیم ترین خط وہ ہے۔ جو غالب نے ۱۸۴۷ء میں مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام لکھا تھا تفتہ کے اس خط تک پہنچنے کے لیے مرتب موصوف نے کچھ اس خوبی کے ساتھ بحث کی ہے کہ ایک ایک بات دل نشین ہوئی ہے اور تحقیقی شواہد پر دل یقین کیے بغیر نہیں رہتا۔

غالب کے خطوط (جلد اول) میں مکتوب نگاری کا فن ایک باقاعدہ باب ہے۔ جس میں اردو اور انگریزی کے مکتوب نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر گذشتہ باب کی طرح یہ بھی بہت تشنہ ہے موضوع کے اعتبار سے اس باب کی جتنی اہمیت اور افادیت ہے اس کے پیش نظر دوسرے اڈیشن کے وقت اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اس پر نظر ثانی کر کے اضافے کیے جائیں تاکہ کتاب کے اس حصے سے گزرنے والا بھرپور استفادہ کر سکے اور اس کے سامنے تفصیلات اس انداز سے آجائیں کہ وہ انگریزی اور اردو مکتوب نگاری کے فن، مکتوب نگاروں کی تاریخ، کارناموں اور جملہ متعلقہ خصوصیات سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کر سکے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے جواہر نگار قلم سے تنقیدی حصے کو جس قدر باغ و بہار بنانے کی کوشش کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے کہ انھوں نے 'شگفتن گلہائے ناز' القاب وآداب، غالب کا آئین نامہ نگاری، خطوط میں مکالمہ نویسی، غالب کا ہے انداز بیان اور، لفظی عبارتیں، بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر، شعراء کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے، مرقع نگاری، ایک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے، عمر بھر کا تو نے پیمان دیا، باندھا تو کیا جیسے ذیلی اور دلکش عنوانات کے تحت 'غالب کے خطوط' کا بہت تفصیل سے تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ مکتوب نگاری کے فن کے خشک موضوع کی فضا میں تر و تازگی پیدا کرنے کے لیے یہ عنوانات جو رول ادا کرتے ہیں اور جو کیف و سرور برساتے ہیں اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ شگفتن گلہائے ناز میں مرتب نے غالب کے ذوق نثر نگاری اور شوق خطوط نویسی کی وجوہات سے بحث کی ہے۔ القاب وآداب میں غالب نے اپنے دوستوں، عزیزوں، رفیقوں اور شاگردوں کو کن القاب وآداب سے مخاطب کیا ہے اس کا ذکر ہے۔ خطوط میں مکالمہ نویسی کا مطلب غالب کے نزدیک کیا ہے اس کا بیان بعنوان مکالمہ نویس موجود ہے۔ عنوان غالب کا ہے انداز بیان اور، کے ذیل میں غالب کے اسلوب نثر نگاری پر نظر ڈالی گئی ہے۔ مقفیٰ عبارتیں کے عنوان سے جو صفحات اس کتاب میں موجود ہیں ان میں مفصل طور پر اس بات سے بحث کی گئی ہے کہ غالب اپنے خطوط میں لفظی عبارتوں کا استعمال اس طرح برمحل اور برجستہ کرتے تھے کہ ان پر تصنع اور تکلف کا شبہ تک نہ ہوتا تھا۔ بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر، کے ذیل میں ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ ثابت کیا ہے کہ غالب صرف اپنی شاعری ہی میں تمثیلوں، تشبیہوں، علامتوں اور استعاروں کا استعمال نہیں کرتے تھے وہ اپنی نثر کی انگوٹھی میں بھی انھیں نگینوں کی طرح جڑتے تھے اور جن کے استعمال سے خطوط میں ان کا اظہار بیان زیادہ موثر، معنی خیز، تہہ دار اور شگفتہ ہو جاتا تھا۔ یہ استعارے اور تشبیہات روایتی بھی ہوتے تھے اور غالب کی جدت پسند طبیعت کی اپنی اختراع بھی، مرقع نگاری کے عنوان کے تحت مرتب نے غالب کے کچھ الفاظ کے ایسے پیکر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن کے سننے سے نگاہ کے سامنے تصویریں رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہیں 'اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے، کے عنوان سے جو اوراق ملتے ہیں ان میں غالب کے مصائب وآلام اور دل سوز حالات بیان کر کے غالب کی زندگی کے درد و غم کی تصویر پیش کی گئی ہے ماتم یک شہر آرزو کا عنوان غالب کے دور انحطاط اور ۱۸۵۷ء کے ہولناک حالات کے نقوش نگاہ کے سامنے پیش کرتا ہے عمر بھر کا تو نے پیمان باندھا تو کیا، کے آخری عنوان کے تحت غالب بیشتر جگہ اپنے خطوط میں اپنے دوستوں، عزیزوں اور رفیقوں کی موت پر ماتم گزار اور سوگوار نظر آتے ہیں۔ ہر عنوان کے ساتھ مرتب نے پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے وہ برمحل اور موقعہ کی مناسبت سے برجستہ ہے۔ اس باب کو زیادہ سے زیادہ دلکش اور موثر بنانے کے لیے مرتب نے جس خوش اسلوبی اور خوش سلیقگی سے فارسی اور اردو کے اشعار مذکورہ عنوانات کے تحت مثالوں کے طور پر پیش کیے ہیں وہ اپنا جواب آپ ہیں اس سے مرتب کے بیانات میں زور، شوق اور تاثر گہرا ہوتا چلا گیا ہے۔

اس پورے مقدمے کے بارے میں ڈاکٹر ظ. انصاری نے جو کچھ کہا ہے اس کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ ظ لکھتے ہیں۔

"شروع میں ۲۲۰ صفحے کے مقدمے کے کئی حصے ہیں تنقیدی اور علمی متن کے اصول،

جو رائج ہیں، جو متروک ہوئے اور جو کام میں لائے گئے اور پھر خطوط غالب کے آج تک کے سارے اڈیشنوں کی تحقیق و تنقید، پھر ان خطوط کی خطوط نگاری کے پس منظر میں قدر و قیمت اور خصوصیات پھر انڈکس اور متعلقہ وضاحتیں۔ اس طرح یہ مقدمہ بجائے خود ایک علمی تحقیقی مقالے کا وزن رکھتا ہے۔ پی۔ ایچ ڈی تو خلیق انجم پہلے سے ہیں اگر انھیں کوئی علمی ادارہ ڈی لٹ دے دے تو بے جا نہیں برحق ہوگا۔[۱]

میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگرچہ خطوط غالب پر بے شمار تنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں اور دو تین کتابیں بھی وجود میں آ چکی ہیں لیکن ڈاکٹر خلیق انجم کا مرتبہ 'غالب کے خطوط' کا یہ مقدمہ خطوط غالب پر پہلا تنقیدی کارنامہ ہے۔ میرے اس خیال کی تائید ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ دیکھیے انھوں نے کس طرح بے ساختہ اور جھوم جھوم کر اس مقدمے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مقدمے میں جو گٹھی ہوئی اور نہایت معنی خیز عبارت، غالب کا رنج و راحت سے برتاؤ پیش کرتی ہے۔ پہلی نظر میں تو وہ مجھے خود اپنا بیان معلوم ہوئی، کیوں کہ میں نے غالب کی قدر جانی ہے اسی رخ سے، پھر افسوس ہوا کہ یہ مرتب موصوف کی عبارت کیوں ہے۔ اسے تو ہمارے قلم سے نکلنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے 'غالب نے جان عزیز کے لیے آرزو اور شکست آرزو، خوشی و غم، کامیابی و ناکامی کے درمیان زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا اسی لیے تو وہ اپنے آپ کو ہدف ستم ہائے روزگار نہیں، بلکہ رہین ستم ہائے روزگار' کہتے ہیں اس ستم ہائے روزگار سے ان کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی اور ان کی حس مزاح ماند نہیں پڑی بلکہ اور تیکھی ہوتی چلی گئی۔ ایک حقیقی مزاح نگار کی طرح غالب زندگی کی ان تمام ناہمواریوں اور کھردرے پن سے ہنستے ہوئے۔ برہنہ پا گزر جاتے ہیں جن پر چلتے ہوئے پاؤں لہولہان ہو جاتے ہیں۔"[۲]

ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے ان دونوں اقتباسات کے الفاظ ڈاکٹر خلیق انجم کے لیے ایک ایسا خراج تحسین ہیں جنھیں حق بہ حقدار رسید کے مصداق کہا جا سکتا ہے۔ دراصل ڈاکٹر خلیق انجم کو غالب سے ہمیشہ ہی سے غیر معمولی دلچسپی رہی ہے۔ وہ شروع ہی سے غالب پرست اور غالب کے دشیدا رہے ہیں۔ میں چونکہ ان سے بہت قریب رہا ہوں اور میں نے اکثر دیکھا ہے کہ وہ جب بھی ملے ہیں غالب کی نثر یا شاعری کے بارے میں کچھ نہ کچھ گفتگو کرتے ہوئے پائے گئے ہیں اکثر میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ڈاکٹر خلیق انجم کو غالب ہی سب سے زیادہ کیوں پسند ہے ہماری صدی کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال ہیں۔ وہ اقبال کا ذکر کیوں نہیں کرتے۔ خلیق صاحب اقبال کو بڑا شاعر ضرور مانتے ہیں لیکن ذہنی اعتبار سے وہ اقبال سے قریب نہیں ہیں ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو لیکن میرا خیال ہے کہ انھوں نے اقبال کا تفصیلی مطالعہ بھی نہیں کیا کیوں کہ جب کروڑی مل کالج میں میں ان کے ساتھ رہتا تھا تو ہم دونوں اکثر ساتھ کالج یا یونیورسٹی لائبریری میں جاتے تھے۔ میں نے ہمیشہ انھیں غالب پر کتابیں لیتے ہوئے دیکھا اور اقبال پر شاید ہی کوئی کتاب ان کے ہاتھ میں دیکھی ہو۔ نجی گفتگو میں بھی خلیق صاحب غالب کے اشعار سے زیادہ خطوط غالب کا ذکر کرتے ہیں اب سے دس بارہ سال پہلے موصوف خطوط غالب کے فقرے اس طرح سناتے تھے جیسے

لوگ غالب کے اشعار سناتے ہیں یہ فقرے عام طور سے وہ تھے جن میں غالب نے اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا مذاق اڑایا ہے میرا ذاتی خیال ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم غالب سے اس لیے قریب ہیں کہ دونوں زندگی کے نشیب وفراز سے گزر رہے ہیں دونوں نے زندگی کی ٹھوکریں کھائی ہیں اور دونوں نے ہمیشہ مصائب والام کا مذاق اڑایا ہے اور کبھی ہار نہیں مانی اور یہی ان دونوں کے درمیاں قدرِ مشترک ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ غالب سے ڈاکٹر خلیق انجم کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ جب کالج میں ٹائم ٹیبل بن رہا تھا ہم دونوں بیٹھے تھے میں نے خواہش ظاہر کی کہ خطوط غالب میں پڑھانا چاہتا ہوں خلیق صاحب نے برجستہ کہا کہ تمام مضامین آپ پڑھائیے صرف خطوط غالب مجھے دیدیجیے، غالب پر جتنے سمینار کروڑی مل کالج میں ہوئے ہیں شاید دہلی کے کسی اور کالج میں نہیں ہوئے، ۱۹۶۹ء میں جب جشن غالب منایا گیا تو کروڑی مل کالج کو ہی یہ سعادت حاصل ہوئی کہ دو دن کا پروگرام غالب پر رکھا گیا ایک دن صبح سے غالب پر سمینار ہوا اور شام کو غالب کی زندگی پر ایک ڈرامہ اسٹیج کیا گیا، دوسرے روز غالب پر کچھ مقالے پڑھے گئے اور شام کو مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا تمثیلی مشاعرہ پیش کیا گیا اور پھر اس کے بعد غالب کے مشہور قطعہ' اے تازہ واردان بساط ہوائے دل' پر پیش کیا گیا، لوگوں کی رائے تھی کہ ہمارے کالج کا پروگرام ان پروگراموں سے کہیں بہتر تھا جن پر غالب صدی اور جشن غالب کے نام سے لاکھوں روپے خرچ کیے گئے تھے ان پروگراموں کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم اور اس زمانے کے کروڑی مل کالج کے لائق پرنسپل استاد محترم ڈاکٹر سروپ سنگھ اور ان دونوں کے ناطے مجھے غالب سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ ہم نے جو کچھ کیا تھا شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس خلوص اور محبت کی بنیاد پر کیا تھا جو غالب سے ہمیں والہانہ وعقیدتمندانہ طور پر تھی یہ پوری داستان میں نے اس بات پر روشنی ڈالنے کے لیے بیان کی ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم کو غالب سے ابتداء ہی سے ایک نسبت خاص رہی ہے۔ اور چار جلدوں میں غالب کے خطوط کا علمی کارنامہ اسی نسبت خاص کا مظہر ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے متنی نقاد میں ہونی ضروری ہیں۔ انھوں نے اردو میں ایم۔اے، پی ایچ، ڈی تو کیا ہی ہے لیکن دہلی یونیورسٹی سے لائبریری سائنس اور لسانیات میں بھی ڈپلومے حاصل کیے ہیں ان دونوں مضامین میں ان کی تربیت نے ایک اچھا متنی نقاد بننے میں ان کی بہت مدد کی ہے۔ دہلی یونیورسٹی میں جب ببلیوگرافی کا کورس شروع کیا گیا تو خلیق صاحب پہلے استاد تھے جنھیں متنی تنقید پڑھانے کے لیے منتخب کیا گیا، چونکہ اس وقت تک اس فن پر اردو میں صرف دو چار مضامین ہی ملتے تھے اس لیے شعبۂ اردو نے ان سے متنی تنقید کے موضوع پر کتاب لکھنے کی فرمائش کی، خلیق صاحب نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ یہ کتاب لکھی جو اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ غالب سے انھیں شروع ہی سے دلچسپی تھی ان کی ایک کتاب غالب کی نادر تحریریں' ۱۹۶۱ء میں اور دوسری کتاب' غالب اور شاہان تیموریہ' ۱۹۷۵ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ غالب پرستی کے جوش اور غالب شناسی کے ذوق کے تحت انھوں نے اپنے گہرے مطالعۂ غالب اور متنی تنقید کے ایک ماہر کی حیثیت سے خطوط غالب پر اپنا کام ۱۹۷۲ء سے شروع کر دیا تھا، ایک طویل عرصے کی محنت ومشقت کے بعد غالب کے خطوط کی (جلد اول) توگزشتہ سال ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی دوسری جلد بھی حال ہی میں منظر عام پر آگئی ہے۔ اور باقی دو جلدیں بھی اسی سال ۱۹۸۵ء میں شائع ہو جائیںگی۔

میرے خیال سے یہ اردو کی پہلی کتاب ہے جس کی اتنے بڑے پیمانے پر پذیرائی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے بیشتر ادبی رسالوں میں اس کتاب پر تبصرے شائع ہوئے انگریزی کے نیشنل پریس نے اس کتاب کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے ہندی میں بھی کئی اخباروں نے اس پر توجہ کی ہے آل انڈیا ریڈیو کی اردو مجلس اور اردو سروس سے اس پر تبصرے نشر ہوئے ہیں ان تبصروں کے علاوہ اردو سروس ہی سے اس کتاب پر آدھے گھنٹے کی گفتگو بھی ہوئی ہے اس گفتگو میں اردو کے مشہور محقق و نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور ڈاکٹر شمیم حنفی شامل تھے اسی کتاب کے سلسلے میں دہلی ٹی وی نے نیشنل پروگرام کے تحت خلیق صاحب کا آدھے گھنٹے کا انٹرویو نشر کیا تھا۔ جسے ڈاکٹر مظفر حنفی نے لیا تھا اس انٹرویو میں غالب کے خطوط' کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو ہوئی تھی۔

خوشی کی بات ہے کہ حال میں ہی ڈاکٹر خلیق انجم کو مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی طرف سے دس ہزار روپے کا آل انڈیا پرویز شاہدی ایوارڈ ملا ہے اگرچہ یہ ایوارڈ ان کو مجموعی خدمات اردو پر دیا گیا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس ایوارڈ کی بنیاد بھی غالب کے خطوط' کا کارنامہ ہی ہے۔

ان اوراق میں ایک دو جگہ اس بات کا ذکر ہوا ہے کہ' غالب کے خطوط' کی اشاعت پر اس کی ہر جگہ دھوم دھام سے پذیرائی ہوئی ہے۔ اور جن محققوں، نقادوں اور دانشوروں نے ڈاکٹر خلیق انجم کے اس کارنامے پر اپنے بیش قیمت خیالات کا اظہار کیا ہے یا جو تبصرے کیے گئے ہیں میں ان کے مختصر سے اقتباسات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں، کہ غالب کے خطوط' کے اس شاندار کام کی عظمت پر روشنی پڑ سکے اور غالبیات میں اس کا اعلیٰ مقام متعین کیا جا سکے۔

پاکستان کے مشہور شاعر و نقاد جناب جمیل الدین عالی نے 'غالب کے خطوط' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"خلیق انجم نے کتنا بڑا کام کیا ہے اب تک خطوط غالب پر اتنا بڑا کام میرے علم کی حد تک کسی اور نے نہیں کیا، کیا محنت ہے شاید پہلی بار یہ ہوا ہے کہ متن کی تدوین جدید جرمن طریقے پر کی گئی ہے۔ جرمن اس معاملے میں یورپ کے لیے مثال اور امریکہ سے بہت آگے ہیں۔ خلیق صاحب کی مدوین متن بالکل سائنٹفک ہے۔"

جناب مالک رام نے تفصیلی طور پر ڈاکٹر خلیق انجم کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اپنے تاثرات ان الفاظ میں پیش کیے ہیں۔

غرض، ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اب ہمیں خطوط غالب کا ممکنہ حد تک، ایک مکمل مجموعہ دستیاب ہو جائے گا اس کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم پوری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔"

ڈاکٹر مختار الدین احمد نے غالب کے خطوط کی روشنی میں خلیق صاحب کی محنت و عرق ریزی کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"چار جلدوں میں اپنی نوعیت کے پہلے تحقیقی کارنامے کی ترتیب پر ڈاکٹر خلیق انجم اور اس کی اشاعت پر غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ہر طرح مبارکباد کے مستحق ہیں۔"

وہ آگے لکھتے ہیں:

"غالب کے خطوط، غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ غالب شناس اس کتاب کی وہ قدر کریں گے جس کی یہ مستحق ہے۔"

جناب رشید حسن خاں نے اس عظیم کام کے انجام دینے پر ڈاکٹر خلیق انجم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس طرح خراج تحسین ادا کیا ہے۔

"میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی پبلیکیشن کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے، انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے اور کمیٹی کی طرف سے خلیق انجم صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی اس کتاب سے جہاں غالب شناسی کے ذخیرے میں اہم اضافہ ہوگا وہاں اس ادارے کی فہرست مطبوعات میں ایک ایسی کتاب کا اضافہ ہوگا جسے صحیح معنوں میں اہم کتاب کہا جا سکے گا۔ ایسی اہم کتاب جس کا مطالعہ ہر غالب شناس کے لیے از بس ضروری ہوگا۔"

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے خلیق صاحب کی غالب شناسی اور غالب کے خطوط کی ترتیب و تدوین پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

"غالبیات میں انھوں نے اب تک جو کام کئے تھے وہ بھی ان کی سرخروئی کے لیے کافی تھے لیکن اس کارنامے نے انھیں غالب شناسوں کی صف اول تک پہنچا دیا ہے۔"

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے 'غالب کے خطوط' کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی چاروں جلدوں کا جائزہ لیا ہے اور ڈاکٹر خلیق انجم کو شکریے کا مستحق قرار دیتے ہوئے کہا ہے:

"ان جلدوں کی اشاعت غالبیات کی تاریخ میں بنیادی نوعیت کا کارنامہ ہوگی۔ بلاشبہ اس عملی اقدام کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم پوری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔"

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے ڈاکٹر خلیق انجم کی 'متنی تنقید' کے میدان میں خدمت کی تعریف کرتے ہوئے 'غالب کے خطوط' پر اپنی رائے کا اس طرح اظہار کیا ہے۔

"اردو میں متنی تنقید کے موضوع پر ڈاکٹر نذیر احمد، قاضی عبدالودود اور دوسرے محققین کے مضامین شائع ہوئے تھے لیکن اس موضوع پر متنی تنقید کے نام سے پہلی بار باقاعدہ کتاب ڈاکٹر خلیق انجم نے ہی لکھی تھی 'متنی تنقید' میں ترتیب متن کے طریقۂ کار سے بحث کی گئی ہے اور 'غالب کے خطوط' میں 'متنی تنقید' کے اصولوں کا عملی روپ دکھایا گیا ہے مجھے یقین ہے کہ 'خطوط غالب' کا یہ تنقیدی اڈیشن غالب شناسی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے گا۔ اور اہل ذوق اس کی پذیرائی کریں گے۔"

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے 'غالب کے خطوط' پر اس طرح اظہار رائے کیا ہے۔

"میرے نزدیک 'غالب کے خطوط' (جلد اول)، ایک ایسا کارنامہ ہے۔ جو فاضل محقق اور نقاد کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی کی بدولت ہمارے تحقیقی اور تنقیدی ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

ڈاکٹر خلیق انجم کی محنت اور کوشش کی داد دیتے ہوئے وہ آگے لکھتے ہیں۔

"اور ان سب سے بڑھ کر قابل قدر کام جو ڈاکٹر خلیق انجم نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے مختلف واقعات، حالات اور شواہد کی روشنی میں غالب کے ان خطوط کی تاریخ تحریر متعین کی ہے جن پر تاریخ تحریر درج نہیں تھی گویا اس اعتبار سے غالب کے خطوط کی یہ چار جلدیں خطوط غالب کے تعلق سے ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہیں"

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے 'غالب کے خطوط' پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے خلیق صاحب کے اس قابل قدر کام کی تعریف اس انداز سے کی ہے۔

"خلیق انجم صاحب کا یہ علمی کام اردو ادب اور غالبیات میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔"

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے خلیق صاحب کی غالب سے غیر معمولی دلچسپی، خطوط غالب کی ترتیب و تدوین متن کے کام میں خلوص، لگن اور محنت اور اس سلسلے میں ان سے اپنی ذاتی واقفیت کی روشنی میں ان کو ماہرین غالبیات کی صف میں شمار کرتے ہوئے ان لفظوں میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

"غالب نے اپنے خطوط میں جن واقعات، افراد، مقامات، کتب و رسائل کا ذکر کیا ہے خلیق صاحب نے ان سب پر بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے تفصیلی حواشی لکھے ہیں یہ حواشی وہی شخص لکھ سکتا تھا جس کی غالب اور اس کے عہد پر غیر معمولی نظر ہو اسی لیے خطوط غالب کے اس تنقیدی اڈیشن نے خلیق صاحب کو ماہرین غالب کی صف میں کر دیا ہے۔"

'غالب کے خطوط' کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم پرویز نے خلیق صاحب کے اس کارنامے کو حرف آخر قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس کام کو سب سے زیادہ مستند اور معتبر کہتے ہوئے ان الفاظ میں اپنی رائے دی ہے۔

"ہر زمانہ اپنے ساتھ اپنا شعور بھی لے کر آتا ہے اور پھر زمانے کے اسی شعور کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے جب کوئی با ہنر ادیب یا محقق کچھ پیش کرتا ہے تو اس کی پیش کش بالکل حرف آخر کی طرح ہمارے سامنے آتی ہے ادبی تحقیق کے میدان میں زمانے کے شعور کے دائرے میں تنقید و ترتیب متن کے جدید ترین معیار اور تصورات بھی آتے ہیں اس اعتبار سے ڈاکٹر خلیق انجم کے ترتیب دیے ہوئے 'غالب کے خطوط' بھی آج ایک حرف آخر کا حکم رکھتے ہیں اس لیے کہ غالب کے خطوط پر اب تک جو کچھ بھی کام ہوا ہے ان میں آج کے معیاروں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ سب سے زیادہ مستند اور معتبر کام ہے۔"

ڈاکٹر شارب ردولوی نے 'آجکل' میں تبصرہ کرتے ہوئے 'غالب کے خطوط' پر تحریر کیا ہے۔

"ڈاکٹر خلیق انجم اردو کے مشہور محقق ہیں اس سے قبل غالبیات پر ان کی دو کتابیں 'غالب اور شاہان تیموریہ' اور 'غالب کی نادر تحریریں' شائع ہو چکی ہیں اس کے علاوہ مرزا محمد رفیع سودا پر ان کا تحقیقی کام اور تنقید متن پر ان کی کتاب متنی تنقید اردو تحقیق میں ایک اہم

مقام رکھتی ہے وہ محنت اور لگن سے کام کرنے کے عادی ہیں تحقیق متن کے سائنٹفک طریقۂ کار اور اصولوں پر ان کی نگاہ بہت گہری ہے 'غالب کے خطوط' ان کا تازہ تحقیقی کارنامہ ہے۔ جو یقیناً مطالعۂ غالب میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔"

ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی کا بیان ہے۔

"یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا کہ جہاں تک غالب کی اردو نثر اور اس کی اردو ادب میں اہمیت کا تعلق ہے ڈاکٹر خلیق انجم کے 'غالب کے خطوط' سے بہتر کسی تحقیقی کارنامے کا تصور بھی محال ہے۔"

ڈاکٹر صلاح الدین نے آل انڈیا ریڈیو کی اردو مجلس سے تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا۔

"ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کام کی انجام دہی میں جس محققانہ اور ناقدانہ دقت نظری کا ثبوت دیا ہے وہ ہمارے ادب میں بڑی حد تک کامیاب ہے غالب کے خطوط ایک ایسا کارنامہ ہے جو فاضل محقق اور نقاد کی دیدہ ریزی اور جگر کاری کی بدولت ہمارے تحقیقی اور تنقیدی ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا یہ کام در حقیقت انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کام نے ڈاکٹر خلیق انجم کو ماہرین غالب کی صف اول میں شامل کردیا ہے۔"

ایم حبیب خاں نے برہان کے جون ۱۹۸۴ء کے شمارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس تنقیدی اڈیشن میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو دوسرے مجموعوں میں نہیں ملتیں ڈاکٹر خلیق انجم اردو کے ممتاز محقق اور ماہر غالبیات ہیں انھوں نے بڑی محنت اور دلسوزی سے تحقیق کر کے ان خطوط کے ایسے حواشی لکھے ہیں جن سے بہت سی نئی باتوں کا سراغ ملتا ہے جس طرح غالب کی تحریروں کا ایک ایک لفظ اہل بصیرت کی آنکھوں کا سرمہ ہے اسی طرح 'غالب کے خطوط' کا یہ اڈیشن بھی غالب پرستوں کے لیے ایک خاصے کی چیز ہوگا۔"

رضوان احمد نے عظیم آباد ایکسپریس (پٹنہ) میں تبصرہ کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"'غالب کے خطوط' غالب کی مکتوب نگاری کا ایک انسائیکلو پیڈیا ہے ڈاکٹر خلیق انجم نے ان کی ترتیب و تدوین کا کارنامہ انجام دے کر اردو ادب میں ایک بڑا اضافہ کیا ہے اور ماہر غالبیات کی حیثیت سے انھوں نے اپنا لوہا منوا لیا ہے۔"

اردو کے محققوں، نقادوں، دانشوروں اور صحافیوں کے خیالات، بیانات اور تبصروں کے علاوہ ہندی پریس نے بھی اس کتاب پر تبصرے کیے ہیں جنھیں طوالت کے خوف سے یہاں نہیں دیا جا رہا ہے۔ لیکن جب یہ مقالہ شائع ہوگا تو انھیں بھی اس میں شامل کر لیا جائے گا۔ مگر انگریزی تبصروں کے چند اقتباسات یہاں پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ 'غالب کے خطوط' کی پذیرائی میں اردو اور ہندی کے علاوہ انگریزی پریس بھی پیش پیش رہ کر خراج تحسین ادا کر رہا ہے۔

But Dr. Khaliq Anjum's work is a work with a difference and the first of i'ts kind in the sub-continent. The learned scholar has compiled all the available letters of Ghalib in four volumes and determined as far as possible the date of each of those letters on which Ghalib had not put any date. He has made full efforts to see that the correct version of these letters in included in the book "Ghalib Ke Khatoot". --------- To say the least "Ghalib Ke Khutoot" edited by Khaliq Anjum is an encyclopaedia of Ghalib's letters.

KASHMIR TIMES
3-7-84

Not only Delhiwallahs but all lovers of art and letters owe a debt to Dr. Anjum for his painstaking work which he completed after years of research in India and abroad. It brings Ghalib alive to us and we see the poet to as he really was- all along with the excitement of everyday things which he transformed into momentous events.

STATESMAN
30-7-84

Dr. Khaliq Anjum's present research on the Ghalib letters the most systematic, scientific and comprehensive so far without detracting from the valuable work done by the earlier researchers.

YOGI [illegible]
TIMES OF INDIA
2-7-84

اردو کے حالات ہرگز اتنے سازگار نہیں کہ غالب کے خطوط چار جلدوں میں شائع کیے جا سکتے ہم غالب انسٹی ٹیوٹ کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ وہ یہ جوئے شیر لانے میں کامیاب ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کا کوئی بھی پبلشر یا ادارہ اتنا بڑا کام شائع کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا انسٹی ٹیوٹ نے کتاب کو جس حسن و خوبی اور جس سلیقے کے ساتھ شائع کیا ہے وہ اس کا حق ہے۔ یہ کتاب بین الاقوامی معیار پر ہر طرح پوری اترتی ہے۔ جس کے لیے غالب انسٹی ٹیوٹ کے جملہ ارباب حل و عقد اور شعبۂ طباعت کے کارپردازان ہمارے اور پوری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔

ظ۔ انصاری

غالب کے خطوط پر خلیق انجم کا قابلِ قدر کام

اب تک منظرِ عام پر آئے ہوئے غالب کے ۸۰۰ خط اس عظیم شاعر کی شاعری کا مکمل اشاریہ ہیں۔ اس کی تشریح میں رہنمائی کرتے ہیں۔ ذہنی فضا کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ غالب جس طبقے کا آدمی ہے اس طبقے کے رنج و راحت کا منظرنامہ تیار کرنے میں قلم تھامنا سکھاتے ہیں۔ جس دور میں جن حالات میں اس نے عمر بسر کی اس دور، ان حالات کا رنگین خاکہ پیش کرتے ہیں اور سب سے اہم بات ان خطوں کے بارے میں یہ کہ اگر ان کو اول تا آخر نظر میں رکھا جائے تو غالب کو اس کے ذہن و جستجو کو، اس کی تمنا کے پہلے اور دوسرے اور آخری قدم کو پہچاننے میں آدمی گمراہی سے اور اوندھے سیدھے معانی پہنانے سے بچ جاتا ہے یہ اتنی سامنے کی بات نہیں ہے۔ ویسے ذرا کھول کر کہوں:

فکر اور تاثر کے بعض لمحے ہوتے ہیں کڑکتی بجلی کی طرح یکبارگی کوندنے والے، اندھے راستے سجھانے والے، چندھیانے والے، بعض لمحے گھنٹے، دن اور موسم ہوتے ہیں، لو کی طرح بدن کو جھلسانے والے فاسد مادے کو جلا ڈالنے والے اور بعض ایسے ہوگئے ہیں کہ گزراں اور بے مروت وقت کے ساتھ رنگ بدلتے، رنگ و صورت پکڑتے جاتے ہیں ـــ یہاں تک کہ ارتقا کا ایک دائرہ، کمانی کی صورت میں دائرہ بناتے بناتے وہ فنکار کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں، لباس کی طرح نہیں، نسوں کی طرح اور وہ لہو کی گردش میں شریک ہوجاتے ہیں۔ کوئی ایک خیال یا ایک خاص لفظ یا ترکیب غالب کے اشعار میں سے چن لیجیے کہیں اس کے متعلقات و اشارات کچھ ملیں گے، کہیں کچھ، جدھر چاہیے ربڑ کی طرح کھینچیے چلے جائیے، جو جی میں آئے، غالب ہی کی زبان سے ثابت کر دکھائیے۔ شاعر کو کسی بھی الزام میں اقبالی مجرم بنا کر کٹہرے میں کھڑا کر دیجیے۔ بہت آسان ہے لیکن یہ خط ـــ جو بظاہر بیس بائیس برس کے عرصے میں لکھے گئے، ذاتی طور پر لکھے گئے ان کے منظرِ عام پر آنے کا گمان تک نہ تھا۔ تب لکھے گئے، بے تکلف دوستوں کو، شاگردوں اور عقیدت مندوں کو، اہلِ معاملہ کو لکھے گئے۔ یہ خط غالب کی پوری زندگی کا، ذہنی اتھل پتھل کا، خیالات، برتاؤ اور اپروچ کا، ذہنی سفر کا، پسند و ناپسند کا، رد و قبول کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ انھیں اچھی طرح پڑھ چکنے کے بعد اس کی آدھی صدی کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ کس لمحے کی، کس شعر کی، کس خیال کی، کس موڈ کی اس کے نزدیک کیا اہمیت ہے اس خیال، تاثر نما موڈ یا جذبے نے زمانے کے ساتھ ذہن کی تب و تاب کے ساتھ کون سے رنگ اپنائے اور کتنے پلٹے کھائے ہیں۔

یوں غالب کے یہ ۸۰۰ خط اور مل جائیں تو وہ بھی، غالب شناسی میں ہمارے سچے رہنما ہیں اور ان کے بغیر غالب، شخص و شاعر کا مطالعہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ یہ خصوصیت بھی دنیا بھر میں کسی کسی کو نصیب ہوئی ہوگی۔

پہلے تو غالب اس خیال سے ہی بد کے تھے کہ نجی خط چھاپے جائیں، پھر نرم پڑے پھر اس جہاں دیدہ مردم گزیدہ بزرگوار نے اصل معاملے کی اونچ نیچ کو پہچانا، پھر خود بھی خط جمع کرنے میں ہاتھ بٹایا۔ یہاں تک کہ خطوں کے دو ضخیم مجموعے چھاپے میں آگئے۔ چھاپے کی مشین ابھی چل ہی رہی تھی کہ شہرت اور طلب کی ہوا چلی اور ایک ہی کتاب (عود ہندی) کی تعداد اشاعت بڑھادی گئی (یہ نکتہ خود خلیق انجم صاحب کی دریافت ہے) غالب کی آنکھ بند ہوتے ہوتے وہ وقت آیا کہ اردو شاعری سے زیادہ ان خطوں کا پرچار ہونے لگا اور انھیں نصاب میں شامل کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ وہ جدید اردو نثر کا ایک مثالی نمونہ قرار دیے گئے۔ غالب کو میں اس کی بادہ خواری سمیت ایسا ولی مانتا ہوں جس کی بصیرت اگلے پچھلے زمانوں میں لیزر بیمز (Laser beams) کی مانند تیر جاتی تھی مگر اپنی معنوی اولاد کے مستقبل پر بھرپور یقین رکھنے کے باوجود کہ وہ تا قیام قیامت زندہ و توانا رہے گی، وہ اس کا بچا زائچہ نہ بنا سکا۔ یہاں اس کی جیوتش دو یا بچہ کھا گئی۔ آج ہم اس کے فارسی کلام کی قدر کرنے کے قابل ہیں تو اردو کلام کی معرفت اور اردو کلام کو سمجھنے، اس کی صحیح داد دینے کے قابل ہیں تو اس کے اردو خطوط کی مدد سے جو زندگی بھر کے فنی کارناموں میں اس کے نزدیک سب سے کم سواد تھے۔

غالب خود کتنا ہی بڑا فنکار ہو، مگر زمانے کا پراسرار فنکار اس پر بھی غالب آیا اور اپنا فتویٰ صادر کر گیا۔

چار جلد خطوط غالب میں جلد اوّل

غالب انسٹی ٹیوٹ نے حال میں دو مجموعے چھاپ کر اپنے وجود کا تازہ ثبوت دیا ہے۔ ایک غالب کی تمام فارسی مثنویات مع اردو ترجمہ (ظ۔ انصاری)، اور دوسرا "غالب کے خطوط ــــــ جلد اول" دونوں کی ہی کئی جلدیں اور نکلیں گی۔ یکے بعد دیگرے غالب کے خطوط کی یہ پہلی جلد اول سے آخر تک پوری توجہ سے پڑھی تو دل سے بے اختیار واہ وا نکلی۔ کیا عمدہ کام ہوا ہے۔ غالب خود اپنی تصانیف کی اشاعت پر جتنی دیدہ ریزی، احتیاط اور نفاست سے کام لیتے تھے، وہی یہاں بھی صرف ہوئی ہے یعنی یہ مجموعہ واقعی غالب کے شایانِ شان ہے گویا ایک قبا ہے جو اس جامہ زیب استاد کے بدن پر راست آئی ہے۔

شروع میں ۲۲۰ صفحے کا مقدمہ جس کے کئی حصے ہیں، تنقیدی اور علمی متن کے اصول، جو رائج ہیں، جو متروک ہوئے، جو کام میں لائے گئے، پھر خطوط غالب کے آج تک کے سارے ایڈیشنوں کی تنقیح اور تنقید پھر ان خطوط کی خطوط نگاری کے پس منظر میں قدر و قیمت اور خصوصیات، پھر انڈکس اور متعلقہ وضاحتیں۔

اس طرح یہ مقدمہ بجائے خود ایک علمی تحقیقی مقالے کا وزن رکھتا ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی تو خلیق انجم پہلے سے ہیں اس مقالے پر اگر انھیں کوئی علمی ادارہ "ڈی لٹ" دے نکلے تو بے جا نہیں، برحق ہوگا۔

مقدمے کی خصوصیات میں ایک یعنی زمانہ نہایت کمیاب ہے۔ ہم موضوع اور ہم قلم معاصرین سے شرافت کا برتاؤ، اگلوں کا محافظ، یہ برتاؤ کوئی کسی کو سکھاتا نہیں، علم اور تجربے کی برتری کے ساتھ خود دیکھا جاتا ہے۔ چند مثالیں:

(۱) "خلیق انجم کو دوران تحریر پتہ چلتا ہے کہ تمام مکتوب الیہم کے حالات کاظم علی خاں نے بڑی محنت سے لکھ لئے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ حالات بہت مختصر کر دیے۔" ص ۲۳

(۲) "ادبی خطوطِ غالب" مرتبہ مرزا محمد عسکری کی بابت " اس موضوع پر شاید یہ پہلی جامع تحریر ہے۔ اس انداز کا کام اردو میں پہلی بار ہوا ہے۔" صہ

(۳) "مکاتیبِ غالب" مرتبہ: امتیاز علی خاں عرشی۔

"میں یہ بات پورے وثوق اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ "مکاتیبِ غالب" سے پہلے کسی اردو متن کا ایسے سائنٹیفک انداز میں تنقیدی اڈیشن تیار نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے بعد بھی جہاں تک میرا مطالعہ ہے ایسا تنقیدی اڈیشن تیار نہیں ہوا جسے "مکاتیبِ غالب" کے مقابلے میں رکھا جا سکے۔" صہ۴۲

(۴) "غالب کی نادر تحریریں" مرتبہ خلیق انجم

"اس مجموعے میں متنی تنقید کے کسی بنیادی اصول کی پابندی نہیں کی گئی متن کی ترتیب میں بہت لاپروائی سے کام لیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ متن میں بےشمار غلطیاں راہ پا گئیں اور ایک اچھا کام ناتجربہ کاری کی نذر ہو گیا۔" صہ۵۳

علمی کام میں چھان پھٹک، دیدہ ریزی اور ماحول کی سنجیدگی خود ایک تربیت گاہ بن جاتی ہے۔ صلاحیت ہو تو آدمی اس کے ساتھ ساتھ پتا، پگھلتا رہتا ہے، یہ جلد اول اسی کی ایک زندہ مثال ہے:

مرتب موصوف نے جہاں دوسروں کی غلطیوں کی نشان دہی کی وہاں لہجہ محتاط رکھا اور تُلی تُلی بات کی، تحقیر سے دامن بچایا۔ مولانا غلام رسول مہر کے مرتبہ "خطوطِ غالب" پڑھتے وقت ہمیں بار بار غصہ آتا تھا کہ کوئی عالمی سائنسی اصول اور تدوینی احتیاط یہاں صرف نہ ہوئی۔ خلیق صاحب کو بھی طیش آیا ہوگا مگر انھوں نے اپنے کام کا پاس و لحاظ کیا اور صرف اتنے پر اکتفا کی۔

"۔۔۔ مولانا ایک جید عالم تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں، غالب کے خطوط کی ترتیب میں انھوں نے بہت لاپروائی بلکہ غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ مولانا نے متنی تنقید کے کسی اصول کی پابندی نہیں کی۔ جن خطوط کے عکس ان کے پیشِ نظر تھے ان میں سے ایک کے متن میں بیس اور دوسرے کے متن میں نو (۹) غلطیاں ہیں اس لیے اس مجموعے پر مزید تبصرے کی گنجائش نہیں ہے۔" صہ۵۲

دو جلد مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل کے بارے میں:

"۔۔۔ خط کے عکس کا فاضل صاحب کے مرتبہ متن سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ فاضل صاحب کے متن میں پندرہ غلطیاں پوری کتاب کو ناقابلِ اعتبار بنانے کے لیے کافی ہیں۔۔۔"

"اس کی افادیت کے پیشِ نظر اتنی بڑی غفلت حیرت انگیز ہے۔" صہ۵۹

مرتب موصوف نے املا اور علامات اوقاف کے تعلق سے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ مکھی پر مکھی مارنے والے محققوں کو شاید پسند نہ آئے لیکن علمی اعتبار سے وہی قابلِ قبول ہے۔ غالب نے بعض الفاظ کا املا ایک ہی طرز پر نہیں لکھا کہ ہم آنکھ بند کر کے جوں کا توں نقل کر دیں اور آج کے پڑھنے والوں کو خواہ مخواہ مصیبت میں ڈالیں۔ پھر سوا سو سال میں انشا و املا کی تھوڑی بہت اصلاحیں بھی ہوئی ہیں۔ ان کو کیوں نظرانداز کر دیا جائے؟

اردو کا نثری سرمایہ اور مکتوب نگاری:

کے ضمنی عنوان کے تحت خلیق انجم نے ۲۲ صفحوں میں تحقیق و تنقید کو یکجا کر دیا ہے یہ حصہ اور تفصیل سے ہوتا

تب بھی گراں نہ گزرتا لیکن غالباً انھیں خیال گزرا کہ مکتوب نگاری کے فن پر جتنا کچھ لکھ سکتے ہیں وہ یہیں لکھ دیں، چناں چہ وہ یونان و مصر و روما سے لے کر کارلائل کی بیوی تک کے خطوں کا کیٹلاگ بنانے پر اتر آئے اس عبارت میں بڑی تقدیم و تاخیر ہو گئی۔ باب مختصر ہے سہنا دشوار نہیں، البتہ اسلوب نگارش کی جو بحث ہے وہ ظاہرا گہرائی اور حاصل مطالعہ ہونے کے باوجود کچی ہے۔ سطح ہموار، اندر سے ناہمواری۔

مختصراً یہ کہ زبان کی مخصوص صرفی و نحوی ترتیب، مفہوم کی ادائیگی کے لیے مخصوص الفاظ کا استعمال بعض ایسے الفاظ کا جو متروک ہو گئے ہوں، یا زبان میں کم استعمال ہوتے ہوں، یا تحریر میں نہیں صرف گفتگو میں مشتمل ہوں، کسی دوسری زبان کے الفاظ کا استعمال، الفاظ کی تکرار، بعض کلیدی الفاظ کا بکثرت استعمال اور صنائع بدائع سے مل کر کسی شاعر یا ادیب کا اسلوب بنتا ہے۔"

اسلوب تو رگوں میں دوڑنے پھرنے اور آنکھ سے اُس طرح لفظ کے ٹپکنے میں بنتا ہے کہ "ایک مدت تک کا غذ نم" رہے۔ اسلوب تو وہ شخص ہے، وہ شخصیت ہے (اچھی، بُری، پختہ یا خام جیسی بھی ہو) جو صاحب اسلوب ہو رہا،" کلیدی الفاظ کا بکثرت استعمال اور الفاظ کی تکرار" تو اس کی ایک بھدی سی مگر پر لطف مثال خود اس مقدمے میں موجود ہے کہ خلیق انجم صاحب نے کوئی اٹھارہ جگہ ۱۸۵۷ء لکھا اور ہر جگہ اس سنہ کے ساتھ "کے ناکام انقلاب" کی تکرار کی ہے۔ "ناکام انقلاب" ان کا کلیدی لفظ اپنی ۱۸ ویں تکرار کے باوجود اسلوب نہیں، اسلوب کی نفی بن گیا ہے اور ایک عادت کی ترجمانی۔ ناصاحب، توبہ کیجیے، تحریر و تقریر کے فرق پر اتنا زیادہ زور دینے سے درگزر فرمائیے!

صـ۹۸۔ ۱۹۷ پر جو گتھی ہوئی اور نہایت معنی خیز عبارت، غالب کا رنج و راحت سے برتاؤ پیش کرتی ہے۔ پہلی نظر میں تو وہ مجھے خود اپنا بیان معلوم ہوئی (کیوں کہ میں نے غالب کی قدر جانی ہے اسی رخ سے) پھر افسوس ہوا کہ یہ مرتب موصوف کی عبارت کیوں ہے۔ اسے تو ہمارے قلم سے ٹپکنا چاہیے تھا۔ ملاحظہ ہو:

غالب نے 'جان عزیز' کے لیے آرزو اور شکست آرزو، خوشی اور غم، کامیابی اور ناکامی کے درمیان زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا اسی لیے تو وہ اپنے آپ کو "ہدف ستم ہائے روزگار" نہیں بلکہ "زہین ستم ہائے روزگار" کہتے ہیں۔ اس ستم ہائے روزگار" سے ان کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی اور ان کی حسِ مزاح ماند نہیں پڑی بلکہ اور تیکھی ہوتی چلی گئی۔ ایک حقیقی مزاح نگار کی طرح غالب زندگی کی ان تمام ناہمواریوں اور کھردرے پن پر سے ہنستے ہوئے برہنہ پا گزر جاتے ہیں۔ جن پر چلتے ہوئے پاؤں لہو لہان ہو جاتے ہیں۔" صـ۱۹۸ بڑی کھری اور نکتے کی بات لکھی گئی ہے۔ غالب کے خطوط کے ضمن میں، تاہم یہ انداز خلیق انجم کا مستقل طرز تحریر نہیں ہے۔ وہ سادہ لکھتے ہیں، گفتگو کے لہجے سے قریب رہتے ہوئے چلتے ہیں اور علمی سنجیدگی برقرار رکھتے ہیں۔ اپنے مزاج کی شوخی کو تحریر میں راہ نہیں دیتے۔

انھوں نے یہ جتاتے ہوئے کہ غالبؔ کی اردو میں فارسی کے چھینٹے کہاں کہاں پڑے ہیں۔ بعض جگہ ٹھوکر کھائی ہے۔ مثلاً یاد نہ لانا، فارسی میں "یاد نیاوردن" "بیاد نیاوردن" ہے۔ نامور بنانا" غالب نے نہیں گڑھا، دل بہت جلا، بھی دلم سوخت کا غالب نے ترجمہ نہیں کیا یہ ٹھیٹھ دہلوی ہے: میر ؎

دل جلے بن نہیں آتی، حال بگڑتے جاتے ہیں

نقش قبول کرنا، نقش پذیرفتن سے ماخوذ ہے۔ قبول کردن سے نہیں "غم کھانا" غالب نے غم خوردن سے نہیں لیا

ـــــ دکنی اردو تک میں موجود تھا اسی لیے محاورہ ہے کم کھانا اور غم کھانا ایک غلطی البتہ غالب سے سرزد ہوئی اور وہ آج تک اس کی گرفت سے بچے ہوئے ہیں۔ "رقعات عالمگیری" کو "انشائے خلیفہ" کے ساتھ برابر تولنے کی (ص ۱۵۴) رواج تو تھا۔ دفتر انشاء کی خاطر ان دونوں کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کا لیکن دونوں کے مزاج میں مشرق و مغرب کا فرق "رقعات" کے حیرت انگیز ایجاز اور اشاریت سے تو آج بھی لکھنا سیکھا جاسکتا ہے۔ کمال کی نثر ملتی ہے رقعات میں۔

زیر نظر کتاب بند کرتے وقت جہاں ہمیں یہ احساس ہوا کہ مرتب کو اس کے حق کی پوری داد ہم نہیں دے سکے۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ پہلی جلد تفتہ کے نام ۱۲۳ خطوں پر کیوں نہ تمام ہوگئی؟ یا مقدمہ کے ۲۲ صفحوں کو الگ کتابی شکل دے کر کیوں نہ پہلی جلد میں سارے خطوط جمع کیے گئے۔

لاہور کے مشہور ماہنامے "بزم دانش" نے جون ۱۹۸۹ء کے شمارے میں ڈاکٹر خلیق انجم پر جو اداریہ لکھا تھا، وہ پیش خدمت ہے۔ (ر۔خ)

لمحہ فکریہ

آج کے بھارت میں سفینۂ اردو کے ناخداؤں میں جو نام زیب زبان ہیں ان میں ایک نہایت ہی اہم نام ڈاکٹر خلیق انجم کا بھی ہے وہ بلند پایہ محقق، نامور دانش ور اور ممتاز ادیب ہیں۔

انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری اور اردو اکادمی دلّی کے اساطین میں سے ہیں اور ان مؤقر اور بے مثال اداروں کے ذریعے اردو ادب اور علمی و تحقیقی میدان میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں ان کی بنیاد پر یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ برصغیر پاک و ہند ہی نہیں دنیا میں جہاں جہاں اردو کے شائقین موجود ہیں وہ ان کی متاع عزیز اور گراں قدر سرمایہ ہیں نامساعد حالات میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے ڈاکٹر صاحب موصوف اور ان کے رفقاء کی مساعی جمیلہ اور تحقیق کے لق و دق صحرا میں پھول اگانے کی قابل قدر کاوشیں بھی کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ وہ جس قبیلہ حریت اور علم و دانش سے تعلق رکھتے ہیں اور جس کاروان جہد و عمل سے ان کا علاقہ ہے وہ ہمیشہ راہ کے خطرات سے بے نیاز جان جوکھوں میں ڈال کر منزل کی طرف بڑھتا رہا ہے، اس کی سوچ مثبت، انداز حکیمانہ، طریق کار سائنٹفک اور اخلاص و ایثار پیشگی شیوہ رہا ہے اور بالآخر کامیابی نے اس کے قدم چومے ہیں اور وہ شہرت عام اور بقائے دوام کے آسمان پر جلوہ فگن ہوئے ہیں، ہمیں امید ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقاء کی کوشش اور علمی و تحقیقی کاوشیں بھی ضرور رنگ لائیں گی اور ان کی کامرانی کا آفتاب نصف النہار پر ضوبار ہوگا۔

ان سطور سے ڈاکٹر صاحب موصوف اور ان کے کام کے بارے میں نہ تو کوئی اظہار خیال مقصود ہے اور نہ ہی انجمن ترقی اردو ہند اور اردو اکادمی دلّی کی لافانی خدمات پر روشنی ڈالنا مطلوب ہے کہ ایسا کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی باعظمت، مدبرانہ اور دور اندیش شخصیت اور ان سے گفتگو کے نتیجے میں ان کی سوچ کے ایک ناویے سے پاکستان میں اردو کے علمبرداروں کو روشناس کر کے اردو کے مستقبل کے بارے میں دعوت غور و فکر دی جائے۔

عاشور کاظمی

جنرل خلیق انجم

کل برطانیہ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر
صدیق الرحمٰن قدوائی کے استقبالیہ کے موقع پر عاشور کاظمی صاحب
کا خطبۂ استقبالیہ ——— لندن ۲۶ ستمبر ۱۹۸۳ء

آج کی شام اپنے دامن میں ہمارے لیے دنیائے علم وادب کے شمس وقمر لے کر آئی ہے۔ اجالے کی اس فراوانی میں آج ہم دو دانشوروں کو اپنے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ صدر محفل پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی جواہر لعل یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے پروفیسر ہیں، انگریزی تصانیف کے علاوہ اردو میں ان کی تخلیق "ماسٹر رام چندر" اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ پروفیسر قدوائی مفکر، دانشور، مقرر اور استاد ہیں۔ وہ لوگ جو ہندوستان میں اردو کی عظمت کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں پروفیسر قدوائی کا نام ان میں ایک اہمیت کا حامل ہے۔

دوسری شخصیت جن کے اعزاز میں ہم آج کی شام منا رہے ہیں ڈاکٹر خلیق انجم ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ہیں۔ صاحبو سکریٹری کی حد تک تو بات مناسب تھی لیکن یہ لفظ جنرل جو ان کے ساتھ لگا ہے کم از کم میرے لیے پریشانی کا باعث ضرور ہے۔ ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے ایسے ہر جذبے یا عادت کے پس منظر میں نفسیاتی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ لفظ جنرل سن کر مجھ پر جو کپکپی طاری ہوتی ہے اس کے بھی یقیناً کچھ اسباب ہیں جو اس محفل کا موضوع نہیں۔ آپ کہیں گے میں اپنی کمزوری چھپا رہا ہوں۔ میں ڈرپوک ہوں تو صاحبو مجھ کو ڈرپوک کہنے والے جیالے ذرا میرے وطن جا کر دیکھیں وہ کوڑے کھائیں گے یا کوڑے انھیں کھا جائیں گے۔ یوں بھی شیخ سعدی نے فارسی میں کہا ہے "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز"۔ اب یہ شیخ سعدی نے کیوں کہا ہے یہ آپ سعدی سے پوچھیں البتہ اگر آپ اردو میں کچھ سننا چاہیں تو میں اکبر سرحدی مرزا محمود سرحدی کا ایک شعر سنا سکتا ہوں۔

"جھوٹ کہتا ہوں اور بے کھٹکے
کون سچ کہہ کے دار پر لٹکے"

میرے ذاتی علم اور مشاہدے کی رو سے لفظ جنرل کے معنی ہیں حاکم۔ میں نے فیروز اللغات سے لے کر اردو کی تازہ اور مبسوط لغت مہذب اللغات تک دیکھی ہے، لیکن کہیں بھی مجھے لفظ 'جنرل' حاکم کے معنی میں نہیں ملا۔ مہذب اللغات "خاندان عشق وتعشق کے چشم وچراغ جناب مہذب لکھنوی کی کم وبیش ساٹھ سال کی شب وروز کاوشوں کا نچوڑ ہے، پوری لغت غالباً چودہ جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ جس میں سے بارہ جلدیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ حضرت مہذب لکھنوی نے ہر لفظ کے معنی، مخرج، محل استعمال اور آوازوں کے سلسلے میں دوسری تمام اہم لغات کے حوالوں کے اندراج کے علاوہ اپنی تحقیق کو شریک اشاعت فرمایا ہے۔ تقریباً ہر لفظ

کے منظوم عمل استعمال کے لیے اساتذہ کے اشعار سے سند دی ہے۔ یہ ساری کاوش بلاشبہ اردو زبان کا انمول سرمایہ ہے لیکن اس عظمت کے اعتراف کے باوجود میں یہی عرض کروں گا کہ اردو کی ترویج اور ترقی جس قدر میرے ملک میں ہوئی ہے اور کہیں نہ ہو سکی۔ اب اس لفظ جنرل کو ہی لے لیجیے۔ حضرت مہذب لکھنوی بھی اس لفظ کے ان معانی سے واقف نہیں جو میرے ملک پاکستان کا عام آدمی جانتا ہے۔

صاحبو! میں جب سے ڈاکٹر خلیق انجم سے ملا ہوں اسی وقت سے مجھ پر ان کی حاکمیت کا دبدبہ طاری تھا لیکن ایک کہاوت ہے کہ "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" جناب پروفیسر قدوائی نے چپکے سے میرے کان میں راز کی ایک بات کہہ دی اور وہ یہ کہ میں جس لفظ کو سن کر کانپ جاتا ہوں وہ انگریزی کا لفظ "جنرل" ہے۔ اردو میں اس لفظ کو جرنیل کہتے ہیں اور مجھے مادام نورجہاں اور ان کا ایک نغمہ یاد آگیا۔ "میرا ماہی کرنیل نی، جرنیل نی" ایک زمانہ تھا جب مادام نورجہاں کرنیل جرنیل قسم کے لوگوں سے محبت اور شفقت فرماتی تھیں معلوم نہیں آج کل ان کی محبت اور شفقت کس حال میں ہے۔ مادام نورجہاں میرے لیے جناب مہذب لکھنوی سے زیادہ مستند ہیں اور ان کی تصدیق مہذب اللغات سے زیادہ اہم ہے اس لیے کہ میرا تعلق عوام سے ہے اور عوام طاقت کا سرچشمہ ہوتے ہیں اور طاقت جو فیصلہ کردے وہی انصاف ہوتا ہے۔ اس صداقت کو ہمارے بڑوں نے مانا ہے، ہم نے خود دیکھا ہے کہ ایک مشاعرے میں فیض صاحب سے فرمائش کی گئی کہ وہ مہدی حسن والی غزل سنائیں۔

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے

تو فیض صاحب نے کوئی تردید نہیں کی کہ یہ غزل مہدی حسن کی نہیں ان کی ہے، صرف اس لیے کہ فیض صاحب جمہوریت پسند شخصیت تھے۔

تو صاحبو! قدوائی صاحب کی بات میری سمجھ میں آگئی اور مجھے ڈاکٹر خلیق انجم ایک دم شریف آدمی نظر آنے لگے، یہ معلوم کر کے تو اور خوشی ہوئی کہ انگریزی الفاظ "جنرل سکریٹری" کے معنی معتمد عمومی ہوتے ہیں۔ اس سے قبل معتمد اعزازی کے الفاظ ہم نے کچھ اداروں کے دعوت ناموں پر پڑھے تھے۔ ہمیں اس لفظ کے معنی معلوم نہیں تھے۔ لیکن اب اندازہ ہو گیا کہ معتمد اعزازی اور معتمد عمومی میں یقیناً کوئی رشتہ داری ضرور ہے۔ قدوائی صاحب نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ معتمد اعزازی اس معتمد کو کہتے ہیں جو تنخواہ دار نہ ہو بلکہ اعزازی ہو گویا عوامی زبان میں "فری فنڈ" میں کام کرے۔ ہماری سمجھ میں قدوائی صاحب کی یہ بات بالکل نہیں آئی۔ 'اعزازی' کے معنی 'مفت'، تو کسی لغت میں نہیں ملتے۔ اعزازی تو اعزاز کی بہن کا نام ہو سکتا ہے۔ کہیں اعزازی کے اصطلاحی معنی یہ تو نہیں کہ اگر کوئی شخص کسی بڑے کی نکتہ انتخاب میں پورا اترے اور شرف ملازمت حاصل کرنے کا اعزاز حاصل کرلے تو اعزازی کہلاتا ہے۔ قدوائی صاحب اپنی معلومات پر نظر ثانی کریں اور ہمیں فیصلے سے مطلع فرمائیں ۔۔۔ صاحبو! بات شروع ہوئی تھی جنرل سکریٹری سے تو باوجودیکہ جنرل سکریٹری کے الفاظ کو اردو نے اپنا لیا ہے۔ میں جب بھی جنرل سکریٹری کے الفاظ سنتا ہوں مجھے اپنے بزرگ دوست مرزا محمود سرحدی کا قطعہ ضرور یاد آتا ہے۔

کل یونیورسٹی میں کسی سوٹ پوش سے
میں نے کہا حضور ہیں کیا کوئی سارجنٹ

کہنے لگا جناب سے مسٹیک ہوگئی
آئی ایم دی ہیڈ آف دی اردو ڈیپارٹمنٹ

ڈاکٹر خلیق انجم ہیڈ آف دی اردو ڈیپارٹمنٹ نہیں ہیں۔ البتہ وہ پی۔ ایچ ڈی ہیں اور پی۔ ایچ ڈی کا اردو ترجمہ شاید ابھی نہیں ہوا۔ ہوسکتا ہے انجمن ترقی اردو بھی اس سلسلے میں کوئی پہل نہ کرے۔ خلیق انجم صاحب انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری عرف معتمد عمومی ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ انگریزی کے اعزازات اچھے نہیں لگتے اگر وہ بی اے ہیں تو انھیں (Bachlor of Art) کے بجائے اس کا اردو ترجمہ "فن کا کنوارہ" لکھنا چاہیے۔ خواتین کو "دوشیزہ فن" کہنا بہتر ہوگا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا نام اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ مصنف ہیں، محقق ہیں، دانشور ہیں۔ وہ مثبت اندازِ تحریر کے قائل رہے الحمد یہ نہیں سوچتے کہ تنقید کی دنیا میں مثبت اندازِ تحریر خسارے کا سودا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم خسارے کا سودا کرنے کے عادی مجرم ہیں۔ خسارے کا سودا کرنے والی اس شخصیت نے سودا پر بھی کام کیا ہے، جو کتابی صورت میں شائع ہو کر تقریباً تمام ہندوستان میں Pre-Ph.D نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کا نام ہی "مرزا محمد رفیع سودا" ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک مشہور تخلیق "متنی تنقید" کے نام سے شائع ہو چکی ہے اور نصاب میں شامل ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم سترہ کتابوں کے مصنف ہیں "اردو کی ضبط شدہ نظمیں"، "مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط"، "کربل کتھا کا لسانی مطالعہ" ان کی بہت مشہور کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب پر بہت کام کیا ہے اس سلسلہ کی دو کتابیں "غالب کی نادر تحریریں"، "غالب اور شاہانِ تیموریہ" شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے غالب کے سارے خطوط کو بھی مرتب کیا ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی جلد چند دنوں میں منظر عام پر آرہی ہے۔ اور جس تیزی سے ڈاکٹر خلیق انجم کام کرتے ہیں کوئی بعید نہیں کہ ان کے دہلی پہنچنے تک تمام جلدیں شائع ہو چکی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ اللہ انھیں توفیق دے کہ وہ ایسی کتابیں ہم "غریب الکتب" لوگوں کو بھیجتے رہیں۔

یوں تو لندن میں آئے دن ہندوستان اور پاکستان سے ادیب اور شاعر تشریف لاتے رہتے ہیں اور ہم اہل لندن حتی المقدور ان کی پذیرائی بھی کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر خلیق انجم پہلے ادیب ہیں، جنھوں نے اعلان کیا کہ برطانیہ کے مختلف علاقوں میں اردو پر جو کام ہو رہا ہے وہ اس کا جائزہ لینے برطانیہ آئے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ ہندوستان کے اہل قلم اور ان کی تخلیقات سے برطانیہ کے اہل قلم کو اور برطانیہ میں تخلیق ہونے والے ادب سے ہندوستان کے اہل قلم کو آگاہ کرنے کی پوری کوشش کریں گے تاکہ اردو کی عالمی برادری میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے ۔ ۔ ۔ ۔ میں کل برطانیہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے اور آپ حضرات کی طرف سے ڈاکٹر خلیق انجم کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اردو کی ترویج کے سلسلے میں ان کا مسلسل انہماک ان کے جذبے کی صداقت کا ثبوت ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں اردو لاوارث ہوگئی تھی۔ بدقسمتی سے پاکستان کے چند سیاسی رہنماؤں نے نادانستہ طور پر ایسے بیانات دیے جس سے یہ گمان ہونے لگا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے یا پاکستان کی زبان ہے، کچھ اس صورت حال کا فطری ردعمل اور کچھ ہندوستان میں ایک محدود اور مخصوص طبقے کے تعصبات نے ایسی صورتِ حال پیدا کردی کہ اردو کا نام لینے والوں کو پاکستان کا جاسوس قرار دیا جانے لگا۔ چنانچہ ہندوستان میں اچھے بھلے اردو کے

اہل قلم اوپندر ناتھ اشک کی طرح ہندی میں لکھنے لگے۔

ان ناساعد حالات میں جن لوگوں نے اردو کی شمع جلائے رکھی، ان جاں بازوں میں ڈاکٹر خلیق انجم بھی صفِ اول میں نظر آتے ہیں۔ آج انجمن ترقی اردو (ہند) کی ساڑھے چھ سو شاخیں ہیں۔ غلط فہمیوں اور تعصبات کے بادل چھٹنے لگے ہیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی کوششوں سے آج ہندوستان کے کئی صوبوں میں اردو کو سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ مجھے یقین ہے ڈاکٹر خلیق انجم برطانیہ اور ہندوستان کے اہل قلم کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن میں بڑے ادب سے ڈاکٹر خلیق انجم کی خدمت میں ماضی کے کچھ خاکے پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے اور وہ خود بھی اس سے واقف ہیں کہ گذشتہ برسوں میں ہندوستان کے بہت سے ادیب لندن آئے، یہاں کی ادبی انجمنوں نے کمالِ خلوص سے ان سب کو خوش آمدید کہا۔ محفلیں ہوئیں مضامین لکھے گئے، اخبارات میں تصاویر شائع ہوئیں۔ ان سب حضرات سے یہی کہا گیا کہ کچھ کتابیں ہمیں بھجوائیے، ہندوستان کے ادبی رسائل ہمارے نام جاری کرائیے۔ ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ جدید ادبی تخلیقات سے آگاہ ہوں، کہنے کی بات نہیں لیکن حوالے کے طور پر کہنا ہی پڑتا ہے کہ ہم لوگوں نے نقد رقم بھی پیش کی تاکہ چند جرائد ہم تک پہنچ سکیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہوا یہ کہ لندن سے واپسی پر یہاں کی کارروائیوں، مضامین اور تصاویر کو صرف ذاتی Image کے فروغ کے لیے استعمال کیا گیا۔ چند ادیبوں کے سفرنامے بھی شائع ہوئے لیکن ان سب بزرگوں کو یہاں کی کسی انجمن، شاعر یا ادیب کا نام یاد نہ آیا۔ اور ایک مخصوص طبقے یا افراد کے لیے "من تراحاجی بگویم" والے مقولے پر عمل کیا گیا۔

یہ شکایت صرف لندن کے ادیبوں اور اہل قلم کو ہی نہیں اس کا مظاہرہ ڈاکٹر خلیق انجم برمنگھم میں بھی ملاحظہ فرما چکے ہیں، مانچسٹر، بریڈ فورڈ اور گلاسگو میں بھی اردو والوں نے یہی شکایت کی ہے۔

صاحبو! دنیا کے کسی بھی حصے یا خطے میں تخلیق ہونے والا تمام ادب معیاری نہیں ہوتا۔ یہاں اردو کی دو ممتاز شخصیتیں ہماری مہمان ہیں۔ مجھے یقین ہے یہ دونوں حضرات بھی یہ دعوی نہیں کر سکتے کہ ہندوستان میں سارا ادب معیاری تخلیق ہو رہا ہے۔ ہم بھی اس پر مصر نہیں ہیں کہ برطانیہ میں تخلیق ہونے والے تمام ادب کو معیاری ادب کی سند دی جائے۔ لیکن مغرب کے ماحول میں رہ کر جو لوگ اپنی اقدار، اپنی تہذیب اور اپنی زبان کی ترویج کے لیے کوشاں ہیں کیا وہ اپنے ماحول، اپنی تہذیب اور اپنی اقدار کے گہواروں میں جھولنے والوں کے لیے درخورِ اعتنا نہیں۔ ہمیں ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں سے شکایت ہے کہ وہ برطانیہ کے اہل قلم کی طرف سے چشم پوشی کر رہے ہیں ۔۔۔ وہ برطانیہ میں تخلیقی کاوشوں پر نظر ڈالے بغیر تمام اہلِ قلم کی نفی کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے انتہائی ناساعد حالات میں اردو کے لیے کام کیا ہے، وہ ان دشواریوں سے آگاہ ہیں اور حوصلے کی اس تختگی سے بھی واقف ہیں جو مخالفت اور معاشرے کے دھارے کے خلاف کام کرنے والوں کو درکار ہوتی ہے۔ وہ جانتے ہیں اپنی خود ساختہ بڑائی کے لیے دوسروں کی نفی کرنا اور کچھ بات ہے اور عوامی سطح پر حقیقتوں کو منوانا کچھ اور ۔۔۔ برطانیہ کا اردو داں یا اردو نواز طبقہ اپنی تہذیب اور اپنی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے کتنی محنت کر رہا ہے یہاں کے مشاعرے، یہاں کی انجمنیں، تنقیدی نشستیں اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ برطانیہ کے اکثر شاعر صاحبِ دیوان ہیں لیکن آج میں کل برطانیہ انجمن ترقی اردو کے اسٹیج سے برطانیہ

میں اردو کی زندگی کا ایک ننھا اور معصوم ثبوت پیش کر رہا ہوں۔ یہ ثبوت ایک تیرہ سالہ معصوم بچی ہے جو گذشتہ چار سال سے شعر کہہ رہی ہے، اس کا نام بینا حسن ہے۔ اس کی پہلی نظم اس کی گڑیا پر تھی، دوسری نظم اس کی اپنی باجی سے محبت کا اظہار تھی، اس بچی کی شاعری کا سہارا فیض احمد فیض آیسے جلیل القدر شاعر، ڈاکٹر خلیق انجم ایسے محقق یا پروفیسر قدوائی ایسے اسکالر کی سفارشات یا دیباچے نہیں ہیں بلکہ اس کے اپنے گھر کا ماحول، اس کے اپنے گھر کی تہذیب ہی اس بچی کی شاعری کی اساس ہے۔ میں نے دانستہ اس کے کسی مصرع پر اصلاح نہیں دی تاکہ اہلِ نظر اس کی اپنی فکر اور اس کے اپنے معصومانہ اسلوب سے لطف اندوز ہو سکیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ نہ صرف آج تیرہ سال کی عمر میں بلکہ ابتدا سے یہ بچی وزن میں شعر کہتی ہے۔ مشاعرے کے آغاز پر آپ اس بچی کو سنیں گے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر خلیق انجم سے میں ایک گزارش ضرور کروں گا کہ وہ اگر بینا حسن سے متاثر ہوں تو جناب گوپی چند نارنگ تک یہ اطلاع ضرور پہنچا دیں کہ اب برطانیہ میں ساڑھے تین شاعر ہو گئے ہیں۔

انجمن ترقی اُردو ہند ایک ایسا علمی، تہذیبی اور ادبی ادارہ ہے کہ اس کی طرف سے اردو کے سلسلے میں جو آواز اٹھائی جاتی ہے یا اردو کے حق میں بلند ہوتی ہے پوری اُردو دنیا اس کی توجہ کا مرکز بنتی ہے۔ قاضی عبدالغفار، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مسعود حسین سے لے کر ڈاکٹر خلیق انجم تک اُردو تحریک کے سلسلے میں انجمن نے جو جد و جہد کی ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔

انجمن کی شاخوں کا مسئلہ بھی اُردو تحریک کا ایک حصہ ہے۔ کسی انجمن کی تشکیل آسان ہے مگر اس کی تکمیل میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں، اس کی فضا ہموار کرنے میں مرکزی انجمن کے سکریٹریوں نے ہمیشہ تعاون دیا۔ خلیق صاحب نے بھی اپنے پیش رو کی اس روایت کو قائم رکھا۔ وہ اس سلسلے میں انجمن کی شاخوں کے عہدے داروں کو لکھتے رہتے ہیں کہ زبان کے مسائل سے شاخیں غفلت نہ برتیں اور اس سلسلے میں مرکز سے جو تعاون ہو سکتا ہے اس کے لیے وہ کوشاں رہتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ یک رُخے نہیں ہیں، وہ ادیب ہیں، اچھے منتظم ہیں اور اعلا درجے کے مقرر ہیں، فوٹوگرافر بھی بہت اچھے ہیں۔ ہومیو پیتھی میں بھی اچھا خاصا دخل رکھتے ہیں۔ پھر ادب میں بھی کسی خاص ایک موضوع پر کام نہیں کیا، بلکہ مختلف میدانوں کو اپنی جولان گاہ بنایا ہے۔ تحقیقی کتابیں لکھیں، بڑی تعداد میں تنقیدی مضامین لکھے۔ متنی تنقید کے فن پر اردو میں پہلی کتاب لکھی۔ فارسی اور انگریزی سے اردو میں ترجمے کیے۔ "غالب کے خطوط" اور "آثار الصنادید" کے اعلاترین درجے کے تنقیدی اڈیشن تیار کیے اور اس کے علاوہ وہ ۱۴، ۱۵ سال تک کروڑی مل کالج میں اردو کے استاد رہے۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طلبہ کو پڑھایا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلبہ کی رہنمائی کی۔

(ایم حبیب خاں)

ابوالفیض سحر

ڈاکٹر خلیق انجم ـــــ عندلیب گلشن ناآفریدہ

قومی سطح پر تحریکات، اپنے ہیروز کو خود جنم دیتی ہیں اور بعض اوقات ہیروز اپنی تحریکات کے خود جنم داتا ہوتے ہیں۔ بعض افراد ان تحریکات کو مزید آگے بڑھاتے ہیں۔ اور ان میں نئی زندگی، نئی توانائی اور نئی جولانی بھر دیتے ہیں اور وہ اپنے عہد کے عہد ناموں کے دستخط بن جاتے ہیں، مگر کبھی کبھی ایسے افراد بھی تحریکات کے سرخیل بن جاتے ہیں جن کی وجہ سے تحریکیں، جماعتیں یا ادارے دھیرے دھیرے دم توڑ دیتے ہیں اور تاریخ اور وقت کے صفحات سے بھی حرف غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے خون و پسینے کو وقت کی نامراد گرم گرم ریت چوس لیتی ہے مگر کچھ سخت جانوں کا کردار منفرد ہوتا ہے جو تاریخ کی سخت چٹانوں سے حوصلہ مندی سے ٹکراتے ہوئے حرفِ مکرر کی طرح ابھر کر امر ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ بھی ایک آفاقی سچائی ہے کہ لوگ ساتھ دیں یا نہ دیں، حالات سازگار ہوں یا ناساعد، وقت کا منصف، عادل ہو کر فاسق زندگی کا سفر مسلسل رواں دواں ہوتا ہے۔ تاریخ اور تہذیب کا ارتقا جماعتی وابستگیوں سے مبرا اگرچہ افراد یا اداروں سے بے نیاز ہو کر بھی جاری وساری رہتا ہے، جس کے نقوشِ قدم سے روشنی پاتے ہوئے انسانی فکر وشعور کے کارواں نت نئی منزلوں کی تلاش میں قدم بہ قدم، دوش بدوش، تصادم اور اتصال کی دھوپ چھاؤں میں سرگرم عمل رہتے ہیں، انجمن ترقی اردو (ہند) اور ڈاکٹر خلیق انجم کو ہم انہی شاہراہوں میں کہیں دیکھ سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے اور شاید صحیح خیال ہے کہ خلیق انجم اور انجمن ترقی اردو (ہند) ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہی نہیں بلکہ متبادل اور متوازی علائم وعلامات بن کے رہ گئے ہیں۔ ترقی اردو بیورو کے حوالے سے جواب نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو ہو گیا ہے، میرے بارے میں کچھ دوست غالباً ازراہِ محبت یوں ہی سوچتے ہیں تو مجھے کچھ عجیب سا لگتا ہے، میں سوچنے لگتا ہوں کہ کیا واقعی ایسا ہے۔ مگر جب ڈاکٹر خلیق انجم اور انجمن کے تعلق سے یہ کہا جاتا ہے اور سنا جاتا ہے تو بلا تردد یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جن حالات میں ہندستان کی راجدھانی دہلی میں راؤز ایونیو پر اردو گھر جیسی عظیم الشان عمارت کی تعمیر اور انجمن کے استحکام کی بات سامنے آتی ہے تو اس سلسلے میں تسلیمات کی پرت اور دبیز ہو جاتی ہے اور یقین کا شجر اور گھنا ہو جاتا ہے۔ یقیناً یہ کارنامہ ڈاکٹر خلیق انجم کی زندگی کے اور کارناموں میں سب سے بڑا، سب سے شاندار، سب سے زیادہ مستحکم اور سب سے اونچا نظر آتا ہے جو ایک زندہ نقشِ حقیقی بن کر وقت اور تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو چکا ہے اور اردو تحریک کا ایک طرح سے مرکز ومحور بن گیا ہے۔

ہمارے کلاسیکی ادب کے علاوہ خطوطِ غالب" اور "آثار الصنادید" جیسی ان کی تصانیف کا احاطہ اور اہل نظر کریں گے۔ ان کے حقیقی کارناموں پر بھی اور اسکالرس تبصرہ کریں گے۔ "ہماری زبان" اور "اردو ادب" کے مدیر کی حیثیت سے ان کی خدمات پر دانشور حضرات نے اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں اور ہو سکتا ہے آیندہ بھی یہ سلسلہ

جاری رہے۔ ان سب کی اہمیت وافادیت اور ان کی معنویت کی شاخوں کو چھیڑنے کے بجائے اور ان کے فکری وفنی محاسن کی چلمنوں سے جھانکنے سے احتراز کرتے ہوئے میں ڈاکٹر خلیق انجم کی ان سرگرمیوں کو سراہوں گا جو بہ حیثیت ایک خادمِ اردو انھوں نے انجام دی ہیں۔

۱۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اردو والوں کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی اور آبرومند تنظیم ہے جس کی اپنی ایک طویل مگر معتبر اور پُروقار تاریخ ہے جو اردو زبان وادب کی تاریخ کی کہکشاں میں خصوصی آب وتاب کی حامل ہے اور جس کی آج بھی سارے ملک میں چھ سو سے زائد شاخیں ہیں۔ اس آب وتاب اور اس حرارت کو سنبھالنا اردو والوں کی ذمہ داری ہے۔ ان سب امور کو دیکھنا اور سب کو لے کر چلنا اور آگے بڑھنا واقعی بڑی بات اور یقیناً بڑا کام ہے۔ محترم آنند نراین ملّا، محترم مالک رام، محترم سید حامد اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد جیسے بلند مقام صدور کے ساتھ انجمن کا کام مستعدی سے بہ حیثیت جنرل سکریٹری انجام دینا از خود ایک بڑا اعزاز اور ایک بڑی خدمت ہے، اس کا اعتراف نہ کرنا، نامناسب ہے اور بخل ہے۔ اختلاف اور اتفاق، جمہوری طرزِ فکر اور جمہوری طریقۂ عمل کے نمایاں خصوصیات ہیں۔ یہ سلسلہ ہونا بھی چاہیے۔ مگر تخریبی نوعیت کا نہیں بلکہ تعمیری نہج کا۔ صحت مند اختلاف ہر قیمت پر نامناسب اتفاق سے بہتر ہے۔ اسے صرف ایک کسوٹی ہی نہیں ماننا چاہیے بلکہ ایک نصب العین بھی تسلیم کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے بہ حیثیت جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) کی جو خدمات انجام دی ہے۔ ان کی تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے مگر یہاں اتنا کہنا کافی ہے اور یقیناً اپنی جگہ اہم بھی کہ ان سرگرمیوں سے ایک ہل چل ایک چہل پہل اور ایک زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے احساس کے بحر میں موجوں کا یہ اضطراب ہمارے وجود اور ہماری زندگی کا ثبوت ہے یہ تموّج اور یہ تلاطم اور تیز تر اور دور رس ہو سکتا ہے۔ اس کا انحصار بہ حیثیت مجموعی ہم اور ہمارے احساس پر ہے۔ انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر جماعتی سطح پر اور ادارہ جاتی سطح پر، اردو تحریک کی روح بھی یہی ہے۔

اردو کے مختلف محاذوں اور مختلف مراکز پر ہم نے بہت کام کیے ہیں ۱۹۸۶ء میں ہندستان کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا ایک وفد سرکاری دورہ پر پاکستان بھی گیا تھا۔ اس میں بھی ہم شامل تھے۔ ماریشس کی عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کی تیاریاں ہم سب نے مل کر کی تھیں۔ مگر ایک خاص وجہ سے مجھے وہاں جانے کا موقع نہ ملا۔ مگر بیشتر مقامات پر مجھے ڈاکٹر خلیق انجم کو کام کرتے ہوئے دیکھنے کے مواقع ملے ہیں۔ ان میں بلا کی توانائی ہے، غضب کا تحرک ہے۔ تنظیم کا وسیع تجربہ ہے اگر ضرورت ہو تو وہ چھوٹے سے چھوٹا کام کرتے ہوئے بھی نہیں ہچکچاتے اور بڑے سے بڑے کے آگے اپنی بات اپنے لب و لہجے میں جرأت مندی سے کہتے ہیں۔ ان میں واقعی ایک بڑی مجاہدانہ لگن ہے۔ بہت پہلے کی بات ہے غالب اکیڈمی میں میں نے ذہین نقوی، ابرار کرت پوری اور واجد سحری جیسے دوستوں کے تعاون سے، حلقۂ اربابِ دانش کے عنوان سے ادبی ملاقاتوں اور نشستوں کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ پروفیسر نارنگ، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر اسلم پرویز میری ادنیٰ سی دعوت پر مگر علم وادب، شعر وحکمت سے گہری وابستگی کی بدولت، خوشی خوشی یہاں آتے تھے اور مباحث میں شریک ہوتے تھے۔ جس سے یہ حلقہ فکر وفن کے فروغ اور ارتقا کا ایک چھوٹا سا نخلستان بن گیا تھا۔ پہلے تو بستی حضرت نظام الدین میں، جناب خواجہ حسن ثانی نظامی کے مکان میں، پھر مقبول بلڈنگ میں، جناب حیات اللہ انصاری صاحب کی رہنمائی میں، میں نے تعلیم بالغان کا

سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ بستی کے چند صحت مند جذبات رکھنے والے نوجوان بھی میرے ساتھ تھے ان میں شیخ سلیم احمد، شبیع احمد، ضمیر زیدی، ناظم نظامی، عذیر، مولوی ہارون قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے جب یہ سنا تو دیکھنے آئے اور دیکھا کہ ہم لوگ نہ صرف غریب اَن پڑھ لوگوں کو اردو پڑھا لکھا رہے ہیں بلکہ درگاہ کے آس پاس رہنے والے فقیروں کے بچوں تک کی بھی تعلیم و تربیت کا کام کر رہے تھے، اس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ ہمارے نوجوان ساتھیوں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ یہ بڑا عجیب اور دل چسپ تجربہ ہے کہ ہم لوگ بستی حضرت نظام الدین کی ان گلیوں میں کام کرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا تو ساتھ ہی ہمیں ہندستان کے راشٹرپتی بھون میں اور پاکستان کے صدر کے ساتھ بھی ملنے اور برصغیر سے متعلق ہمارے اور ہماری زبان وادب اور تہذیب کے مسائل پر تبادلہ خیال کرنے کے مواقع ملے۔ ہمیں واقعی دلی مسرت ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم اس طرح کی تعلیم و تربیت کے سلسلوں سے کسی نہ کسی طرح جڑے رہے اور آج وہ جامعہ اردو علی گڑھ کے نائب امیر جامعہ ہیں، جس کے ہم لوگ ابتدا میں مجلسِ عام کے رکن تھے۔ بہرحال یہ ان کے لیے اعزاز ہے اور ہمارے لیے بڑی مسرت کی بات، ہم پیر بھائی جو ہیں۔

"ہماری زبان" اور "اردو ادب" کو پابندی سے اور ایک خاص معیار اور وقار سے جاری رکھنا آج کے حالات میں از خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ پھر مختلف موضوعات پر کتابوں کی ترتیب و اشاعت اور پھر ان کی نکاسی، ان کی دل چسپی اور مہارت کے موضوعات اور میدان ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام قومی ہندو پاک سمینار اور کانفرنس منعقد کی ہیں۔ وہ یقیناً اہم اور تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ بالخصوص سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق اور حسرت موہانی سے متعلق سمینار قابل ذکر ہیں۔ ایسے یادگار اجتماعات کے لیے ماہرین سے مضامین اور مقالے لکھوانا، ان کا انتظام و انصرام کرنا پھر ان مقالات کو کتابی صورت میں اہلِ نظر کے سامنے پیش کرنا واقعی ایک باہمت اور باصلاحیت کارکن ہی کے بس کی بات ہے۔ اتنا کچھ کرکے بھی سب کے ساتھ چھوٹے بڑے، خورد و کلاں، بزرگ اور نوجوان سب طبقوں، سبھی زمروں کو خلوص و محبت سے احترام سے لے کر ملا کر چلنا ان کی جامع صفات شخصیت کا بین ثبوت ہے۔ بذلہ سنجی، خوش گفتاری، لطیفہ گوئی، ان کی محفلوں کی جان ہوتی ہے جو دراصل ان کی اپنی شخصی صفات کا پرتو ہے۔ ائمۂ فنون، ماہرین، مشاہرین کے ساتھ ساتھ کالج کے نوجوان اسکالرس اور عام آدمیوں کو اردو سے، ادب سے، انجمن سے، اردو گھر سے جوڑے رکھنے کے لیے اور ان کی تخلیقی ذوق و شوق کی آسودگی کا سامان کرنے کے لیے ماہانہ ادبی ملاقات کا سلسلہ جس کا میں کنوینر ہوں، قایم کرنا ان کی ہی خواہشوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔

انجمن میں ڈاکٹر خلیق انجم نے جہاں اور بہت سے کام کیے ہیں وہیں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام سے بجا طور پر موسوم ایک خوب صورت آڈوٹوریم بنوایا ہے جہاں انجمن کے علاوہ کبھی کبھی دوسرے اداروں کی علمی و ادبی سرگرمیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہیں اردو سیکھنے کے خواہش مند لوگوں کے لیے اردو کلاسوں کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے طور پر ایک اور بہت اچھا کام یہ شروع کر رکھا ہے کہ اردو گھر آنے والے معاصر ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور دانشوروں اور قلم کاروں کے پوٹریٹ بنانا اور انھیں محفوظ کرنا۔ یہ یقیناً ایک مستحسن اقدام ہے، جس کی آج سے زیادہ کل قدر و قیمت ہوگی اور یہ ذخیرہ ایک تاریخی رتبہ حاصل کر جائے گا۔ اسی طرح ہر سال کی اہم علمی و ادبی تصانیف کی ببلیوگرافی مرتب کرنا بھی یکساں مفید ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم دہلی کی کئی ساری علمی ادبی اور تہذیبی انجمنوں اور تنظیموں سے وابستہ ہیں ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی ایک خاص تعلق ہے، اس قدر مصروف ہوتے ہوئے بھی ان سب کے لیے وقت کس طرح نکال پاتے ہیں یہی جانتے ہیں شاید کچھ توفیق ہے، کچھ تگ ودو کچھ دین اور کچھ عطا ہے ایسے کاموں سے وابستگیوں میں گجرال کمیٹی اور جعفری کمیٹی سے ان کی وابستگی اہم ہے۔ ان سے متعلق اور منسلک ہو کر ڈاکٹر خلیق انجم نے خود سے اور دوسرے احباب سے مل کر جو کام کیے ہیں وہ بہت ٹھوس اور نتیجہ خیز ہیں ۔ یہ کوئی بہت بڑا طرّہ یا تمغہ نہیں تو نہ سہی مگر خدمت زبان وادب کے جذبے اور جنون کی تسکین کا بہت بڑا مقدس وسیلہ اور سامان ضرور ہے جو کوئی چاہے یا نہ چاہے ایک متبرک عمامہ بن کر خادموں کے سر سے بندھ جاتا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم اردو کے صفِ اول کے محقق ہیں، ان کی بیشتر کتابیں تحقیق کا اعلا ترین نمونہ ہیں۔ ان کی کتاب "مرزا محمد رفیع سودا" کے پیش لفظ میں ان کی تحقیقی صلاحیتوں کی داد دیتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا تھا کہ

"جو لوگ اردو تحقیق کے معیار کو کم تر درجے کا سمجھتے ہیں وہ خلیق انجم صاحب کی اس کتاب کا مطالعہ کریں تاکہ انھیں یہ معلوم ہو سکے کہ اردو تحقیق کا معیار کتنا بلند ہوتا جا رہا ہے۔"

ڈاکٹر انجم نے غالب پر اس پائے کا کام کیا ہے کہ اس وقت انھیں ماہر غالبیات کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ غالب پر کوئی کتاب لکھی جائے اور خلیق انجم صاحب کی کتابوں کا بار بار حوالہ نہ دیا جائے۔ خلیق صاحب نے غالب کے تمام اردو خطوط چار جلدوں میں مرتب کیے ہیں۔ اس نوعیت کا کام پہلی بار ہوا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ انجم صاحب کے اس کام کو نمونہ بنا کر دیگر مشاہیر کے خطوط مرتب کیے جا رہے ہیں۔ غالب پر خلیق صاحب کی دوسری کتابیں ہیں۔ یعنی "غالب اور شاہانِ تیموریہ" "غالب کی نادر تحریریں" اور "غالب کچھ مضامین"۔ اردو میں ترتیبِ متن کے سائنٹفک اصولوں پر ڈاکٹر خلیق انجم نے پہلی بار "متنی تنقید" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب ہندوستان اور پاکستان کی بیشتر یونیورسٹیوں میں ایم۔ فل کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کو چھپے ہوئے تقریباً ۳۰ سال ہو چکے ہیں آج تک اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک خاص موضوع دہلی کے آثارِ قدیمہ بھی ہے۔ انھوں نے سرسید کی "آثار الصنادید" تین جلدوں میں ترتیب دی ہے، یہ کتاب ترتیب متن کا اعلا ترین نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر ان کی دو کتابیں اور ہیں "دلی کے آثار قدیمہ" اور "دلی کی درگاہ شاہ مرداں"۔

ڈاکٹر صاحب ایک بہت اچھے مترجم ہیں۔ وہ پانچ چھ سال تک آل انڈیا ریڈیو کے فارسی یونٹ میں مترجم اور براڈ کاسٹر کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں اور اس یونٹ میں ان کا کام انگریزی سے فارسی میں ترجمہ کرنا اور خبریں نشر کرنا ہوتا تھا۔ انھوں نے انگریزی اور فارسی کی کئی کتابیں ترجمہ کی ہیں انگریزی سے گوگول کے ناول "تاراس بلبا" کا ترجمہ کیا ہے اور فارسی سے مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط اور "مرقع دہلی" کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے تقریباً ۴۰ کتابیں اور ادبی تبصرے سے زائد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین میں سے ادبی تبصرے، "سیکولر ڈیمو کریسی"، "ہماری زبان" اور "اردو ادب"، کے اداریے شامل نہیں ہیں۔

جمیل اختر

غالبؔ کے خطوط ــــ مرتبہ خلیق انجم

ایک تنقیدی جائزہ

خطوط غالب کی ترتیب و تدوین یوں تو کوئی نیا کام نہیں، بلکہ غالب کی زندگی میں ہی یہ کام شروع ہو گیا تھا اور غالب نے خود بھی ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خاں کی فرمائش پر اپنی اردو نظم و نثر کا ایک مختصر سا انتخاب کیا تھا، جو ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے چودھری عبد الغفور سرور اور منشی ممتاز علی خاں نے ان خطوط کو شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا جو غالب نے سرور کو لکھے تھے۔ سرور نے اس کتاب پر ایک دیباچہ لکھا تھا اور اس کا نام مہر غالب رکھا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی اشاعت چند وجوہ سے معرض التوا میں پڑ گئی۔ پھر غلام غوث خاں بے خبر نے غالب سے اجازت لے کر ان کے خطوط کا مجموعہ مرتب کرنے کا کام شروع کیا۔ غالب نے نہ صرف انھیں اس کام کی اجازت دی بلکہ خطوط کی نقلیں بھی فراہم کیں۔ بے خبر نے ۱۸۶۱ء میں یہ کام شروع کیا لیکن جب ۱۸۶۵ء تک اس مجموعے کی طباعت کے آثار نظر نہیں آئے تو بے خبر نے اپنا مرتب کیا ہوا مجموعہ منشی ممتاز علی خاں کو بھیج دیا۔ منشی صاحب نے مہر غالب اور اس مجموعے کو ملا کر اس کا نام عود ہندی رکھا اور خود بھی اس مجموعے پر دیباچہ لکھا۔ اس طرح عود ہندی غالب کی زندگی میں شائع ہونے والا خطوط کا پہلا مجموعہ ہے۔

غالب کے بعد غالب کے خطوط کے کئی مجموعے مرتب ہو کر شائع ہوئے، عود ہندی اور اردوئے معلیٰ کے تو کئی کئی اڈیشن نکل چکے ہیں۔ ان دونوں کے علاوہ ادبی خطوط غالب مرتبہ مرزا محمد عسکری، مکاتیب غالب مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد، خطوط غالب مرتبہ مالک رام، نادرات غالب مرتبہ آفاق حسین آفاق، خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر، غالب کی نادر تحریریں مرتبہ خلیق انجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ کچھ کتابوں پر تو نظر ثانی بھی کی گئی۔ ان تمام خطوط کے مجموعوں کے بعد بھی خطوط غالب کے سلسلے میں ایک کمی کا شدت سے احساس ہوتا رہا ہے۔ مذکورہ بالا مجموعوں میں سے کوئی بھی مجموعہ ایسا نہیں تھا جو ہر اعتبار سے مکمل ہو اور جس پر کلی طور پر اعتبار کیا جا سکتا ہو۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ جب بھی کوئی نیا اڈیشن آیا یا کسی صاحب نے خطوط کے مجموعے مرتب کر کے شائع کیے تو موجودہ مجموعوں کے مقابلے میں اسے بہتر بنانے کی ضرور کوشش کی۔ لیکن پھر بھی اس کام پر جس قدر توجہ صرف کرنے اور محنت کرنے کی ضرورت تھی نہ کی گئی۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے البتہ اس طرف خصوصی توجہ کی اور مکاتیب غالب کے نام سے غالب کے ان خطوط کو مرتب کیا جو غالب نے رام پور کے نواب اور ان کے صاحبزادے کو لکھے تھے۔ مولانا عرشی نے پہلی بار غالب کے خطوط کا تنقیدی اڈیشن نہایت سائنٹیفک انداز سے پوری احتیاط کے ساتھ تیار کیا۔ متن پر خصوصی توجہ دی اور تشریح طلب مقامات پر جامع حواشی لکھے۔ اس لیے خطوط غالب کا یہ مجموعہ اور مجموعوں کے مقابلے میں زیادہ معتبر مانا جاتا ہے۔ خود خلیق انجم صاحب مکاتیب غالب کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"مکاتیب غالب سے پہلے کسی اردو متن کا ایسے سائنٹیفک انداز میں تنقیدی اڈیشن تیار

نہیں ہوا، بلکہ اس کے بعد بھی جہاں تک میرا مطالعہ ہے ایسا تنقیدی اڈیشن تیار نہیں ہوا جسے مکاتیب غالب کے مقابلے میں رکھا جا سکے۔" (غالب کے خطوط۔ ص ۴۲)

لیکن افسوس بس یہی ہے کہ اس کتاب میں صرف نواب رام پور اور ان کے صاحبزادے کے نام لکھے گئے خطوط ہیں۔ اگر تمام خطوط اس طرح یکجا ہو جاتے تو شاید آج خطوط غالب کو اس طرح مرتب کرنا اور ان میں کچھ نئے پہلو نکالنا اور زیادہ مشکل ہوتا۔ صرف املا کی حد تک تو یہ ضرورت ہر عہد کے ساتھ باقی رہتی اور جدید املا کی روشنی میں ترتیب و تدوین کا کام ہوتا رہتا لیکن ابھی جس قدر نئے اسرار و رموز سنسنی خیز انداز میں سامنے آئے ہیں۔ شاید ایسا اس صورت میں نہ ہو پاتا۔ پھر خطوط غالب کے اس مجموعے کے علاوہ اور جو دوسرے بہت سے مجموعے تھے ان میں بے پناہ خامیاں تھیں۔ ایک تو کوئی بھی نسخہ مکمل خطوط پر مشتمل نہیں تھا دوسرے ہر نسخے کا متن الگ الگ تھا۔ مثال کے لیے صرف دو مجموعوں اردوئے معلّیٰ اور عود ہندی کو پیش کرتا ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ غالب کے خطوط کے مجموعوں میں ان دونوں مجموعوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی ہے اور انھیں سرفہرست رکھا گیا ہے، اور ان دونوں مجموعوں کے کئی کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، لیکن متن کی سطح پر ان کے ہر اڈیشن میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی رہیں۔ اردوئے معلّیٰ اور عود ہندی کے تمام اڈیشنوں کو اگر الگ الگ سامنے رکھیں تو دونوں کے اڈیشن میں یہ تبدیلی آپ کو دیکھنے کو ملے گی۔ اردوئے معلّیٰ کا ایک اڈیشن جو مارچ ۱۹۸۳ء میں اردو گائیڈ کلکتہ سے شائع ہوا تھا اور جس کا اہتمام سکریٹری بورڈ آف اگزامینیشن نے کیا تھا اس میں خطوط میں سے ایسے فقرے نکال دیے گئے، جو حکومت کے نقطۂ نظر سے پسندیدہ نہیں تھے۔ اس طرح جب جب خطوط غالب کے اڈیشن نکلے متن میں ترمیم و تحریف ہوتی رہی۔ اس ترمیم و تحریف میں اور باتوں کے علاوہ کاتب کی غلطیوں اور مرتبین کی عدم توجہی کو بھی بڑا دخل تھا۔ اس طرح کوئی مجموعہ بھی مکمل طور پر قابل اعتنا نہیں تھا اور ان مجموعوں کے علاوہ بھی لاتعداد خطوط ایسے تھے جو جا بجا بکھرے ہوئے تھے جن میں سے کچھ تو مطبوعہ تھے اور کچھ غیر مطبوعہ اور ضرورت تھی کہ ان تمام خطوط کو یکجا کر دیا جائے تاکہ غالب کی نثر کا یہ سرمایہ جو اردو نثر کا قیمتی سرمایہ ہے محفوظ ہو جائے اور یہ بیش بہا سرمایۂ ادب ضائع ہونے سے بچ جائے۔

ان تمام خطوط کو یکجا کر کے ان کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنے کا خیال سب سے پہلے مولوی مہیش پرشاد کو آیا تھا اور انھوں نے اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کی اور غالب کے خطوط جمع کیے اور ان کو دو جلدوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ پہلی جلد شائع بھی ہو گئی لیکن دوسری جلد ترتیب کے مرحلے میں ہی تھی کہ مولوی صاحب انتقال فرما گئے اور یہ کام پھر آگے نہ بڑھ سکا۔ پہلی جلد بھی جو شائع ہوئی تو خامیوں سے پُر تھی۔ متن کی تدوین میں متنی تنقید کے اصولوں کو کیا کسی بھی طریقے کو شروع سے آخر تک یکسانیت کے ساتھ نہیں برتا گیا۔ جس کی وجہ سے ایک ایک لفظ کا کئی کئی املا لکھا گیا۔ جو کسی بھی لحاظ سے درست نہیں تھا۔ ترتیب سے پہلے کچھ اصول بنانے چاہیے تھے۔ اور اول تا آخر ان پر عمل کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح اتنا اہم کام تھوڑی سی غفلت کی وجہ سے پوری طرح معتبر نہ ہو سکا۔ اور خطوط غالب کو سائنٹی فک انداز سے اور متنی تنقید کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ترتیب دینے کی ضرورت اپنی جگہ باقی رہی۔

ادھر کچھ برسوں سے اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ خطوط غالب کو سائنٹی فک طریقے سے ترتیب دیا جائے اور غالب کے وہ تمام خطوط بھی جو ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں، یکجا کر دیے

جائیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اس ضرورت کو نہ صرف یہ کہ محسوس کیا بلکہ اس بڑے اور اہم کام کو کرنے کا بیڑا بھی اٹھایا انھوں نے اس سلسلے میں انتہائی محنت اور عرق ریزی کی اور اس طرح ان کی کوشش بار آور ہوئی اور وہ اس کام کو مکمل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب چوں کہ خود بھی ایک محقق اور متنی نقاد ہیں انھوں نے متنی تنقید کے اصول بھی وضع کیے ہیں۔ اور اس موضوع پر پہلی کتاب بھی لکھی ہے۔ اس لیے انھوں نے خطوط غالب کی تدوین میں ان تمام اصولوں کو بہ روئے کار لانے کی حتی الوسع کوشش کی جو کسی متن کی ترتیب کے لیے لازمی ہیں۔

متنی نقاد کے نزدیک متن کی ترتیب و تدوین کے وقت اس کی صحت اور استناد کا مسئلہ سب سے اہم ہوتا ہے۔ اور اس کی تمام تر کاوش متن کی صحت اور اس کے استناد پر صرف ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس کا بنیادی مقصد ہی صحت مند متن کی باز یافت ہے۔ ورنہ ایسے نسخوں کی کوئی کمی نہیں جن میں متن کی صحت اور اس کے استناد کی کوئی پرواہ نہیں کی گئی قدیم ادبی و شعری سرمایے میں لاتعداد نسخے ہیں۔ جو قلمی بھی ہیں اور شائع بھی ہو چکے ہیں لیکن جدید تحقیق نے انھیں ناقص قرار دیا ہے خود خطوط غالب کے بیش تر نسخے مرتب ہو کر شائع ہو چکے ہیں اور ناقص قرار پا چکے ہیں۔ اس کی اصل وجہ متن کی صحت کا اہتمام نہ کرنا تھا۔

متن کی صحت کا جہاں تک تعلق ہے تو اس پر کام شروع کرنے سے پہلے متنی نقاد کو اس علم اس زبان اور اس کے متعلقات سے مکمل آگاہی ضروری ہے۔ جس میں وہ علمی یا ادبی تصنیف وجود میں آئی ہے۔ اسی کے ساتھ اس زبان کے مختلف لسانی حلقوں، عہد بہ عہد تبدیلیوں، املا اور رسم کتابت کی ادواری خصوصیات سے بھی آگاہی ضروری ہے تاکہ روایت کی تفہیم اور متن کی قرأت میں دشواری نہ ہو۔ مخطوطے ہوں یا مطبوعہ نسخے ان کی صحیح قرأت میں حتی الامکان احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ متن کے ایک ایک لفظ کی اہمیت ہوتی ہے اور بسا اوقات بعض لفظ تو متن کی تفہیم اور معنی مقصود تک رسائی میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے متنی نقاد کو اس پر عبور حاصل کرنے کے لیے اس عہد کے کچھ منتخب نسخوں کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ مختلف تحریروں پر پورا عبور حاصل ہو سکے۔ خطوط غالب کی تدوین کے لیے ضروری ہے کہ غالب کے عہد اور اس عہد سے قبل کے بھی چند نسخوں کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اگر غالب نے کچھ ایسے الفاظ استعمال کیے جو ان سے قبل کے عہد میں رائج تھے اور بعد میں متروک ہو گئے تو انھیں صحیح پڑھنے میں مدد ملے گی۔

اس عہد کی زبان پر عبور حاصل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ممکن ہے مطالعے کے درمیان بہت سے ایسے الفاظ بھی سامنے آئیں جن کا مطلب متنی نقاد شاید نہ جانتا ہو اور یا جو متروک ہو گئے ہیں۔ ایسے الفاظ بھی ہو سکتے ہیں جو اردو میں اب تک مستعمل تو ہیں لیکن جن کا مفہوم اب بدل گیا ہے اور ایسے الفاظ بھی ہوں گے جن کا تلفظ بدل گیا ہے۔ ان تمام باتوں کی نشاندہی اسی وقت ممکن ہے جب کہ متنی نقاد کو اس عہد کی زبان پر عبور حاصل ہو۔ اس لیے کہ اس سے خود مصنف کو سمجھنے اور اس کا مطالعہ کرنے میں آسانی ہو گی۔

اس عہد کی ادبی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ ایک تو اس لیے کہ کہیں دوسرے شعراء کا کلام شامل

نہ ہوگیا ہو، دوسرے نسخہ نقل کرتے وقت کاتب جو تحریف کرتا ہے اسے سمجھنے کے لیے اس عہد کی ادبی اور لسانی تحریکوں کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ مثلاً غالب کے ہم عصر شعرا کون کون تھے اور کون کون سی تحریکات اس وقت چل رہی تھیں، اس لیے کہ اگر دیوان غالب یا خطوط غالب میں ایسے الفاظ ملیں جو متروک ہوں اور ایسی تحریکوں کا اثر ملے جو اس عہد میں نہیں رہی ہوں تو متنی نقاد ان اشعار یا ان الفاظ کو اس وقت تک اپنے متن میں شامل نہیں کرے گا جب تک دوسرے ذرائع سے اس امر کی تصدیق نہ ہو جائے کہ وہ غالب ہی کے ہیں۔

اس عہد کی سماجی، سیاسی، معاشی اور مذہبی تاریخ کا مطالعہ بھی اہم ہے اس سے مختلف منسوبات اور تحریفات کا علم ہوتا ہے مثلاً اگر کوئی چیز غالب سے منسوب کردی گئی ہے اور وہ غالب کی نہیں ہے تو اس کا پتہ چلانے کے لیے اس عہد کے سماجی و سیاسی حالات اور اس زمانے کے رسم و رواج کے مطالعے سے ہی مدد لی جا سکتی ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے تبدیلیوں کے جو اثرات مصنف کی شخصیت پر پڑے ہیں اور جس کی وجہ سے اس کی تحریر میں تبدیلی آئی ہے اس کا بھی پتہ لگ سکے اور اس کے اسلوب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس لیے کہ ایسی تبدیلی عصری تقاضوں ہی کے تحت عمل میں آتی ہیں۔

ان کے علاوہ ایک اور بات جس کا تذکرہ ضروری ہے وہ یہ کہ متنی نقاد کو مصنف کے حالات زندگی سے بھی پوری واقفیت ہونی چاہیے۔ مصنف کا عہد کیا تھا، اس وقت کی ادبی صورت حال کیا تھی، سماجی اور سیاسی نظام کا ڈھانچہ کون سا تھا، معاشی صورت حال کس حد تک درست یا زبوں تھی، مصنف کی شخصیت کی تعمیر میں کون کون سے عوامل و عناصر کارفرما تھے۔ اس لیے کہ کوئی بھی تخلیقی تجربہ خلا میں نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی آماجگاہ فن کار کا ذہن ہوتا ہے اس لیے فن اور شخصیت کے تعلق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شخصیت کے عناصر ہی کسی تخلیق کا اصل رنگ و بو ہوتے ہیں۔ اس لیے تخلیق کا ایک جز خود مصنف کی شخصیت سے بھی ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مصنف کے رشتہ داروں اور شاگردوں کی تصنیفات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ ان سے مصنف کی زندگی اور ادب پر روشنی پڑتی ہے۔ بسا اوقات مصنف سے متعلق اہم ترین معلومات کا ذریعہ یہی کتابیں ہوتی ہیں۔

ایک آخری بات یہ کہ اگر مصنف کے عہد میں پریس رائج ہوگیا ہو تو اس عہد کے تمام اخبارات و رسائل کا مطالعہ اور ان کی چھان بین ضروری ہے۔ اس لیے کہ ان میں مصنف کی شائع شدہ تخلیقات کا بیش بہا خزانہ ملنے کی توقع ہے۔ غالب کے عہد میں پریس رائج ہو چکا تھا اور غالب کے بہت سے خطوط اور کلام مختلف اخبارات و رسائل میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ اس لیے کلام غالب یا خطوط غالب کی تدوین کے لیے ضروری ہے کہ اس عہد کے اخبارات و رسائل کا مطالعہ کیا جائے تاکہ کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے۔

"غالب کے خطوط" کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے خطوط کی تدوین سے قبل یہ تمام تیاریاں کرلی تھیں اور انھوں نے متنی تنقید کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے خطوط کی تدوین کا کام انجام دیا ہے۔

سب سے پہلی چیز جو کسی متن کی ترتیب کے لیے ضروری ہے، وہ مختلف نسخوں کا حصول، مطالعہ اور موازنہ ہے۔ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے خلیق انجم نے بھی ترتیب سے قبل مختلف دستیاب نسخوں کو

حاصل کیا ہے۔ پھر ان کا مطالعہ اور موازنہ نہایت سنجیدگی اور گہرائی و گیرائی سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مندرجہ ذیل نسخوں کو پیش نظر رکھا ہے۔

"مہر غالب، انتخاب غالب، عود ہندی (مختلف اڈیشن)، اردوئے معلیٰ (کئی اڈیشن)، ادبی خطوط غالب، مکاتیب غالب، خطوط غالب، نادرات غالب، خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر، غالب کی نادر تحریریں، خطوط غالب مرتبہ مہیش پرساد، خطوط غالب مرتبہ مہیش پرساد بہ نظر ثانی مالک رام، ان کے علاوہ غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط جو اور کہیں شائع نہیں ہوئے۔

اس طرح خلیق انجم نے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تمام خطوط حاصل کیے اور پھر ان کا مطالعہ و موازنہ کیا اور کہیں کوئی ایسی قرأت نظر آئی جو غالب کی منشا کے خلاف ہے تو انھوں نے قیاسی تصحیح کر کے حاشیے میں اس کا ذکر کر دیا ہے۔ اختلاف متن کے سلسلے میں غالب کے خطوط کے متن کو انھوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک متن تو وہ جو غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، دوسرا متن وہ جو 'عود ہندی' 'اردوئے معلیٰ' اور نادرات غالب میں شائع ہوا ہے۔ ان تمام متنوں کا موازنہ کر کے انھوں نے ایک مستند متن کا تعین کیا ہے۔ متن کے اس تعین کے بارے میں خلیق انجم خود لکھتے ہیں۔

"زیر نظر تنقیدی اڈیشن میں غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ان خطوط کو جن کے عکس مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں یا جو اصل شکل میں مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

'اردوئے معلیٰ' اور عود ہندی کے پہلے اڈیشنوں میں شائع ہونے والے خطوط کو بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ غالب کے جو خطوط ان دونوں مجموعوں میں مشترک ہیں ان میں اردوئے معلیٰ کے متن کو بنیادی نسخہ بنا کر عود ہندی کے متن سے موازنہ کر کے اختلافات نسخ دیے گئے ہیں۔ اردوئے معلی کے متن کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ مجموعہ دہلی میں شائع ہوا تھا اور عود ہندی کے مقابلے میں اس مجموعے میں طباعت کی غلطیاں کم ہیں۔"

اردوئے معلیٰ اور عود ہندی کے ری پرنٹ میں قیاسی تصحیح سے مدد لی ہے۔ بنیادی متن سے موازنہ نہیں کیا ہے، اس لیے کہ اس کی بہت ضرورت محسوس نہیں کی گئی البتہ اردوئے معلیٰ کے دوسرے حصے کو جو ۱۸۹۹ء میں مطبع نامی مجتبائی دہلی سے شائع ہوا تھا اور اس میں جو خطوط شامل ہیں ان تمام خطوط کو انھوں نے بنیادی متن کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس طرح بلگرامی اور شفق کے نام غالب کے جو خطوط تھے اس کے اصل کی دریافت کر کے اسے بنیادی متن تسلیم کیا ہے۔ اور پھر موازنہ کر کے اختلافات درج کیے گئے ہیں۔

اس طرح خلیق انجم نے پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد بنیادی متن کا تعین کیا ہے۔ اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ ان کے کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے تحقیقی طریق کار اور متنی تنقید کے اصولوں کو ذمے داری کے ساتھ برتا ہے۔

متن کے تنقیدی اڈیشن کی ترتیب کے بعد خلیق انجم نے ایک مبسوط اور مفصل مقدمہ "کچھ اس تنقیدی اڈیشن کے بارے میں" کے عنوان سے لکھا ہے۔ جس میں متن کی تصحیح، بنیادی نسخہ، خطوں کی تاریخ وار ترتیب خطوں کی تاریخ تحریر، تنقیدی اڈیشن کے متن کی املا اوقاف کی علامتیں، رقمیں، غالب کا نام بہ حیثیت مکتوب نگار مکتوب الیہ کے حالات وغیرہ ضمنی سرخیوں کے تحت ان سب پر بہت ہی مدلل بحث کی ہے۔ اور تنقیدی اڈیشن کے متن کی املا کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "میں اس حق میں ہوں کہ متن کی املا جدید ہونی چاہیے کیوں کہ اول تو ہم متن اپنے عہد کے لوگوں کے لیے تیار کرتے ہیں اور دوسرے متنی نقاد کا مقصد متن کی بازیافت ہے املا کی بازیافت ہرگز نہیں"۔

خلیق انجم کی یہ دلیل سائنٹفک معلوم ہوتی ہے اگر قدیم املا کا استعمال کیا جاتا تو شاید وہ آج کے عہد کے قاری کے لیے کچھ الجھنیں پیدا کر سکتی تھی۔ خلیق انجم نے اس کے املا کی جدید کاری کر کے اس اڈیشن کو اور بھی مفید اور کارآمد بنا دیا ہے۔

اوقاف کی علامتیں اور رقمیں جیسی بہ ظاہر چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم لیکن بہت کارآمد باتوں کی تشریح کر کے خط کی قرأت کو مزید آسان کر دیا گیا ہے۔

خطوط غالب کے مختلف اڈیشن اور ری پرنٹ کے عنوان سے خطوط غالب کے کچھ قدیم ری پرنٹ اور بعض اہم اڈیشنوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور حاصل شدہ تمام نسخوں سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ موازنہ کر کے جو اختلافات نسخ سامنے آئے ہیں مثالوں کے لیے انھیں بھی پیش کر دیا ہے۔ اس طرح انھوں نے سبھی نسخوں کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

"غالب کی اردو املا کی خصوصیات" کے تحت پہلے تو زبان، املا، تلفظ اور ان کی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی مشکلات پر بحث کی ہے اور انیسویں صدی تک اردو املا کے ارتقا کو بہت ہی سست بتلایا ہے۔ البتہ انیسویں صدی کے شروع کے ساٹھ ستر برسوں میں جو کہ غالب کا عہد ہے اس میں اردو املا میں سب سے زیادہ تبدیلیاں ہوئیں۔ اس کی وجہ ہندوستان میں پریس کا قائم ہونا، اردو کتابوں کی خاصی تعداد میں طباعت اور اس عہد کے تعلیمی نظام میں اردو کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ تعلیمی نظام میں اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا، زبان کا چلن بڑھنے کی وجہ سے اردو املا کی معیار بندی کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی۔ اور غالب کے آخری زمانے میں اردو املا میں بعض اہم تبدیلیاں ہوئیں مثلاً معکوسی اور ہا کار آوازوں کی علامتوں میں باقاعدگی پیدا کی گئی، یائے مجہول اور یائے معروف میں باقاعدہ تفریق قائم کی گئی۔ غالب کے خطوط میں املا کی یہ تبدیلیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ اور خود غالب نے بھی اپنے شاگردوں کو اس سلسلے میں ہدایتیں دی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر انجم کا کہنا ہے کہ خود غالب اس سلسلے میں خاصے غیر محتاط تھے اور انھوں نے یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی فرق نہیں کیا۔ املا کی قدیم روش سے زیادہ متاثر رہے۔ اسی طرح اعراب بالحروف پیش کا استعمال، ہا کار آوازوں کی لکھاوٹ میں وہ املا کے پرانے طریقے کو ہی برتتے رہے۔

غالب کی املا کے سلسلے میں ڈاکٹر انجم نے جزئیات سے جس مدلل انداز میں بحث کی ہے اس سے املا کی معیار بندی کی ایک واضح شکل سامنے آجاتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ املا کی معیار بندی کس قدر اہم بات ہے جس پر ہنوز خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے اور آج بھی بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کی املا مختلف طریقے سے

رائج ہے۔ جو بہرحال درست نہیں۔ گرچہ پہلے کے مقابلے میں بہت حد تک ایک معیار وسمت اسے دیا گیا ہے لیکن ابھی اور توجہ کی ضرورت ہے۔

غالب کی زبان پر فارسی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے خلیق صاحب نے اطمینان کا اظہار کیا ہے کہ اس دور میں جس طرح فارسی کا چلن تھا اور خود غالب بنیادی طور پر فارسی کے ادیب وشاعر تھے البتہ اردو ان کی روزمرہ گفتگو کی زبان تھی لہٰذا اردو میں کچھ بھی لکھتے وقت ان کے ذہن پر فارسی کا کچھ غلبہ ضرور رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے اردو میں جو دیباچے اور تقریظیں لکھی ہیں ان پر فارسی کے خاصے گہرے اثرات ہیں۔ اس کے برعکس خطوط غالب پر بھی اگرچہ فارسی کے اثرات ہیں لیکن ان کے مقابلے کم ہیں۔

غالب کے اردو خطوط میں جو فارسی محاورے اور اجنبی فارسی وعربی لفظ استعمال ہوئے ہیں اس کے بارے میں خلیق صاحب نے یقینی طور پر کچھ کہنے سے گریز کیا ہے کہ یہ پہلی بار غالب نے استعمال کیے یا ان کے عہد کی اردو نثر میں رائج تھے اور بعد میں متروک ہو گئے۔ انھوں نے امکانی گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ کچھ الفاظ اور محاورے رائج ہوں اور کچھ غالب نے پہلی بار استعمال کیے ہوں متنی نقاد کی ذمے داری یہ ہے کہ وہ اس بات کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے کہ ٹھوس نتائج برآمد ہو سکیں جن سے حقیقت کی بازیافت میں مدد مل سکے، اسے غیر ذمہ دارانہ اور قیاسی گفتگو سے جہاں تک ممکن ہو پرہیز کرنا چاہیے خود ڈاکٹر صاحب نے تیاریٔ متن کے سلسلے میں اپنی کتاب "متنی تنقید" میں جو اصول وضع کیے ہیں اس میں پہلا اصول ہی یہ ہے کہ

"متنی نقاد کا فرض ہے کہ مختلف عہد کے کچھ منتخب نسخے پڑھے تاکہ اسے مختلف تحریروں پر پورا عبور حاصل ہو سکے۔ فرض کیجیے ہمیں انعام اللہ خاں یقین کا دیوان مرتب کرنا ہے۔ یقین کی ولادت ۱۱۴۰ھ میں ہوئی، ان کی ادبی زندگی کا آغاز کم ازکم پندرہ برس کی عمر یعنی لگ بھگ ۱۱۵۵ھ میں ہوا ہوگا متنی نقاد کو اس عہد سے قبل کے کچھ نسخے پڑھنے چاہئیں۔ اس انتخاب کے باقاعدہ اصول تو نہیں ہیں لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یقین کی ادبی زندگی کے آغاز سے پہلے خان آرزو اور ان کے شاگرد میدان ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس اسکول کے کچھ نمایاں شاعر منتخب کر لیے جائیں۔ جن شعرا کا دیوان ملتا ہے ان کے دیوان حاصل کیے جائیں اور باقی شعرا کا مطالعہ تذکروں کی مدد سے کیا جائے۔ اگر یقین نے کچھ ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو خاں آرزو کے عہد میں رائج تھے لیکن بعد میں متروک ہو گئے تو انھیں سمجھ پڑھنے میں مدد ملے گی۔"

لیکن خود ڈاکٹر صاحب نے خطوط غالب کے سلسلے میں اپنے اس اصول کی خلاف ورزی کی ہے انھوں نے عہد غالب کی نثر کے مطالعے اور موازنے کی زحمت ہی نہیں کی اور قیاس سے کام لے کر آگے بڑھ گئے۔ اگر مطالعہ اور موازنہ کیا جاتا تو غالب کے یہاں استعمال شدہ کچھ الفاظ اور محاوروں کے بارے میں یقینی طور پر پتہ چل جاتا کہ یہ پہلے پہل غالب نے استعمال کیے یا یہ غالب سے پہلے بھی رائج تھے۔

یہاں پر ڈاکٹر صاحب اپنی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "بہرحال اس معاملے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے خطوط غالب اور عہد غالب کی اردو نثر کا لسانی تجزیہ ضروری ہے۔ جو ظاہر ہے کہ آسان کام نہیں" بے شک یہ کام آسان نہیں متنی نقاد کا یہ فرض ہے کہ وہ اس بات کی چھان بین کرے اور اس عہد کے نثری سرمایے کا

جائزہ لے۔ اس کے لیے اسے اس عہد کی زبان پر بھی عبور حاصل ہونا ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب ممکن ہے زبان پر عبور رکھتے ہوں لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ فروگذاشت ان کی اس تحقیق کی اہمیت کو کم کر سکتی ہے اور متنی تنقید کی رو سے بھی اس کی صحت پر شبہے کی گنجائش رہے گی۔ خلیق صاحب نے جہاں اتنی دیدہ ریزی اور عرق ریزی سے اتنا بڑا کام کیا وہیں ان کو تھوڑی محنت اور کر کے اس حقیقت کی بازیافت کی بھی حتی المقدور کوشش کرنی چاہیے۔

انجم صاحب نے خطوط غالب سے اس طرح کے محاوروں اور الفاظ کی نشاندہی کی ہے اور ان کے اصل مفہوم اور غالب نے جو مفہوم استعمال کیا ہے دونوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ لیکن یہ کام اس عہد کی نثر کے موازنے کے بغیر ادھورا ہی سمجھا جائے گا۔

اسی باب کے آخری حصے میں غالب کے یہاں انگریزی الفاظ کا استعمال ان کا تلفظ، املا اور ان کے اردو ترجمہ پر روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ غالب کے عہد میں انگریزی کا چلن عام ہو چکا تھا اور بہت سے انگریزی الفاظ کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا تھا۔ اور بہت سے جوں کے توں قبول کر لیے گئے تھے۔ اور غالب نے اپنے خطوط میں ان تمام طرح کے الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ خلیق صاحب نے ہر سطح پر اس کا جائزہ لیا ہے۔ تلفظ کا اندازہ ان الفاظ کی املا سے لگانے کی کوشش کی ہے جو غالب نے اپنی تحریروں میں استعمال کیا ہے۔ گرچہ آج وہ تلفظ باقی نہیں جیسے سکرتری، اگورمنٹ، برگڈیر وغیرہ۔ بعض انگریزی الفاظ کی جو املا غالب نے کی ہے وہ آج اردو کے لیے قابل قبول نہیں۔ جیسے اجینٹ (Agent) نمبر (Number) چک (Cheque) وغیرہ۔ کچھ انگریزی الفاظ کی املا آج بھی وہی ہے جو غالب نے استعمال کی ہے جیسے ٹکٹ، ڈاکٹر، پارسل وغیرہ انگریزی الفاظ کے اردو ترجمے جو غالب نے استعمال کیے ہیں ان کی فہرست بھی دی ہے اس تجزیے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غالب اپنے عہد میں ہونے والی تبدیلیوں سے کس حد تک آگاہ تھے اور ایک نئی زبان کو کس حد تک برتنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے اس عہد میں ہونے والی تبدیلیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جو مغربی اثرات کی وجہ سے لوگوں کی روزمرہ زندگی میں تیزی سے ہو رہی تھیں اور لوگ ایک نئے نظام ایک نئی تہذیب اور ایک نئے تمدن سے اثر پذیر ہوتے جا رہے تھے۔ یہ نظام برطانوی سامراج اپنے ساتھ لایا تھا۔ جس کا اثر زبان کی سطح پر بھی نمایاں حد تک پڑا تھا اور عام گفتگو میں انگریزی الفاظ بڑی حد تک رچ بس گئے تھے جس سے غالب بھی اس معاشرے کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے نہ بچ سکے۔

اس کے بعد غالب کے اردو خطوں کی ایک فہرست دی گئی ہے مکتوب الیہ کا نام اور ان کے نام لکھے گئے خطوط کی تعداد دی ہے۔ کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جن پر مکتوب الیہ کا نام نہیں ہے۔ اس طرح غالب کے کل خطوط کی تعداد ۸۰۳ بتائی گئی ہے۔

اس کتاب میں "خطوط غالب کا تنقیدی مطالعہ" کے عنوان سے ایک بہت ہی طویل باب قائم کیا گیا ہے جس میں بہت سی ضمنی سرخیوں کے تحت غالب کے خطوط کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ پہلے غالب سے قبل اردو نثر کے سرمایے اور مکتوب نگاری کے آغاز سے بحث کی ہے اور یہ پتہ چلانے کی کوشش کی ہے کہ غالب کی اردو مکتوب نگاری سے قبل کس قسم کی نثر رائج تھی اور اس سلسلے میں غالب کا کارنامہ کیا ہے۔ اس باب میں خلیق انجم نے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اور حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ غالب نے اردو مکتوب نگاری کو ایک نئی راہ دکھلائی اور اس فن کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا۔ جہاں تک مکتوب نگاری کا تعلق ہے اس کا آغاز غالب سے قبل ہو چکا تھا۔ ہاں

جدت ادا غالب نے ہر دور پیدا کی۔

خلیق انجم نے غالب کا پہلا دستیاب اردو خط میں مختلف حوالوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ غالب کے اب تک دستیاب شدہ اردو خطوط کی روشنی میں قدیم ترین خط تفتہ کے نام ہے جو ۱۸۴۷ء میں لکھا گیا۔ گرچہ جلال الدین صاحب نے ۱۹۷۵ء میں پانچ اردو غیر مطبوعہ خطوط کا تعارف کرایا تھا جس کی بنیاد پر پہلا اردو خط ۲۵ اپریل ۱۸۴۶ء قرار پاتا ہے چونکہ جلال الدین صاحب نے ان خطوط کی اشاعت سے اب تک گریز کیا ہے اس لیے اس کے جعلی ہونے کا شبہ ہے۔

مکتوب نگاری کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے لطیف ترین فن قرار دیا ہے اور اس کی اہمیت و افادیت پر ادبی، سماجی، سیاسی اور تاریخی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔ خط گرچہ ایک شخص کی نجی اور ذاتی چیز ہوتی ہے اور اس سے صرف ایک شخص کی آواز ابھرتی ہے لیکن اس ایک آواز کی اتنی اہمیت ہے کہ اس کے اندرون میں جھانک کر ہم بہت سے مسائل اور اس عہد کی بہت سی باتوں کا پتہ چلا لیتے ہیں۔ آج غالب اور اس کے عہد کی تفہیم میں غالب کے خطوط کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر عہد میں مکتوب کی اپنی ایک الگ اہمیت رہی ہے اور آج بہت سے فن کار اپنے اس فن کی وجہ سے زندہ ہیں جن کی مثال بھی خلیق انجم نے اپنے اس جائزے میں دی ہیں۔

مکتوب نگاری کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے خلیق انجم نے اسے بہت قدیم قرار دیا ہے اور اس کا رشتہ فن تحریر کی تاریخ سے جوڑا ہے۔ غالباً یہ کئی ہزار برس پہلے وجود میں آیا۔ اور آج اس کی ترقی یافتہ شکل ہمارے سامنے ہے۔

"شگفتن گل ہائے ناز" کے تحت غالب کی نثر نگاری کے آغاز و ارتقا اور غالب کے خطوط کی نثر، القاب و آداب، آئین نامہ نگاری، خطوط میں مکالمہ نویسی غالب کے انداز بیان وغیرہ سے تفصیلی بحث کی ہے۔ غالب کی اردو نثر میں استعاروں کے استعمال سے جو حسن پیدا ہوا ہے اور غالب کی تشبیہیں اور غالب کے فقرے جن کے استعمال نے غالب کی نثر میں زیادہ معنویت، اثر اور حسن کاری پیدا کی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور بہت سی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ غالب نے اپنے خط میں اپنی بات کو زیادہ موثر بنانے اور مفہوم کو زیادہ واضح کرنے کے لیے جو شعروں کا استعمال کیا ہے خلیق انجم نے مثالوں کے حوالے سے اس سے بھی گفتگو کی ہے۔

غالب نے اپنی عزت اور مفلسی کی داستان جس مضحکہ خیز انداز میں بیان کی ہے خلیق انجم نے خطوط کے حوالے سے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ "یہ صرف غالب کی داستان نہیں بلکہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد اس پورے طبقے کی داستان ہے جو کبھی مسندِ اعتبار پر جلوہ افروز تھا۔ اور جواب قرض پر زندگی بسر کر رہا ہے۔"

اس طرح غالب کا ذاتی خط اس پورے معاشرے کا عکاس ہے جس میں غالب رہ رہے تھے۔ خلیق انجم نے غالب کے ذاتی درد کو پورے معاشرے کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور صرف غالب ہی نہیں بلکہ اس پورے معاشرے کو رنج والم کا شکار بتلایا ہے۔ جو حقیقت پر مبنی ہے۔ رنج کی توگری سے غالب کے اندر جو ظرافت پیدا ہوئی اور جس کا اظہار غالب نے اپنے بعض خطوں میں کیا خلیق انجم نے حوالے کے ساتھ اسے بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ اور کہا ہے کہ "غالب کی ظرافت زندگی سے مفاہمت کے جذبے کے تحت پیدا ہوئی۔" یہ

نتیجہ انھوں نے غالب اور غالب کی تحریروں کی روشنی میں نکالا ہے جو بہت حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔

غالب نے دلّی کی تباہی و بربادی اور انگریزوں کے ظلم وستم کی داستان بھی اپنے بہت سے خطوں میں بیان کی ہے۔ خلیق انجم نے "ماتم یک شہرِ آرزو" کے تحت غالب کے خطوط کے حوالے سے اس پر گفتگو کی ہے اور غالب کی تحریروں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالب کو مغل حکومت کے خاتمے اور بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری سے زیادہ غم ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں دلی کی تباہی و بربادی کا تھا۔ جس میں خود ان کی اپنی بربادی بھی شامل ہے۔ اور اس ہولناک منظر کو غالب نے اپنے خطوں میں مختلف طریقے سے بیان کیا ہے۔ گویا غالب کا یہ خط ایک تاریخی دستاویز ہے جس میں غالب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس عہد کی ہنگامہ آرائیوں کے تمام تر نقوش اجاگر ہوتے ہیں۔

غالب کے خطوط میں بہت سے خطوط ایسے بھی ہیں جن میں غالب نے کسی کی موت پر اس کے اعزہ اقارب سے تعزیت کی ہے لیکن تعزیت کا حق ادا نہیں کر پائے ہیں اور رسمی الفاظ پر زیادہ تر اکتفا کیا ہے۔ لیکن اپنے مخصوص اسلوب سے اظہار میں جان ڈال دی ہے اور غیر معمولی حد تک موثر بنا دیا ہے۔ غالب کے یہ تمام خطوط اپنی جگہ اہم ہیں۔ غالب نے تعزیت ناموں میں طنز و مزاح سے بھی کام لیا ہے جو غالب کی اپنی انفرادیت ہے۔

اس طرح خلیق انجم نے سوا دو سو صفحے کے بسیط مقدمے میں غالب، عہدِ غالب اور خطوط غالب کے بہت سے رموز و اسرار سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے، اور خطوط کے حوالے سے بہت سے انکشافات کیے ہیں۔ جو ان سے قبل نہیں ہوئے۔ خلیق انجم نے اپنے اس مقدمے میں جو بظاہر بہت طویل ہے اور آدھی کتاب پر محیط ہے خطوط غالب کی تمام جزئیات کو زیرِ بحث لا کر ان پر تشفی بخش جواب دینے کی کوشش کی ہے، اگرچہ کہیں کہیں ان کی باتوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن مجموعی طور پر اختلاف کی گنجائش کم ہے اور اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی تدوین میں غیر معمولی ذہانت و محنت کا ثبوت دیا ہے جس سے اس موضوع پر ان کے مطالعے اور وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ طویل مقدمہ غالب اور عہدِ غالب پر تحقیق کرنے والوں کو بہت کچھ روشنی فراہم کرے گا۔ اور غالب اور عہدِ غالب کی تفہیم میں بھی مدد دے گا۔

اس طویل مقدمے کے بعد خطوط ترتیب دیے گئے ہیں پہلی جلد میں صرف دو شخصیتوں کے نام خطوط شامل ہیں، مرزا ہرگوپال تفتہ اور نواب علاء الدین احمد خاں علائی، تفتہ کے نام کل ۱۲۳ خطوط اور علائی کے نام ۵۸ خطوط شامل ہیں۔ دونوں کی تصویریں اور چند خطوط بھی شامل ہیں۔ لیکن یہاں بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ ان دونوں مکتوب الیہ کے حالات نہیں دیے گئے جب کہ اس کا ہونا بہت ضروری تھا۔ تفتہ اور علائی سے غالب کے تعلقات کیا تھے اس پر خط سے تو کچھ روشنی پڑتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کو ان دونوں پر تفصیل سے لکھنا چاہیے تھا۔ انھوں نے "کچھ اس تنقیدی اڈیشن کے بارے میں" لکھتے ہوئے "مکتوب الیہ کے حالات" کے عنوان سے یہ لکھا ہے۔

"میں نے مکتوب الیہم کے حالات خاصے تفصیل سے لکھے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے عزیز دوست کاظم علی خاں نے تمام مکتوب الیہم کے حالات بڑی محنت سے لکھ لیے ہیں اور کتابی صورت

میں شائع کر رہے ہیں، اس لیے میں نے یہ حالات بہت مختصر کر دیے۔"

میں نے پوری کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھ ڈالا لیکن کہیں بھی مجھے مختصر حالات بھی دیکھنے کو نہیں ملے پھر یہ کہ کاظم علی خاں نے لکھ ڈالا اس لیے انھوں نے اپنی کتاب میں دینے سے گریز کیا۔ میرے خیال میں کسی بھی طور پر مناسب نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ حالات اپنی کتاب میں شامل کرنے چاہیے تھے تاکہ خطوط کا مطالعہ کرنے سے قبل قاری مکتوب الیہ کے حالات بھی پڑھ لیتا اس سے بھی بہت سے گوشے روشن ہوتے۔ اب قاری غالب کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے پہلے کاظم علی خاں کی کتاب مکتوب الیہم کے حالات پڑھنے کے لیے کہاں تلاش کرتا پھرے گا۔ یہ ایک بڑی کمی ہے جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے تاکہ دوسرے اڈیشن میں اس کو شامل کیا جا سکے۔

خطوط کے بعد آخر میں متن کے ماخذ کی ایک لمبی فہرست شامل ہے جس میں خطوط غالب کے ان مجموعوں، مختلف کتابوں اور رسالوں کی فہرست دی گئی ہے جنھیں متن کے ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ پھر ہر خط کا پہلا فقرہ دیا گیا ہے اور خط کی تاریخ تحریر دے کر اس کے متن کے ماخذ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ سب چیزیں بہت ہی سلیقے سے نہایت ہی سائنٹی فک انداز سے ترتیب دی گئیں ہیں۔

آخری حصے میں حواشی درج کیے گئے ہیں۔ حواشی طویل اور مختصر دونوں طرح سے دیے گئے ہیں اور دونوں اپنی جگہ اہم ہیں۔ طویل حواشی میں جو وضاحتیں ہیں وہ زیادہ کارآمد اور مفید ہیں اور ان سے بہت سی اہم باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ حواشی میں اور تفصیلات کے علاوہ اختلافات نسخ بھی درج ہیں۔

دوسری جلد میں ۷۴ شخصیتوں کے نام کل ۲۸۷ خطوط شامل ہیں۔ جن شخصیتوں کے نام خطوط ہیں وہ یہ ہیں۔ ان کے خطوط کی تعداد بھی سامنے دی جا رہی ہے۔

میر مہدی مجروح ۵۰، میاں داد خاں سیاح ۳۵، چودھری عبدالغفور سرور ۲۷، حکیم غلام نجف خاں ۲۳، خواجہ غلام غوث خاں بے خبر ۲۵، نواب حسین مرزا ۶، نواب امین الدین احمد خاں ۸، مرزا شہاب الدین ثاقب ۱۰، مرزا حاتم علی مہر ۱۹، مولانا محمد نعیم الحق آزاد ۲، فرقانی میرٹھی ۱، مولانا عباس رفعت ۲، محمود مرزا ۱، عبدالحق ۱، حکیم محب علی ۱، مولوی ضیاء الدین خاں ضیا ۳، مہاراجہ سردار سنگھ والی بیکانیر ۱، شہزادہ بشیر الدین ۴، حکیم غلام مرتضٰی خاں ۱، مرزا باقر علی خاں کامل ۳، میر احمد حسین میکش ۲، میر سرفراز حسین ۲، مرزا عباس بیگ ۱، نواب یوسف مرزا ۱۲، مولوی احمد حسین قنوجی ۲، مرزا شمشاد علی بیگ رضوان ۲، منشی کیول رام ہشیار ۱، میر افضل علی میرن ۳، منشی ہیرا سنگھ ۲، ماسٹر پیارے لال آشوب ۵، محمد زکریا خاں ذکی دہلوی ۱، یوسف علی خاں عزیز ۳، منشی غلام بسم اللہ ۱، میر بندہ علی خاں عرف مرزا میر ۱، محمد محسن صدر الصدور ۱، نامعلوم ۱، سید سجاد مرزا ۲، نواب مصطفٰے خاں بہادر شیفتہ ۱، حکیم ظہیر الدین احمد خاں ۲، مرزا قربان علی بیگ خاں سالک ۲، میر محمد زکی زکی ۱، مردان علی خاں رعنا ۲، ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں ۱، احمد حسین سینا مرزا پوری ۲، شیخ لطیف احمد بلگرامی ۱، بابو ہرگوبند سہائے نشاط ۲، مولوی محمد عبدالرزاق شاکر ۱۰،

اس جلد میں ۲۲ خطوط کے عکس بھی شامل ہیں جو درج بالا شخصیات کو لکھے گئے ہیں۔

تیسری جلد میں ۱۷ شخصیتوں کے نام کل ۲۹۰ خطوط اور ۸۲ عکس شامل ہیں۔ خطوط ان حضرات کے نام ہیں۔

نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق ۲۰، نواب میر غلام بابا خاں ۱۰، منشی محمد ابراہیم خلیل ۱، نواب میر ابراہیم خاں ۵، صاحب عالم مارہروی ۶، شاہ عالم ۳، حکیم سید احمد حسین مودودی ۱۱، منشی سخاوت حسین ۱، منشی بہاری لال مشتاق ۲، ظہیر الدین کی طرف سے ان کے چچا کے نام ۱، سید بدر الدین احمد کاشف المعروف بہ فقیر ۵، منشی عبداللطیف ۲، منشی شیو نرائن

آرام ۳۶، منشی نبی بخش حقیر ۰، تفضل حسین خاں ۱، نواب سید محمد یوسف علی خاں بہادر ناظم ۴، نواب کلب علی خاں بہادر ۶، وغیرہ۔

دوسری جلد میں خط کا عکس اور متن آمنے سامنے دیے گئے ہیں۔ جب کہ تیسری جلد میں تمام عکس ایک جگہ دیے گئے ہیں اور عکس پر نمبر شمار وہی ڈالا گیا ہے جو کتابت شدہ خطوط پر ہے۔ اس طرح یہاں عکس کے نمبر بالترتیب نہیں ملیں گے۔ ایسا قاری کی سہولت کے لیے کیا گیا ہے۔ ان دونوں جلدوں میں بھی متن کے ماخذ اور حواشی کے وہی طریقے برتے گئے ہیں۔ جو جلد اول میں قائم کیے گئے ہیں۔ ان دونوں جلدوں میں بھی مکتوب الیہم کے حالات درج نہیں کیے گئے ہیں۔

ان دونوں جلدوں کے فلیپ اور پشت پر پہلی جلد پر کیے گئے تبصرے کے اقتباسات ہیں جو ہند و پاک کی مشہور و معروف ادبی شخصیتوں نے کیے ہیں۔ تین اقتباسات انگریزی اخبار کے ہیں جو یوگیندر بالی ٹائمز آف انڈیا دلی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کشمیر ٹائمز سری نگر اور "اسٹیٹس مین" نئی دلی میں شائع ہوئے ہیں۔ اردو کے جن محققوں اور ناقدوں نے خلیق انجم کے اس تحقیقی کارنامے پر اپنی قیمتی آرا کا اظہار کیا ہے وہ یہ ہیں۔ مالک رام، رشید حسن خاں، پروفیسر مختار الدین احمد، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر عبدالمغنی، ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی، ڈاکٹر نثار ایرن رستوگی، بلراج کومل، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، علی جواد زیدی، ڈاکٹر شارب ردولوی، رضوان احمد، ڈاکٹر مسیح اللہ اشرفی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ایم حبیب خاں۔

ان تمام حضرات کی رائے مثبت اور مرتب کے حق میں ہے۔ کچھ حضرات کا انداز داد و تحسین کا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اردو میں اس پایے کی تحقیق نہ پہلے ہوئی ہے اور نہ آیندہ ہونے کی توقع ہے۔

تعریف و تحسین کا یہ انداز جو کسی بھی تخلیق کے بارے میں ہو تخلیق کار یا محقق کو حوصلہ نہیں بخشتا۔ بلکہ گمراہ کرتا ہے۔ لوگ دوستی میں دوست کی دل آزاری کی وجہ سے سچی بات نہیں کہہ پاتے نتیجتاً اگر کوئی خامی رہ بھی جاتی ہے تو اس کی نشاندہی ہونے کی بجائے اس پر بھی اچھائی کی مہر لگا دی جاتی ہے۔ یہ سچی دوستی نہیں بلکہ دوست اور اس کی تحقیق دونوں کے ساتھ منافقت ہے اور ادب میں اس رویے کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیے۔

وہ لوگ یقیناً قابل احترام ہیں جنھوں نے خلیق انجم کو ان کی بعض خامیوں سے آگاہ کیا اور ڈاکٹر صاحب نے ان کے مشورے سے استفادہ کرتے ہوئے ان کی اصلاح کی جو بقول ڈاکٹر صاحب چوتھی جلد میں یہ تسامحات ان حضرات کے نام سے شامل ہیں جنھوں نے ان کی طرف توجہ مبذول کرائی ڈاکٹر صاحب کا یہ طریقہ تحقیقی طریقۂ کار کے عین مطابق ہے اور اس سے خلیق انجم کی تحقیقی دیانت داری کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ورنہ آج کے محقق دوسروں کی کیسی کیسی تحقیق ہضم کر جاتے اور ڈکارتے بھی نہیں۔ یہاں خلیق انجم کا انداز بہت ہی ایماندارانہ ہے جس سے ان کے اس تحقیقی کارنامے کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔

ایم۔حبیب خاں

انجمنِ خیال

(چند مشاہیر کے خطوط)

پروفیسر مسعود حسین خاں۔ علی گڑھ بنام ایم۔حبیب خاں

"کل آپ کا مرتب کردہ "کتاب نما" کا گوشۂ خلیق انجم نظر نواز ہوا۔ اسے پڑھ کر خلیق انجم صاحب کی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں کا علم ہوا جو اب تک میری نظر سے اوجھل تھے۔ خاص طور پر آپ کا مضمون "انجمن صاحب" بہت پسند آیا۔ اب آپ کی تحریر میں ایک خاص قسم کا رچاؤ اور روانی آگئی ہے۔ اس مضمون میں ایک آدھ واقعہ آپ نے ایسا لکھا ہے جو دانستہ یا نادانستہ طور پر حقیقت سے پرے ہے۔ لیکن اس پر گفتگو بالمشافہ ہوگی۔ انجم صاحب کو "اس کارے کردی" کے لیے میری جانب سے مبارک باد دیجیے اور کہیے کہ اسے پڑھ کر ان کا قد میری نظر میں اور دراز ہوگیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

"کتاب نما" نے یہ بہت اچھا کام کیا کہ ڈاکٹر خلیق انجم کا گوشہ شائع کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم ایک فعال اور سرگرم علمی شخصیت ہیں اور میں انھیں ایک زمانے سے جانتا ہوں۔ میں نے انھیں ہمیشہ علمی لگن اور دل سوزی کے اعتبار سے زحل در آتش پایا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی کسی منصب پر پہنچ جاتا ہے تو اس کا لکھنا پڑھنا موقوف ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم میں نہ صرف تنظیمی صلاحیت ہے بلکہ اپنے علمی کام کو انھوں نے پس پشت نہیں ڈالا۔ کبھی کبھی تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ دہلی کی ہنگامہ پرور زندگی میں وہ اتنے کام ایک ساتھ کیسے کر لیتے ہیں۔ بعض امور میں ان سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی کارکردگی اور علمی لگن کا ہمیشہ سے قائل ہوں۔ "سودا" اور "متنی تنقید" سے لے کر "خطوط غالب" کی تحقیق و تدوین اور "آثار الصنادید" کے جامع نئے اڈیشن تک ایک طویل علمی سفر ہے۔ اس کی میں قدر کرتا ہوں۔ "کتاب نما" نے یہ گوشہ جناب ایم۔حبیب خاں سے مرتب کرا کے اور بھی اچھا کیا ہے۔ کیوں کہ حبیب صاحب کو ان کاموں کا سلیقہ ہے۔ وہ خود کثیر التصانیف ادیب ہیں اور انجمن کے دیرینہ کارکن کی حیثیت سے خلیق صاحب سے بہت قریب بھی ہیں۔

علی جواد زیدی۔ بمبئی، بنام ڈاکٹر خلیق انجم

آپ کا گوشہ بہت پسند آیا بس ایک خرابی ہے اس میں میرا مضمون نہیں ہے۔[1]

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد۔ پٹنہ بنام ایم۔حبیب خاں

"کتاب نما" کے تازہ شمارے میں آپ نے اردو کے بے لوث خادم اور صفِ اول کے ناقد و محقق ڈاکٹر خلیق انجم کی شخصیت اور ادبی خدمات سے متعلق جو گوشہ ترتیب دیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔ آپ

[1] زیرِ نظر شمارے (تیسرے اڈیشن) میں زیدی صاحب کا مضمون شامل ہے۔

نے خلیق صاحب کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں کو واقعی بڑے سلیقے سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں مناسب ترین لوگوں سے تحریریں حاصل کی ہیں۔ مجھے اس گوشے کی اشاعت سے از حد مسرت ہوئی۔

یوسف ناظم ۔ بمبئی، بنام ڈاکٹر خلیق انجم

"آپ کے گوشے سے متعلق بھی اسی خط میں لکھنا چاہتا تھا۔ انجمن سازی کی باتوں میں یہ اہم بات رہ گئی۔ شاہد علی خاں، ایم حبیب خاں اور خلیق احمد خاں (خلیق انجم) کا ترنگا لہرایا۔ ایم حبیب خان اور شمیم جہاں کے مضامین بہت اچھے رہیں۔ آپ کو خود نوشت لکھنی چاہیے۔ یہ بے موقع تکلف ــــ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے متعلق آپ کے خیالات سے آگاہی ہوئی۔ سوچ رہا ہوں مبارکباد کا خط شاہد علی خاں صاحب کو لکھوں، آپ سے کیا لینا دینا۔

ڈاکٹر نیر مسعود ۔ لکھنؤ، بنام ڈاکٹر خلیق انجم

"کتاب نما" میں آپ کے متعلق تحریریں بہت دل چسپی سے پڑھیں۔ ان تحریروں کو کچھ اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں بھی چھپنا چاہیے۔

نامی انصاری ۔ کان پور، بنام ڈاکٹر خلیق انجم

"آپ سے تھوڑا بہت واقف تو میں پہلے سے تھا مگر آپ کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں سے تفصیلی ملاقات "کتاب نما" کے ذریعہ ہوئی۔ میرے تجربے اور مشاہدے نے یہی بتایا ہے کہ علمی و ادبی کاموں میں منہمک رہنے والا شخص عملی کاموں میں صفر ہوتا ہے۔ اسی طرح عملی آدمی علم و ادب سے کم ہی دل چسپی رکھتا ہے اور رکھتا بھی ہے تو بس ایک خاص حد کے اندر دونوں طرح کے کاموں کو اعلا پیمانے پر سرانجام دینے کی ایسی حیرت انگیز صلاحیت موجود ہے جو شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ اس کا واضح ثبوت اگر ایک طرف چار جلدوں میں "غالب کے خطوط" اور تین جلدوں میں 'آثار الصنادید' ہے تو دوسری طرف دہلی کے قلب میں واقع اردو گھر کی شاندار اور وسیع عمارت ہے اور یہ تینوں کام ایسے ہیں جو اردو ادب کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے مستحق رہیں۔"

ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی ۔ استاد شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، بنام ایم حبیب خاں

ماہنامہ 'کتاب نما' بابت جولائی ۱۹۹۱ء موصول ہوا جس میں آپ کا ترتیب دیا ہوا گوشہ 'ڈاکٹر خلیق انجم' نظر سے گزرا تو مجھے انتہائی مسرت ہوئی۔ اس گوشے کی اشاعت سے ڈاکٹر خلیق انجم کی شخصیت کے ایسے گوشے جن سے لوگ ابھی تک ناواقف تھے وہ بھی منظر عام پر آگئے۔ آپ نے ان کا سوانحی خاکہ "انجمن صاحب" کے عنوان سے پیش کر کے بہت بڑا کام کیا ہے۔ مجھ جیسے بہت سے لوگ جو ان کی شخصیت اور حیات سے ناواقف تھے۔ ان کے سامنے ڈاکٹر خلیق انجم کی قد آور شخصیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ آپ کا طرز تحریر

نہایت صاف اور سلیس ہے جس میں ایک قسم کا ٹھہراؤ اور پختگی ہے باقی مضامین بھی لائق ستائش ہیں. لیکن ان میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد، رفعت سروش اور ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کے مضامین قابل توجہ ہیں. اور نہایت خوش اسلوبی سے لکھے گئے ہیں۔

دھرم پال عاقل ۔ شملہ، بنام ایم۔ حبیب خاں

'کتاب نما' کے خصوصی شمارے گوشۂ خلیق انجم نظر سے گزرا اس گوشے میں سب ہی مضامین معلوماتی ہیں اور ڈاکٹر خلیق انجم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کے نہایت قابل قدر کام کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد، کمال احمد صدیقی، تارا چرن رستوگی اور عبدالمغنی کے مضامین بہت پسند آئے۔ مہمان مدیر جناب ایم۔ حبیب خاں کا اداریہ بھی دل چسپ اور معلوماتی ہے۔

اشتیاق طالب

خلیق انجم صاحب کا گوشۂ ادب بہت پسند آیا۔ خلیق صاحب پر جو مضامین شائع کیے ہیں وہ معیاری اور قابلِ ستائش ہیں۔

فیاض رفعت ۔ بمبئی بنام ڈاکٹر خلیق انجم

'کتاب نما' کا خصوصی شمارہ بابت جولائی ۱۹۹۱ء عزیزی ہارون رشید اڈیٹر بلٹز کے توسط سے ملا سرورق پر آپ رونق افروز ہیں۔ بہت جی خوش ہوا۔ یوں تو سب ہی مضامین گوارا ہیں۔ اسلم پرویز صاحب آپ پر خاکہ لکھتے تو مزہ آجاتا۔ آصف جاہ صاحب نے بہترین مضمون لکھا ہے۔ انھیں بے حد مبارکباد۔

شفیقہ فرحت ، بھوپال

"کتاب نما" کا خصوصی شمارہ ملا۔ شمارہ بے حد جامع اور بھرپور ہے۔ ایم۔ حبیب خان صاحب نے بڑی محنت اور محبت سے اسے ترتیب دیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی حیات شخصیت اور فن کے تمام پہلو تمام گوشے سامنے آگئے۔ پوری رعنائیوں اور وضاحتوں کے ساتھ دریا کو کوزے میں بند کردیا۔ یا جن کو لوٹے میں۔

جگن ناتھ آزاد کی تحریر کی اس درجہ شگفتگی اس سے پہلے کہیں نظر نہیں آتی۔ تابانی انجم کہیے یا معجزۂ آزاد۔ بہرحال مبارک باد قبول فرمائیے کہ شمارے کے اس حصے پر ایک نظر (ترچھی ہی سہی)، آپ نے ۳۰۰ کے قریب کتابوں پر تبصرے کیے ہیں جو "ہماری زبان" اور دوسرے رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔ خلیق انجم صاحب کی ادبی خدمات کا جائزہ لینے کے لیے ایک کتاب درکار ہے۔ میں نے یہاں چند اشارے کیے ہیں۔

پروفیسر اشتیاق عابدی ۔ سکریٹری اردو اکادمی دہلی

جولائی کا "کتاب نما" ملا۔ اس میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب سے متعلق گوشہ بے حد پسند آیا۔ اگر آپ کے موقر جریدے کے باریک خط کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ ماشاءاللہ ہر زاویے سے ایک پورا۔ مکمل اور بھرپور خصوصی نمبر ہے۔ مضامین بھی بہت ہی اچھے ہیں اور ان سے ڈاکٹر صاحب کی ہم آہنگ شخصیت کے تمام ہی پہلو ابھر کر قاری کے ذہن و دل پر نقش ہو جاتے ہیں

رفیع الدین ہاشمی ۔ پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج. لاہور۔

علی جواد زیدی صاحب نے اشاریے میں تخلیق کار، اور ناقد کے باہمی رشتے اور تعلق پر خوبصورتی سے اظہار خیال کیا ہے۔ آخری پیراگراف خصوصیت سے، ہم سب کے لیے قابل توجہ اور لمحۂ فکریہ ہے۔
شمارہ ماقبل کا ایک حصہ گوشۂ "خلیق انجم" پر مشتمل تھا۔ حبیب خاں صاحب نے اسے اس عمدگی اور مہارت سے مرتب کیا ہے کہ اس سے خلیق انجم صاحب کی شخصیت کے بہت سے یا بیشتر پہلو سامنے آگئے ہیں (سارے تو نہیں، شاید وہ ممکن بھی نہیں)۔ یہ ان کی بہت دل آویز تصویر ہے۔ مجھے ان سے کئی بار دلّی اور لاہور میں بھی، ملنے کی مسرت حاصل ہوئی، مگر 'کتاب نما' کے ذریعے ان کی شخصیت اور صلاحیتوں کے ایسے پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہوئی، جس سے دل میں ان کی قدر بڑھ گئی. اردو زبان وادب کی ترقی اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی تجدید واحیاے نو کے لیے ان کی خدمات لائق ستایش اور ناقابل فراموش ہیں۔

ڈاکٹر شمس بدایونی. بریلی. بنام ایم. حبیب خاں

آپ کا خط مل گیا تھا کل کی ڈاک سے تین کتابوں کا پیکٹ موصول ہوا. شکریہ۔ رات اور صبح میں دیوان عرش اور خلیق انجم پڑھ ڈالی۔ دیوان عرش ایک بازیافت کی حیثیت رکھتا ہے مقدمہ بھی بھرپور ہے۔
ڈاکٹر خلیق انجم پر آپ کی مرتبہ کتاب بڑی دلچسپ ہے اس کے ذریعے ایک اچھے انسان سے متعارف ہونے کا موقع ملا آپ کا مضمون انجم صاحب اور شمیم جہاں کا مضمون کردار کا غازی مجھے خصوصیت سے پسند آئے جن میں ذاتی تعلق کی بنیاد پر اظہار خیال کیا گیا ہے. سب سے کمزور مضمون معاف کریں جگن ناتھ آزاد کا ہے. جو صرف چند دلچسپ واقعات تک محدود ہے۔ عنوان سے ذرا سی بھی مطابقت نہیں رکھتا. دیگر مضامین جن میں ان کی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے وہ اکثر معلومات افزا اور تحقیقی وتنقیدی بصیرت سے مملو ہیں۔
اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عہدہ یا کوئی ایسی نسبت جو نام کا حصہ بن جائے لوگ اسی کو پہچان بنا کر نام کی صورت میں بھی قبول کر لیتے ہیں ابتدا ر مزاح کے طور پر ہوتی ہے شاید آپ کو یاد ہو کہ یہاں پر طفیل کو یار لوگوں نے میاں نقوش لکھنا شروع کر دیا تھا. اکثر بعض احباب مجھے روشن کی نسبت سے روشن بدایونی لکھ دیتے ہیں۔ علی جواد زیدی صاحب نے قصیدہ نگاران اترپردیش میں جہاں جہاں میرے حوالے دیے روشن بدایونی لکھدیا. آپ کا

انجمن صاحب بھی اگر چل پڑا تو دلچسپ رہے گا۔ ____________ آپ کی کتاب پڑھ کر تو مجھے ایسا ہی لگتا ہے کہ ان کی حیثیت اردو اور اردو والوں کی ریل کے انجن کی سی ہے۔

آپ کی کتاب پڑھ کر خلیق صاحب سے ملنے کا اشتیاق بڑھ گیا ہے۔ کبھی دہلی آنا ہوا تو حاضر خدمت ہوں گا۔

کیا اردو ادب شائع ہو رہا ہے؟ 'ہماری زبان' میرے نام جاری فرما دیں اس کا چندہ ارسال کردوں گا۔

خلیق صاحب کی 'خطوط غالب' کے مکمل سیٹ کی قیمت کیا ہے اور کہاں سے مل سکتا ہے۔ براہ کرم مطلع فرمائیں۔

حسب ذیل خط جو قاضی عبدالجمیل جنوں بریلوی تلمیذ غالب کے نام ہے۔ براہ کرم مطلع فرمائیں کہ یہ خطوط غالب کی کون سی جلد میں ہے۔

جناب قاضی صاحب کو میری بندگی پہنچے مکرم مولوی غلام غوث خاں بہادر میر منشی کا قول سچ ہے۔ الخ ۔۔۔۔۔

۱۸ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ

مجھے یاد آتا ہے علی گڑھ میں میں نے اس کی پہلی یا دوسری جلد دیکھی تھی اس میں یہ خط شامل نہیں تھا۔ آپ بھی جلدیں دیکھ لیں۔

آج کل میں مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط مع حواشی ترتیب دے رہا ہوں۔ اقبال، رام بابو سکسینہ، نیاز، سیماب، جلال لکھنوی، اصغر گونڈوی، اثر لکھنوی، پروفیسر ضیا احمد، اعجاز حسین اور نہ معلوم کتنے مشاہیر ہیں۔ امید ہے کہ کام جلد از جلد نپٹ جائے گا۔

آپ کیا لکھ رہے ہیں۔ کبھی بریلی تشریف لائیے۔ میں بریلی کا مشہور انگلش میڈیم کالج ہارٹ مین کالج کے پاس اپنے ذاتی مکان میں رہتا ہوں۔ خط و کتابت شہر کے پتے پر کرتا ہوں کیوں کہ یہ نئی کالونی ہے۔ ڈاک اکثر ضائع ہو جاتی ہے آپ جب تشریف لائیں تو خط کے ذریعے مطلع فرما دیں۔

جناب حافظ شمس۔ آسنسول، بنام شاہد علی خاں

تازہ شمارہ میں گوشۂ خلیق انجم میں ایم۔ حبیب خاں اور رفعت سروش کا مضمون بہت پسند آیا۔ خلیق انجم نے پچیس سال میں اردو ادب کے لیے جو کچھ کیا ہے۔ اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انجمن ترقی اردو کے لیے ملک کا کونا کونا چھان مارا۔ آج یہ ادارہ خود کفیل ہے۔ کیا یہی ایک کام ایسا نہیں جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے۔

جناب سید مرتضیٰ حسین بلگرام۔ علی گڑھ، بنام شاہد علی خاں

"کتاب نما" اپنی نوعیت سے رسالہ نہیں، کتاب کہے جانے کی صف میں آتا ہے۔ جولائی ۹۱، شمارہ؛ خلیق انجم کے نام سے ان کے کام سے اور ان کی اہلیت کی فہرست سے معمور رہے۔ ایم۔ حبیب خاں صاحب جو ان دنوں انجمن ترقی اردو ہند کے اسسٹنٹ سکریٹری اور جنرل سکریٹری کے ہمراہیوں میں بھی ہیں اور کتاب نما کے اس شمارے کے مہمان خصوصی بھی، ان کا مضمون صفحہ ۳۰ سے صفحہ ۴۴ تک پر محیط ہے، جس میں قاری کو ہر طرح کا مواد مل جائے گا۔ خلیق انجم صاحب علی گڑھ کے طالب علم بھی رہے ہیں۔

جناب مشفق خواجہ۔ کراچی۔ بنام ایم۔ حبیب خاں

خلیق انجم صاحب کے بارے میں آپ نے بہت کم وقت میں بہت اچھا کام انجام دیا ہے۔ یہ آپ کے خلوص کا آئینہ دار ہے۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے اس بات کی ہوئی کہ آپ انجمن کے کاموں میں انجم صاحب کے معاون تو تھے ہی اب ذاتی طور پر بھی ان کے کام آرہے ہیں۔ آج کل ہر شخص اپنا ڈھول پیٹتا ہے لیکن آپ دوسروں کے کام آرہے ہیں۔ اس کتاب کے یوں تو بھی مضامین اچھے ہیں لیکن سب سے اچھا آپ کا مضمون ہے مضمون نہیں یہ شخصی خاکہ ہے آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے انجم صاحب کی شخصیت کے خدوخال ابھاگر کیے ہیں آپ کو خاکہ نگاری سے خاص مناسبت ہے۔ اس سے پہلے اختر انصاری مرحوم پر آپ کا خاکہ پڑھ چکا ہوں۔ وہ بھی بہت اچھا شخصی مطالعہ تھا۔ اس جہت میں کام جاری رکھیے۔ آپ نے بہت سے لوگوں کو قریب سے دیکھا ہے ان کے بارے میں اسی انداز کے مضامین لکھیے اور ایک مجموعہ مرتب کر لیجیے۔ لیکن زندہ لوگوں پر فی الحال نہ لکھیے۔ زندوں پر لکھنے میں نقصان یہ ہے کہ بہت سی باتیں مروت کی وجہ سے تحریر میں نہیں آپاتیں۔

صغریٰ مہدی۔ نئی دلی، بنام شاہد علی خاں

جولائی کے شمارہ میں گوشۂ خلیق انجم اجسے گوشہ کہنا زیادتی بلکہ ستم ظریفی ہے)، بہت خوب ہے اس کے لیے خلیق انجم کو بہت بہت مبارکباد۔ کہ اس کو پڑھ کر بے اختیار یہ منہ سے نکلا کہ سمجھے تھے ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا اور ایک نئے خلیق انجم سے ملاقات ہوئی۔ یہ اچھی بات ہے کہ بعض ادیب اپنی حیات ہی میں ایسا کچھ کر کے اور کروا کے جاتے ہیں کہ وہ یادر ہیں خدا ان کی عمر دراز کرے۔

اس کام کے لیے حبیب خاں سے زیادہ موزوں اور معتبر کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

پھر اگست کے شمارے میں مقتدر ادیبوں کے اس کی پسندیدگی کے خطوط مسعود حسین خاں تک کا اپنے انداز میں اس پر تبصرہ گوپی چند نارنگ کا خراج تحسین۔

ڈاکٹر عتیق احمد۔ کراچی، بنام ایم حبیب خاں

خلیق انجم نمبر آپ نے بہت خوب مرتب کیا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی گراں قدر ادبی کاوشوں اور اردو کے لیے ان کا اپنے شب و روز وقف کر دینا اس امر کے مقتضی تھے کہ ان کا اعتراف کیا جائے اور انھیں خراج تحسین پیش کیا جائے۔

آپ نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدمات جلیلہ کو جس انداز میں خراج تحسین ادا کرنے والا یہ وقیع کام کیا ہے اس کا کریڈٹ تو آپ کو جاتا ہی ہے، ساتھ ساتھ ہم سب اردو لکھنے پڑھنے والوں کی جانب سے آپ نے جو قرض اور فرض ادا کیا ہے، وہ بھی اپنی جگہ لائق تحسین ہے۔ آپ نے فی الواقعہ بڑا کام کیا ہے۔ مبارکباد۔ آپ کا خاکہ "انجمن صاحب" مزہ دے گیا۔ مزید مبارکباد۔

ڈاکٹر خلیق انجم

کچھ اپنی مدح میں

(خود نوشت)

میں نے اپنے آباو اجداد کے بارے میں خاندان کے بزرگوں سے جو سُنا اور بعض شواہد سے جو نتائج اخذ کیے، وہ یہ ہیں کہ ہم روہیلے پٹھان ہیں۔

ہمارے خاندان کے ایک بزرگ ہندوستان آئے تھے۔ یہ سپاہی پیشہ تھے۔ ہندوستان آکر شاہی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ خاندان کے کچھ افراد لاہور میں رنجیت سنگھ کے ملازم تھے۔ ہمارے پردادا ثمر خاں کے بارے میں روایت ہے کہ بہت بہادر اور جری سپاہی تھے۔ پڑھے لکھے تھے، لیکن زیادہ نہیں۔ دادا (اصغر خاں) اور ان کے بھائی رام پور میں مقیم ہو گئے۔ اپنے چچا اور تایا سے اتنا سُنا تھا کہ دونوں بھائی صاحبِ حیثیت تھے۔ کسی بات پر دونوں میں اختلاف ہوا اور ہمارے دادا ساری جائداد چھوڑ کر دہلی آگئے اور پھر کبھی رامپور نہیں گئے۔ ہمارے خاندان کے کچھ افراد اب بھی گھیر ملا غیرت خاں میں رہتے ہیں۔ میرے والد محمد احمد مرحوم ریلوے میں انجنیئر تھے۔ بہت اچھے آرٹسٹ بھی تھے۔ دولتمند تو نہیں تھے، لیکن اتنی آمدنی ضرور تھی کہ زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔ ہمارے نانا پروفیسر عزیز الرحمٰن انگریزوں کو اردو پڑھاتے تھے۔ دلّی کے لال قلعہ میں انگریزوں کو اردو پڑھانے کا ایک کالج تھا۔ منشی عزیز الرحمٰن صاحب اس کے پرنسپل تھے۔ فارسی اور اُردو کے عالم تھے۔ انھوں نے سات جلدوں میں "علم مجلس" کے نام سے اردو شعروں کی ڈکشنری مرتب کی تھی جو بہت مقبول تھی۔ انگریزی پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے انگریزوں کو اردو پڑھانے کے لیے کئی نصابی کتابیں لکھی تھیں۔ ان کتابوں میں انگریزی فقروں کا اردو ترجمہ رومن میں لکھا گیا تھا۔ ان کی دو تین تیار کی ہوئی نصابی کتابیں انگریزی اور اردو میں میری ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔ انھوں نے دہلی کی جامع مسجد پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی جس میں جامع مسجد کی مستند تاریخ بیان کی گئی تھی۔ اس کتاب کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

میری والدہ قیصر سلطانہ صاحبہ غیر معمولی صلاحیتوں کی خاتون تھیں۔ چوں کہ نانا مرحوم ہر وقت انگریزوں کے ساتھ رہتے تھے اس لیے وہ عورتوں کی تعلیم کے بہت حامی تھے۔ انھوں نے اپنے تمام لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی باقاعدہ تعلیم دلائی تھی۔ میری والدہ نے دہلی کے فرانسیسی گرلز ہائی اسکول میں اس زمانے میں تعلیم پائی جب مسلمان لڑکی کو تعلیم کے لیے گھر سے باہر بھیجنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ والدہ نے مڈل تک پڑھا تھا کہ شادی ہو گئی۔ ہمارے بچپن میں والدہ اور والد انگریزی میں بے تکلف بات کرتے تھے۔ والد کا انتقال ہو گیا اور کوئی ایسا نہیں رہا جس سے وہ انگریزی میں بات کر سکتیں۔ اس لیے مشق نہیں رہی۔ والدہ مرحومہ غیر معمولی ذہین خاتون تھیں۔ ہمارے بچپن میں گھر میں ایسے اُردو رسالے تھے جن میں والدہ کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ مضامین عورتوں کے سماجی مسائل پر تھے۔ والدہ قیصر سلطانہ عزیزی کے نام سے لکھتی تھیں۔ ان کے ابھی دس بارہ مضامین ہی شائع ہوئے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور

پھر وہ آلام روزگار میں ایسی گھریں کہ سر اُٹھانے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ والد کا تیس پینتیس سال کی عمر میں تقریباً ایک سال کی بیماری کے بعد انتقال ہوا تھا، گھر میں جو معمولی سا اثاثہ تھا، وہ سب ڈاکٹروں کی نذر ہوگیا۔ والد کا انتقال ہوا تو پانچ بچے تھے۔ ایک لڑکا یعنی میں اور چار لڑکیاں بعد میں جب والدہ نے ملازمت کرلی اور ہمارے حالات بہت خراب نہیں رہے تو والدہ نے ایک اور بچی عذرا کو گود لے لیا۔ اب گویا ہم چھ ہو گئے ایک بھائی اور پانچ بہنیں۔

والد کی وفات سے ہمارے خاندان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہا تھا۔ والدہ کی خودداری نے یہ گوارا نہیں کہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرتیں۔ ایک دولت مند خاندان میں نازونعم میں پلی ہوئی ایک لڑکی نے سلائی کا کام شروع کیا۔ گھروں پر جاکر ٹیوشن کیے اور اس کے ساتھ ہی دوبارہ تعلیم جاری رکھی۔ پرائیویٹ امتحان دینے شروع کیے۔ پانچ چھ سال میں اعلا تعلیم حاصل کی اور پھر اساتذہ کی تربیت حاصل کرکے دہلی کے ایک اسکول میں پہلے ٹیچر اور کچھ دن بعد ہیڈ مسٹریس ہوگئیں۔ والد کی وفات کے بعد والدہ کو سخت نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس لیے وہ کہتی تھیں کہ لڑکیوں کو اس قابل ضرور کردو کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکیں۔ اس لیے مفلسی اور غریبی کے باوجود انھوں نے مجھے اور میری پانچ بہنوں کو اعلاترین تعلیم دلوائی۔

میں ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو دہلی میں پیدا ہوا۔ دہلی میں اینگلو عربک اسکول میں تعلیم پائی۔ تیرہ سال کا تھا اور ساتویں کلاس میں تھا کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے ہو گئے۔ اسکول بند ہوگیا۔ چھ مہینے بعد اینگلو عربک اسکول کی اجمیری گیٹ شاخ کھل گئی۔ داخلے کے لیے گیا۔ اس وقت نویں کلاس میں طلبہ کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لیے پرنسپل صاحب نے معمولی سے سوال و جواب کے بعد مجھے نویں میں داخل کرلیا۔ اس اسکول میں پہلے دن میری ملاقات محمد اسلم خاں سے ہوئی۔ یہ نویں جماعت میں مجھ سے کچھ ہی دن پہلے داخل ہوئے تھے۔ محمد اسلم خاں سے میری دوستی ایسی ہوئی کہ پینتالیس سال گزرنے کے باوجود آج بھی ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست ہیں۔ ہماری دوستی کی اصل بنیاد، ادب میں دل چسپی تھی۔ ہم دونوں ناول افسانے اور شاعری کا بہت مطالعہ کرتے تھے۔ اسکول میں ہمارے ایک استاد تھے، رہبر پرتاپ گڑھی مرحوم۔ اچھے شاعر تھے۔ زبان پر بہت اچھی قدرت تھی۔ ادب میں دل چسپی رکھنے والے طلبہ پر بہت مہربان رہتے۔ ہم دونوں، محمد اسلم خاں اور میں، ان کے قریب آ گئے۔ وہ غالب کے عاشق تھے۔ غالب کا پورا اُردو دیوان انھیں یاد تھا۔ اکثر غالب کے اشعار کا مطلب سمجھاتے۔ ان کا ایک دلچسپ طریقہ یہ تھا کہ غالب کا ایک شعر دے دیتے۔ چھٹی کے بعد ایک درخت کے نیچے محفل جمتی۔ رہبر صاحب میرِ محفل اور حاضرین میں پانچ چھ طلبہ۔ ہر طالب علم غالب کے دیئے گئے شعر کا مطلب بتاتا۔ جس کا بتایا ہوا مطلب صحیح ہوتا، اسے رہبر صاحب جیب سے نکال کر گڑ کی ڈلی انعام میں دیتے۔ میں نے اور اسلم نے بار ہا گڑ کی ڈلی حاصل کی بلکہ اکثر گڑ کی ڈلی مجھے ملتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اردو بازار سے بیخود دہلوی کی شرح غالب خرید لی تھی۔ بازار میں کئی شرحیں تھیں لیکن میرے اور اسلم کے علاوہ اور کسی طالب علم کو ان کا علم نہیں تھا۔ کبھی کبھی صورتِ حال دلچسپ ہو جاتی کہ میں شعر کا مطلب تو بالکل صحیح بتاتا لیکن لفظوں کا مطلب غلط ہوتا۔ بہت عرصے تک رہبر صاحب پر یہ راز نہیں کھلا۔ طلبہ میں اسکول لائبریری کا سب سے

زیادہ استعمال میں اور اسلم کیا کرتے تھے۔ اسلم شعری مجموعوں کا مطالعہ کرتے، مجھے شاعری سے زیادہ نثر اور وہ بھی ناولوں کا بہت شوق تھا۔ میں نے لائبریری کے تقریباً سب ناول پڑھ لیے تھے۔

ہم دسویں کلاس میں پڑھتے تھے کہ رہبر صاحب کی صحبت بلکہ ان کی ترغیب نے ہمیں شاعر بنا دیا۔ محمد اسلم خاں، اسلم پرویز ہو گئے۔ میرا معاملہ دلچسپ تھا۔ والد مرحوم نے میرا نام غلام احمد خاں رکھا تھا۔ اسکول میں لڑکے غلام غلام کہہ کر چھیڑتے تھے۔ اس لیے والدین نے میرا نام خلیق احمد خاں کر دیا۔ شاعری کا شوق ہوا تو خلیق اقبال ہو گیا۔ مجھے یہ نام بہت پسند تھا۔ لیکن اسلم پرویز کو خلیق انجم پسند تھا۔ کئی مہینے کے بحث و مباحثے کے بعد میں خلیق اقبال سے خلیق انجم ہو گیا۔ رہبر صاحب نے مشورہ دیا کہ شاعری میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے نثر نگاری کی طرف توجہ کروں، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

ہمارے اسکول کے اساتذہ میں ممتاز مزاح نگار فرقت کاکوروی اور مشہور شاعر شمیم کرہانی صاحب بھی تھے۔ اسکول سے "اعتمادیہ" نام سے ایک میگزین شائع ہوتا تھا، جو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں بند ہو گیا تھا۔ میری کوشش اور اصرار سے پرنسپل صاحب اسے دوبارہ جاری کرنے پر راضی ہو گئے۔ فرقت صاحب کو انچارج اور مجھے اڈیٹر بنا دیا گیا۔ اس طرح میں فرقت صاحب سے قریب ہو گیا۔ فرقت صاحب اسکول کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ میں اکثر ان کے پاس بیٹھا رہتا۔ میں نے فرقت صاحب مرحوم کی رہنمائی میں "اعتمادیہ" کا کام شروع کیا۔ مضامین اکٹھا کیے اور اداریہ لکھا۔ اداریہ کا خاکہ فرقت صاحب نے بنایا تھا اور لکھا میں نے۔ اعتمادیہ کا یہ اداریہ میری وہ پہلی تحریر تھی جو چھپی۔ اسی زمانے میں ایک افسانہ لکھا جو علی گڑھ سے شائع ہونے والے ماہنامہ "جھلک" میں چھپا۔ افسانے کی اشاعت سے ہمت بڑھی۔ میں نے دو تین افسانے اور لکھے جو "جھلک" میں شائع ہوئے۔ دسویں کے امتحان کا واقعہ سُن لیجیے:۔

میں حساب میں ہمیشہ سے بہت کمزور تھا۔ ہماری کلاس میں ایک لڑکا تھا، اس کا نام تو یاد نہیں، اسے خلیفہ پیدل کہتے تھے۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ خلیفہ پیدل پہلوانی کرتے تھے، اس لیے اکھاڑے والے خلیفہ کہتے تھے۔ اسکول سے ان کا گھر بہت دور تھا۔ لیکن وہ اسکول پیدل آتے اور جب بھی موقع ملتا، پیدل چلنے کے فوائد پر لیکچر شروع کر دیتے، اس لیے ان کا نام خلیفہ پیدل ہو گیا۔ خلیفہ پیدل حساب میں بہت اچھے تھے۔ نویں کلاس میں انھوں نے مجھے نقل کرادی تھی اور میں حساب میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا تھا۔ چوں کہ میں دوسرے مضامین، خاص طور سے اُردو، فارسی اور انگریزی میں بہت اچھا تھا، اس لیے میرا رزلٹ خلیفہ پیدل کے مقابلے میں بہت اچھا تھا۔ اس کا بدلہ انھوں نے اس طرح چکایا کہ سال بھر تک وعدہ کرتے رہے کہ امتحان میں نقل کرا دیں گے۔ لیکن جب امتحان کا وقت آیا تو وہ امتحان کے کمرے میں مجھ سے بہت دُور جا کر بیٹھ گئے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے طلبہ سے بس اتنا مشورہ ہو سکا کہ میں بہ مشکل تمام پاس ہوا۔

اسلم پرویز بھی حساب میں کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ رزلٹ آنے کے بعد پرنسپل صاحب نے کچھ طلبہ کو دفتر میں بُلا کر مشورہ دیا کہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انٹرمیجیٹ میں داخلہ لے لیں۔ کیوں کہ اس طرح حساب سے نجات مل جائے گی، ورنہ ہائر سکنڈری کا امتحان بورڈ کا ہو گا اور اس میں پاس ہونے کا کوئی امکان نہیں

ہے۔ ہم حساب سے بہت عاجز تھے، اس لیے میں اور اسلم دونوں علی گڑھ چلے گئے۔ علی گڑھ میں ماہنامہ "جھلک" کے مالک نے مجھے ساٹھ روپے مہینے پر اڈیٹر مقرر کرلیا۔ ساٹھ روپے تنخواہ مجھے ملتی تھی، لیکن رسالے کا سارا کام میں اور اسلم دونوں کرتے تھے اور رسالے کا پیٹ بھرنے کے لیے ہم کہانیاں، لطیفے، فلمی واقعات اور سوال وجواب غرض سب ہی کچھ لکھتے۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں نثر لکھنے پر خاصی قدرت حاصل ہوگئی۔ ہمارا داخلہ ممتاز ہاسٹل میں ہوا تھا۔ ہمارے سینیر پارٹنر ابوسعید زیدی صاحب تھے۔ کمرے میں دو صاحبان اور تھے، خلیل الرحمٰن اعظمی اور انجم اعظمی۔ دونوں شاعر تھے۔ لیکن خلیل بہت پڑھے لکھے تھے۔ ہر وقت مطالعے میں مصروف رہتے۔ وہ جدید اور کلاسیکی ادب دونوں کا مطالعہ کرتے۔ لیکن مجھے کلاسیکی ادب سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ اب تک میں نے معمولی قسم کے ناول اور افسانے پڑھے تھے۔ خلیل صاحب کی صحبت میں مجھے اور اسلم کو سنجیدہ ادب میں دل چسپی پیدا ہوگئی۔ علی گڑھ کی لائبریری میں اُردو کتابوں کا زبردست ذخیرہ تھا، ہم نے لائبریری سے استفادہ شروع کر دیا۔ دو سال گزر گئے۔ ہم نے اچھے نمبروں سے انٹر کا امتحان پاس کرلیا اور بی۔ اے میں داخل ہوگئے۔

اس دوران ایک بُرا واقعہ یہ ہوا کہ "جھلک" بہت اچھا چل رہا تھا۔ دس بارہ ہزار کی اشاعت تھی، اشتہار بھی اچھے مل رہے تھے کہ "جھلک" کے مالک اور ان کے بھائی میں "جھلک" پر کچھ جھگڑا ہوا اور رسالہ بند ہوگیا۔ اسلم کے گھر سے تو ہر مہینے اچھی خاصی رقم آتی تھی، لیکن میری والدہ صرف بیس روپے مہینہ بھیجتی تھیں۔ حالات خاصے پریشان کن ہوگئے۔ ہم نے مجبور ہوکر علی گڑھ کی شمشاد بلڈنگ میں دہلی کیفے کے نام سے ایک ریستوراں شروع کیا جو بہت اچھا چل پڑا، چوں کہ ہم یونیورسٹی کے طالب علم تھے، اس لیے ہمارے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اسی حلقے کی وجہ سے یہ ریستوراں خوب چلا۔ لیکن ان دوستوں پر اتنا قرض ہوگیا کہ ریستوراں بند کرنا پڑا۔ علی گڑھ یونیورسٹی بھی عجیب وغریب تعلیمی ادارہ ہے، اپنے طالب علموں کو بھوکا نہیں مرنے دیتا۔ یونیورسٹی کے مختلف اداروں سے فیس کا انتظام بھی ہو ہی جاتا ہے۔ والدہ نے بیس روپے سے بڑھا کر تیس روپے کر دیئے اور کچھ یونیورسٹی سے مدد مل گئی۔ کام چل پڑا۔ ہم بی۔ اے فائنل میں آگئے۔ اس سال ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے باقاعدہ ادیب بنادیا۔

ہوا یہ کہ معین احسن جذبی صاحب نے کلاس میں ٹیوٹوریل دیا اور کہا کہ جو طالب علم جس موضوع پر چاہے، مضمون لکھ کر لائے۔ میں ان دنوں سراج اورنگ آبادی کی "بوستان خیال" پڑھ رہا تھا۔ سراج اورنگ آبادی اور مثنوی بوستانِ خیال پر خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب سے دیر تک گفتگو بھی ہوئی تھی، اس لیے میں مثنوی پر مضمون لکھ کر لے گیا۔ معین احسن جذبی صاحب نے مضمون کے دو تین صفحے ہی پڑھے تھے کہ ناراض ہوکر بولے کہ "میں نے کہا تھا کہ آپ مضمون خود لکھ کر لائیے۔ کسی کا مضمون نقل کرکے لانے کو نہیں کہا تھا۔"

یہاں ایک بات سُن لیجئے:

ہماری کلاس میں بیشتر طلبہ شاہجہانپور، مرادآباد، میرٹھ اور یوپی اور بہار کے قصبات کے تھے، اس لیے ان کی اُردو زیادہ اچھی نہیں تھی۔ میں اور اسلم ایک تو دلّی کے، دوسرے رہبر برتاپ گڑھی، فرقت کاکوروی صاحب کے تربیت یافتہ، اس لیے کم عمری میں جو غلط قسم کی خوداعتمادی اور بے جا گھمنڈ

پیدا ہوتا ہے، وہ ہم دونوں میں تھا۔ یہ گھمنڈ کبھی کبھی بدتمیزی کی حد تک پہنچ جاتا۔ کلاس میں غلط تلفظ پر لیکچرر تک کو ٹوک دیا کرتے تھے۔ پھر میں "جھلک" کا اڈیٹر رہا تھا۔ ان سب کی وجہ سے ہمارے ہم جماعت ہم سے بہت مرعوب رہتے تھے۔ اب جو جذبی صاحب نے مجھ پر ادبی چوری کا الزام لگایا تو کلاس میں تمام طلبہ نے انتقاماً زور کا قہقہہ لگایا۔ میں نے جذبی صاحب کو بتایا کہ مضمون میں نے لکھا ہے۔ انھوں نے غصّے سے کہا۔ "ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری" اور کاپی زور سے میری میز پر پٹخ دی۔

اس بے عزتی پر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شام کو ہاسٹل کے کمرے میں اُداس بیٹھا تھا۔ ابوسعید زیدی صاحب آئے تو اسلم نے انھیں کلاس کا واقعہ سُنایا۔ انھیں معلوم تھا کہ مضمون میں نے لکھا ہے۔ انھوں نے مجھے گلے سے لگا کر کہا کہ جذبی صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں، اگر انھوں نے تمھارے مضمون پر شبہ کیا کہ وہ کسی بڑے نقاد کا ہے تو اس سے بڑھ کر تمھارے مضمون کی اور تعریف کیا ہوسکتی ہے۔ انھوں نے زبردست حوصلہ افزائی کی اور اس کامیابی کا جشن منانے کے لیے ہمیں کیفے ڈی پھوس میں لے جاکر برفی اور نمک پارے کھلائے اور چائے پلائی۔ میں اس وقت تک بہت کچھ لکھ چکا تھا۔ لیکن سنجیدہ موضوع پر یہ میرا پہلا مضمون تھا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد میں نے یہ مضمون ماہنامہ "زندگی" کراچی کو بھیجا، جہاں فوراً چھپ گیا۔

بی۔ اے فائنل کا امتحان اور میں اور اسلم دونوں اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے اور ہم نے ایم۔ اے سائیکلوجی میں داخلہ لے لیا۔ چند روز بعد مجھے محسوس ہوا کہ مالی حالت علی گڑھ میں مزید قیام کی اجازت نہیں دیتی۔ میں دہلی واپس آگیا اور میری وجہ سے اسلم بھی دہلی آگئے۔ میں نے ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ مشکل یہ ہوگئی تھی کہ سب بہنیں تعلیم پا رہی تھیں۔ والدہ کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ اعلا تعلیم کا خرچ برداشت کرسکتیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ ملازمت کرکے اقتصادی طور پر والدہ کی مدد کروں گا۔ دلی اسکول آف اکنامکس میں گریٹر دہلی سروے ہو رہا تھا، جس کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو گھر گھر جاکر اطلاعات حاصل کرسکتے ہوں۔ اس سلسلے میں ایک فارم بھرنا ہوتا تھا۔ مثلاً اگر کوئی جواب دیتا کہ وہ یوپی سے دلی آیا ہے تو یوپی کا نمبر دُو تھا۔ اس خانے میں ہم "۲" لکھ دیتے تھے۔ ڈیڑھ سو کوڈ یاد کرنا آسان نہیں تھا، اس لیے صرف ان لوگوں کو ملازم رکھا جاتا جو اکنامکس میں ایم۔ اے ہوں، تھوڑی بہت ذہانت ہو اور حافظہ بہت اچھا ہو۔ دلی کالج (جو اَب ذاکر حسین کالج ہے) کے استاد ہلدر صاحب میرے مہربان تھے۔ ان کے قریبی دوست پروجیکٹ کے ڈائرکٹر تھے، چوں کہ یہ پروجیکٹ دو تین سال کا عارضی تھا، اس لیے قاعدہ قانون زیادہ سخت نہیں تھے۔ ہلدر صاحب نے میری سفارش کی اور ڈائرکٹر صاحب نے یہ کہہ کر مجھے ایک انویسٹی گیٹر کے حوالہ کردیا کہ پندرہ دن تک میں ان کے ساتھ فیلڈ پر جاکر تربیت حاصل کروں، پھر میرا ٹسٹ ہوگا۔ اگر کامیاب ہوگیا تو مجھے رکھ لیا جائے گا۔ مجھے ملازمت کی سخت ضرورت تھی۔ دس دن بعد ہی میں نے ٹسٹ دیا اور کامیاب ہوگیا۔ کچھ دن بعد اسلم بھی وہیں آگئے۔ ہم دونوں ایک تو دلی کے اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی کی خراد پر اُترے ہوئے۔ چند ہی روز میں یہ حال ہوگیا کہ جو کام کسی سے نہ ہوتا وہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو دیا جاتا۔

میں جس زمانے میں "جھلک" کا اڈیٹر تھا تو ایک خاص نمبر کے لیے مضمون کی فرمایش کرنے پر

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب ذاکر حسین کالج کے ہاسٹل میں رہتے تھے۔ خواجہ صاحب نے بہت دیر تک گفتگو کی۔ جب انھیں اندازہ ہوا کہ میری ادبی معلومات ٹھیک ٹھاک ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے وعدہ لیا کہ میں جب بھی دہلی آؤں گا، ان کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ لیکن میری بدتوفیقی کہ یہ وعدہ وفا نہیں ہو سکا۔ گریٹر دہلی سروے کا دفتر دلی یونیورسٹی کیمپس میں تھا۔ ایک دن یونیورسٹی میں خواجہ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے اُردو ایم۔ اے میں داخلے کا مشورہ دیا۔ بات سمجھ میں آگئی۔ گریٹر دہلی سروے میں وقت کی پابندی نہیں تھی۔ کسی وقت بھی فیلڈ میں جا سکتے تھے۔ چنانچہ اسلم اور میں نے اردو ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ دفتر کی ذمہ داریاں کچھ ایسی بڑھ گئیں کہ دو سال میں مشکل سے دو تین دفعہ ہی کلاس جا سکا۔ اساتذہ بھی چشم پوشی کرتے۔ میں نے انھیں اپنی مجبوریاں بتا دی تھیں۔ میں کلاس میں تو نہیں جاتا تھا، لیکن پڑھتا بہت تھا۔ امتحان ہوا۔ تیسؔ کے قریب پرائیویٹ اور ریگولر طلبہ میں سب سے زیادہ نمبر آئے، اگرچہ چار نمبر سے فرسٹ کلاس رہ گئی۔

رزلٹ کی تیاری کے وقت رجسٹرار آفس میں موڈریشن کمیٹی ہوتی تھی، جس میں اگر کسی طالب علم کی فرسٹ کلاس دو چار نمبر سے رہ رہی ہوتی تو اتنے نمبر دے دیئے جاتے تھے۔ میرا دکنی کا پرچہ سب سے اچھا ہوا تھا اور میں سوچتا تھا کہ سو میں سے نوّے نمبر آئیں گے۔ لیکن آئے کُل چالیس۔!! میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے مواد کی تلاش میں حیدر آباد گیا ہوا تھا۔ ادارہ ادبیات اُردو میں مقیم تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک صاحب، جو اس وقت انٹر پاس تھے، کچھ پرچے جانچ رہے ہیں۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ دلّی یونیورسٹی کے ایم۔ اے (اردو) کے دکنی کے پرچے ہیں۔ ان صاحب نے فخریہ بتایا کہ سات آٹھ سال سے وہ یہ پرچے دیکھ رہے ہیں۔ اصل ممتحن ڈاکٹر قادری محی الدین زور مرحوم تھے، مگر مصروفیات کی وجہ سے انھوں نے ادارہ ادبیات اردو کے ایک صاحب کو یہ کام سونپ دیا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اس پرچے میں میرے کل چالیس نمبر کیوں آئے تھے۔

دلی کالج کے پرنسپل ایم۔ ایم بیگ مرحوم (خدا ان کو جنت نصیب کرے) صرف کالج کے پرنسپل ہی نہیں ایک اعلا درجے کے انسان بھی تھے۔ انھوں نے بلا مبالغہ ہزاروں ہندو مسلم لڑکوں اور لڑکیوں کو ملازمت دلائی تھی، چوں کہ میں نے دلی کالج سے ایم۔ اے کیا تھا، اس لیے بیگ صاحب میری ملازمت کے لیے کوشاں تھے۔ ایک رات کو کوئی بارہ بجے ان کے ملازم نے آکر بتایا کہ بیگ صاحب نے صبح چھ بجے بلایا ہے۔ میں پونے چھ بجے ہی پہونچ گیا۔ انھوں نے بتایا کہ کل رات کو کہیں ڈنر پر کروڑی مل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ (جو آجکل گجرات کے گورنر ہیں)، سے ملاقات ہوئی تھی، ان کے کالج میں اردو کے ایک پارٹ ٹائم لیکچرر کی ضرورت ہے۔ بیگ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کی تین شرطیں ہیں: ایک تو یہ کہ امیدوار مسلمان ہو، دوسرے دلی کا ہو اور تیسرے شاعر ہو۔

میں نے عرض کیا کہ شروع کی دو شرطیں تو پوری کرتا ہوں، لیکن تیسری شرط پر پورا نہیں اترا، یعنی شاعر نہیں ہوں۔

بیگ صاحب نے پوچھا: ''اسلم نے کتنی غزلیں کہہ رکھی ہیں؟''

جواب دیا کہ ''چالیس پچاس''۔

"تو بھائی! آدھی ان کی اور آدھی تمھاری۔"

بات سمجھ میں آگئی۔ میں اسلم کی آدھی غزلیں لے کر دس بجے کالج پہنچ گیا اور پرنسپل کے کمرے میں بے دھڑک داخل ہو گیا۔

مجھے دیکھتے ہی ڈاکٹر سروپ سنگھ نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور چیخ کر کہا:

"کمرے سے باہر نکال دو۔ داخلہ لینا ہے تو دفتر میں ہیڈ کلرک سے ملو۔ میں کیا کروں!"

میں نے جواب دینے کے لیے زبان ہی کھولی تھی کہ انھوں نے اور بھی زور سے ناراض ہو کر کہا:

"میں کہتا ہوں نکل جاؤ میرے کمرے سے۔"

چپراسی میری طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ چپراسی ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر نکالتا، میں خود کمرے سے باہر آگیا۔ علی گڑھ کا تھا، اس لیے ہر گُر سے واقف تھا۔ باہر آکر میں نے چپراسی کو پوری بات بتائی اور اس کے ہاتھ بیگ صاحب کا خط ڈاکٹر صاحب کو بھیج دیا۔ خط پڑھتے ہی ڈاکٹر سروپ سنگھ کمرے سے باہر بھاگے ہوئے آئے۔ بہت معافی تلافی کی اور بتایا کہ داخلے کے لیے طلبہ نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مجھے اپنی میز پر لے گئے اور اپنے پاس بٹھا کر کچھ دیر تک بڑی محبت اور شفقت سے باتیں کیں۔ میرے بارے میں کچھ سوالات کیے اور ایک کلرک کو بلا کر کہا کہ انھیں ٹائم ٹیبل دے دیجیے۔ میں نے اسی دن سے کلاس لینی شروع کر دی۔ شام کو بیگ صاحب سے ملا اور انھیں خوش خبری دی تو انھوں نے کہا کہ تم ابھی مطمئن نہ ہو۔ لائبریری سائنس کا کورس بھی دلی یونیورسٹی سے کر لو۔ کیوں کہ موجودہ جگہ ایک تو پارٹ ٹائم ہے اور دوسری عارضی۔ بیگ صاحب ہی کے کہنے پر لائبریری سائنس میں داخلہ مل گیا اور میں نے بہت ہی اچھے نمبروں سے یہ امتحان پاس کر لیا۔ اسی دوران رام جس کالج میں بھی ایک پارٹ ٹائم جگہ نکلی۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ نے وہاں بھی میرا تقرر کروا دیا۔ جس کی وجہ سے میں غیر معمولی طور پر مصروف ہو گیا۔ دو کالجوں میں کلاس لینا اور یونیورسٹی میں لائبریری سائنس کی کلاس میں شرکت کرنا۔ لائبریری سائنس میں ایسے دوست تھے جو پروکسی کر دیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے میری حاضریاں بھی پوری ہو گئی تھیں۔ میں نے کروڑی مل کالج میں کچھ مشاعرے کیے، ایک آدھ جمتا ہوا سیمینار کیا، جس کی وجہ سے سروپ سنگھ صاحب اور کنور محمد اشرف بہت محبت کرنے لگے۔ میرا مستقل طور پر تقرر کیسے ہوا، یہ لمبی داستان ہے اور پھر کبھی سناؤں گا۔ مختصر یہ کہ میں کے۔ ایم کالج میں مستقل لیکچرر ہو گیا۔ اب ذرا مجھے فرصت ملی اور میری ادبی مصروفیات شروع ہو گئیں۔ میری سب سے پہلی کتاب "معراج العاشقین" ہے، جسے مکتبہ شاہراہ دہلی نے شائع کیا تھا اور جس کی رائلٹی مجھے ایک سو پچاس روپے ملی تھی۔ یہ کتاب ایک ناتجربہ کار طالب علم کی کوشش تھی، جس میں خاصی غلطیاں تھیں، لیکن اس کتاب کی بہت پذیرائی ہوئی جس سے میرا حوصلہ بلند ہوا۔ ان دنوں میں میرے عزیز ترین دوستوں میں اسلم پرویز کے علاوہ نثار احمد فاروقی صاحب بھی تھے۔ جو اب ماشاء اللہ اُردو، فارسی، انگریزی اور عربی کے زبردست عالم، مصنف اور پروفیسر ہیں۔ ہم تینوں ہر وقت ساتھ رہتے۔ اس وقت نثار صاحب صرف میٹرک پاس تھے۔ لیکن ان کی علمیت کا حال یہ تھا کہ انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے بہت سے لوگوں کی رہنمائی کی اور ایک آدھ طالب علم کا تحقیقی مقالہ اس طرح دیکھا کہ اگر وہ خود اپنے لیے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھتے تو اس سے بہت کم وقت میں لکھ لیتے۔ نثار صاحب نے انٹر میں داخلہ لیا اور

غیر معمولی شان دار نمبروں سے پاس ہوئے۔ بی۔ اے کیا۔ ایم۔ اے کیا۔ پی ایچ ڈی کیا اور اب ماشاء اللہ دلی یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ ہم ایک ریستوراں میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ نثار صاحب نے مشورہ دیا کہ غالب کی جو تحریریں مختلف رسالوں میں چھپی ہوئی ہیں، میں انھیں مرتب کر کے شائع کر دوں۔ بات سمجھ میں آگئی۔ میں نے بلا مبالغہ سیکڑوں رسالے کھنگالے اور غالب کی تحریریں اکٹھا کر کے "غالب کی نادر تحریریں" کے نام سے شائع کر دیں۔ یہ دراصل ایک چھوٹا سا کام تھا۔ لیکن یہ پیش قدمی تھی میرے اس بڑے کام کی، جو چار جلدوں میں "غالب کے خطوط" کے نام سے شائع ہوا اور جس کو ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے ادیبوں نے خراج تحسین پیش کیا۔

لیکچرر ہوتے ہی میں نے پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لیا۔ میرا موضوع تھا "مرزا مظہر جانِ جاناں" دراصل یہ موضوع مجھ پر شعبۂ اردو نے تھوپا تھا۔ مجھے اس میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن "حکم حاکم مرگ مفاجات" کے تحت میں نے اسی موضوع پر کام شروع کر دیا اور پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے میں نے ہندوستان کے بہت سے شہروں کا دورہ کر کے وہاں کی لائبریریوں سے استفادہ کیا۔ مرزا مظہر جاں جاناں کے لیے جو قلمی اور مطبوعہ تذکرے پڑھتا۔ ان میں سے سودا کے حالات بھی نوٹ کر لیتا۔ اس لیے جب میں نے پی ایچ ڈی کا تھیسس مکمل کر کے داخل کیا تو سودا پر کام شروع کیا اور سال بھر میں کتاب مکمل ہوگئی۔

میری خوش نصیبی تھی کہ ایک دن پروفیسر آل احمد سرور آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ ان دنوں میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے بتایا کہ سودا پر کام مکمل کیا ہے تو انھوں نے مسودہ دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ کچھ ہی دن بعد میں نے وہ مسودہ سرور صاحب کو علی گڑھ بھیج دیا اور دس پندرہ دن بعد سرور صاحب کا خط آیا کہ اگر میں چاہوں تو یہ کتاب انجمن ترقی اُردو شائع کر سکتی ہے۔ انھوں نے اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر آپ راضی ہو جائیں گے تو ایسے سب سے کم عمر ادیب ہوں گے جس کی کتاب انجمن ترقی اُردو شائع کرے گی۔

سرور صاحب کو شاید اس کا علم نہیں تھا کہ میرے لیے اس سے بڑا دنیا میں کوئی اعزاز نہیں ہو سکتا تھا کہ میری کتاب انجمن ترقی اُردو شائع کرے۔

سودا بہت خوبصورت انجمن ترقی اُردو سے شائع ہوگئی، جس کی وجہ سے اُردو دنیا میں مجھے خاصی شہرت حاصل ہوگئی۔

یہاں ایک قصہ بیان کر دوں کہ گورنمنٹ کا سرکلر کالج میں آیا کہ دو لیکچرر این۔ سی۔ سی کی ٹریننگ کے لیے فوراً درکار ہیں۔ میں اس وقت اتنا دبلا پتلا تھا کہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں ڈاکٹر سروپ سنگھ نے کالج کے ایک اور لیکچرر ڈاکٹر تارک ناتھ بالی کے ساتھ میرا نام بھی بھیج دیا۔ امیدواروں کا انٹرویو ہوا۔ میرا جب انٹرویو ہوا تو سلیکشن کمیٹی کے ایک کرنل صاحب نے مجھ سے کہا خاں صاحب آپ تو بہت دُبلے پتلے ہیں۔ جنگ کیسے کریں گے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے منتخب نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے میں نے بہت بے تکلفی سے کہا کہ لڑائی میں کشتی تھوڑی ہوتی ہے، جس کے لیے جسم کی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دماغ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ میرے پاس ہے۔ کرنل اور کمیٹی کے دوسرے لوگ زور سے ہنس پڑے۔ کرنل نے پھر پوچھا۔ آپ کے کوئی آدمی فوج میں گیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ہم روہیلے ہیں ہمارے آبا و اجداد سپاہی پیشہ تھے۔ اس خاندان میں ہمارے دادا پہلے آدمی تھے جو لکھ پڑھ کر خراب

ہوئے۔ ورنہ سب فوج میں جاتے تھے۔ ان جوابوں سے خوش ہو کر مجھے منتخب کر لیا گیا۔ کامپٹی میں جب ٹریننگ کے لیے گیا تو میڈیکل چیک اَپ ہوا۔ میرا وزن کم نکلا۔ جو حولدار صاحب وزن تول رہے تھے انھوں نے کہا آپ کو تو دہلی واپس جانا ہوگا۔ میں نے ان کے سامنے ہاتھ پیر جوڑے اور نہ جانے کس طرح سے میں نے درخواست کی کہ انھیں مجھ پر رحم آگیا اور مجھے پاس کر دیا۔ تین مہینے کی زبردست ٹریننگ ہوئی اور میں سکنڈ لیفٹننٹ ہو کر اور بہت اچھی صحت لے کر دہلی آگیا۔ میں کیپٹن ہو چکا تھا اور میجر ہونے والا تھا کہ شادی ہوگئی اور پھر این۔ سی۔ سی کی مصروفیات خاصی پریشان کُن ہوگئیں۔ میں نے تنگ آکر استعفا دے دیا۔

استعفے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میں آل انڈیا ریڈیو پر فارسی کا مترجم اور براڈ کاسٹر ہوگیا۔ مہینے میں پندرہ دن ریڈیو پر میری ڈیوٹی ہوتی تھی، چوں کہ مجھے اس کام میں بہت دلچسپی تھی اس لیے این۔ سی۔ سی کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوگیا تھا۔

۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر سروپ سنگھ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور گجرال کمیٹی کے رکن تھے۔ کمیٹی کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو رپورٹ لکھنے کے سلسلے میں علی جواد زیدی صاحب کی مدد کر سکتا۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ کی سفارش پر مجھے وزارتِ تعلیم میں ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے پر لے لیا گیا اور کچھ دن بعد ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔ گجرال صاحب، بتنے بھائی اور مالک رام صاحب وغیرہ میرے کاموں سے نہ صرف مطمئن بلکہ بہت خوش تھے۔ اس زمانے میں پروفیسر نورالحسن وزیر تعلیم تھے۔ ایک میٹنگ ہو رہی تھی جس کی صدارت نورالحسن صاحب کر رہے تھے۔ وہاں میٹنگ میں کسی کام کا ذکر آیا۔ نورالحسن صاحب نے کہا:

"ایسا مشکل کام کون کرے گا؟"

گجرال صاحب نے میرا نام لیتے ہوئے کہا کہ آپ کوئی کام بتائیے۔ یہ صاحب کریں گے اور پانچ چھ منٹ تک ایسا ماحول بن گیا کہ سب اراکین نے مجھے بلا کر کہا کہ آپ ترقی اُردو بورڈ میں ڈائرکٹر ہو کر چلے جائیے اور اگر چاہیں تو منسٹری میں رہ جائیے۔ کالج واپس جا کر کیا کریں گے۔ میں نے منسٹری کو ترجیح دی۔ کچھ دن بعد انجمن ترقی اُردو میں سکریٹری کی جگہ نکلی اور اس کی مجلس عاملہ میں تمام لوگ تقریباً وہی تھے، جو گجرال کمیٹی میں تھے۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ نے بتنے بھائی، مالک رام صاحب اور دوسرے لوگوں سے بات کی اور اس طرح بات کی کہ سب میرے حق میں ہوگئے اور باوجود اس کے کہ اس وقت کے بڑے بڑے سنیئر لوگ اس عہدے کے طلبگار تھے۔ میرا تقرر ہوگیا۔ میں جب انجمن میں آیا تو اُردو گھر کا ایک معمولی سا ڈھانچہ بنا ہوا تھا۔ دو سال سے کام بند تھا۔ اور دو ڈھائی لاکھ کے بلوں کی ادائیگی کرنی تھی۔ تقریباً ایک سال تک میں اندھیرے میں بھٹکتا رہا اور پھر کرنل بشیر حسین زیدی اور جسٹس آنند نرائن ملا صاحب کی سرپرستی میں ایسا راستہ نکل آیا کہ خدا کا شکر ہے کہ یہ پانچ منزلہ عمارت مکمل ہوگئی۔

زندگی کی داستان بہت لمبی ہے۔ میں نے یہاں صرف چند مختصر باتیں کہی ہیں۔ دو ایک باتیں میں اپنے ادبی ذوق کے بارے میں عرض کردوں کہ میں پہلے تنقید کے میدان میں آیا تھا، لیکن شاید خدا کو میرا نقاد ہونا منظور نہیں تھا، جب میں نے تنقیدی کتابیں پڑھنا شروع کیں تو خلیل الرحمن مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں ایسا مضمون لکھوں جس میں بتایا جائے کہ اردو نقادوں نے انگریزی تنقید سے کیا کچھ لیا ہے۔ میں نے اعظمی صاحب کی رہنمائی میں کام شروع کیا اور پانچ چھ مہینے میں ملک کے بڑے بڑے مقتدر نقادوں کی

پول کھل گئی۔ میں نے وہ اقتباس حاصل کر لیے جن کو اپنے نام سے ہمارے اُردو نقادوں نے اپنے مضامین میں شامل کیا تھا۔ یہ کام میں کافی عرصے تک کرتا رہا اور اتنا میٹریل اکٹھا ہو گیا کہ ڈھائی سو سے تین سو صفحات کی کتاب مرتب ہو جاتی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس میں ایسے ایسے بڑے بڑے لوگوں کے نام تھے اور ان میں سے بیشتر حضرات یونیورسیٹوں کے تھے۔ اگر وہ کتاب چھپتی تو مجھے ڈر تھا کہ میرا کیریئر ختم ہو جائے گا۔ اس لیے اپنی خود غرضی کی وجہ سے میں نے وہ کتاب شائع نہیں کی۔ اس کام کا فائدہ یہ ہوا کہ میں تنقید سے متنفر ہو گیا اور میرے دل میں نقادوں کی عزت باقی نہیں رہی۔

میں نے تحقیق کو اپنا میدان بنایا اور پتہ نہیں کہ میں نے کچھ کیا یا نہیں۔ لیکن یہ اطمینان ضرور ہے کہ خدا نے مجھے جتنی صلاحیتیں دی تھیں، میں نے ان کا پورا استعمال کیا ہے اور میں نے قلم کے تقدس کا ہمیشہ احترام کیا ہے اور کبھی کچھ ایسا نہیں لکھا، جس سے ذاتی مفاد حاصل ہو۔ حالاں کہ میں نے اپنے بیشتر ہم عصروں کو اس مرض میں مبتلا پایا۔

ہر انسان شہرت اور مقبولیت کا متمنی ہوتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے بھی اپنی شہرت کا خیال رہا ہے، لیکن میں نے شہرت حاصل کرنے کے لیے کبھی غلط طریقے اختیار نہیں کیے۔ کبھی کوئی مضمون لکھ کر دوسروں کے نام سے نہیں چھپوایا۔

اس وقت میری چالیس کے قریب کتابیں ہیں۔ تقریباً ساری کتابوں کا فرسٹ اڈیشن ختم ہو چکا ہے۔ کئی کتابوں کے دو دو تین تین اڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ سب میری ماں کی دعاؤں کا اثر ہے۔

غالب کے خطوط ۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم

اہلِ علم کی نظر میں

ڈاکٹر خلیق انجم نے دس بارہ سال کی لگاتار محنت سے چار جلدوں میں "غالب کے خطوط" مرتب کیے تھے۔ ان خطوط کی تین جلدیں غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہو چکی ہیں اور چوتھی جلد زیر طبع ہے۔ اس وقیع کام کی ہندوستان اور پاکستان میں جو شاندار پذیرائی ہوئی وہ اردو میں بہت کم کتابوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ ٹیلی ویژن اور آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس اور اردو مجلس کے پروگراموں میں اس کام پر آدھے آدھے گھنٹے کے مذاکرے نشر کیے گئے۔ ان مذاکروں میں رشید حسن خاں صاحب، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر کامل قریشی اور ڈاکٹر صلاح الدین نے شرکت کی۔ بے شمار رسالوں نے اعلا درجے کے تبصرے کیے۔ کچھ رسالوں نے اپنی سابقہ روایت کو نظر انداز کر کے اداریے لکھے۔ انگریزی اور ہندی کے بیشتر اخباروں نے "غالب کے خطوط" پر شان دار تبصرے شایع کیے۔ یہاں تمام تبصرے تو نقل کرنا مشکل ہے۔ کچھ تبصروں اور خطوط کے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

(م۔ ح۔ خ)

جناب مالک رام

غالب کے اردو خطوط ادبِ اردو کا سدا بہار سرمایہ ہیں۔ ان کے دو مجموعے "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" ان کی زندگی میں مرتب ہوئے۔ وہ بہت ہی مبارک دن تھا، جب ان کے بعض احباب کو ان خطوط کے جمع کرنے کا خیال آیا۔ آج جب ان کے بیشتر خطوط ہماری دسترس میں ہیں، اور ہم ان کی افادیت اور تاریخ نثر اردو میں ان کا مقام اور مرتبہ متعین کرنے کے موقف میں ہیں، ہم آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر خدا نخواستہ یہ خطوط ضائع ہو گئے ہوتے، تو یہ کتنا بڑا ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا۔

غالب اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت ہیں کہ اگرچہ ان کی وفات پر تقریباً سوا صدی گزر چکی ہے، لیکن آج بھی ان کی نئی نئی تحریریں، اور وہ بھی بیشتر ان کے اپنے قلم سے، منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں۔

یہ تمام مکتوبات مختلف مجموعوں میں یا مجلّوں میں محفوظ ہیں۔ لیکن اس امر کی اشد ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ اول تو انھیں ایک سلسلے میں بدوّن کیا جائے۔ اور پھر حتی الوسع انھیں تاریخ کتابت کے لحاظ سے مرتب کیا جائے۔ یہ کام صبر طلب بھی تھا، اور دقتِ نظر کا متقاضی بھی۔ خوشی کا مقام ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس مہم کے سر کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ انھوں نے برسوں کی محنت کے بعد تمام موجودہ خطوط کو چار جلدوں میں یکجا کر دیا ہے، ان کی تاریخ متعین کرنے کی کوشش کی ہے، خطوطِ غالب مالہٗ و ماعلیہ کے بارے میں تفصیلی حواشی قلمبند کیے ہیں؛ جہاں اصلی خط مہیا ہو گیا ہے، اس کا

عکس شائع کر دیا ہے۔

غرض، ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اب ہمیں خطوطِ غالب کا ممکنہ حد تک، ایک مکمل مجموعہ دستیاب ہو جائے گا۔ اس کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم پوری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔

جمیل الدین عالی

آپ نے کتنا بڑا کام کیا ہے۔ اب تک خطوطِ غالب پر اتنا بڑا کام میرے علم کی حد تک کسی ادارے نے نہیں کیا۔ کیا محنت ہے آپ کی شاید پہلی بار یہ ہوا ہے کہ کسی اردو متن کی تدوین جدید جرمن طریقے پر کی گئی ہے۔ جرمن اس معاملے میں پورے یورپ کے لیے مثال اور امریکہ سے بہت آگے ہیں۔ آپ کی تدوین جرمن انداز پر بالکل سائنٹفک ہے۔

(جمیل الدین عالی سکریٹری انجمن ترقی اردو پاکستان ایک خط سے اقتباس)

پروفیسر مختار الدین احمد

بہت دنوں سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ غالب کے خطوط کا ایک ایسا مکمل مجموعہ مرتب کر کے شایع کیا جائے جس میں اُن کے اردو کے اب تک کے دریافت ہوئے سارے خطوط مناسب ترتیب و تہذیب اور تصحیح و تحشیے کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیے جائیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ جناب خلیق انجم نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد اس اہم کام کو انجام تک پہنچایا۔ وہ اردو کے مشہور مصنف اور ممتاز محقق ہیں، ان کی غالب کے خطوط سے دلچسپی بہت قدیم ہے، اور غالب کی کم یاب تحریروں کا ایک مجموعہ غالب کی نادر تحریریں" (دہلی ۱۹۶۱ء) مرتب کر کے شائع بھی کر چکے ہیں۔ جناب خلیق انجم کا یہ معرکتہ الآرا کام چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد جو تقریباً پانچ سو صفحات پر ختم ہوتی ہے، اب چھپ کر شائقین کے سامنے ہے۔ اس میں ان کا لکھا ہوا تفصیلی مقدمہ ہے، پھر غالب کے منشی ہرگوپال تفتہ اور نواب علاء الدین خاں علائی کے نام کے خطوط درج ہیں۔

لائق مرتب نے خطوط کا صحیح متن پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اگر خطوط کی اصل غالب کے قلم کی لکھی ہوئی انھیں مل گئی ہے تو اس سے مطبوعہ خطوط کا مقابلہ کیا گیا ہے متن کے ماخذ کی نشان دہی کی گئی ہے، اختلافاتِ نسخ درج کیے گئے ہیں بڑی تعداد میں خطوط کا زمانۂ تحریر متعین کیا گیا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ ان خطوط پر مفید اور قیمتی حواشی سپردِ قلم کیے گئے ہیں۔ چار جلدوں میں اپنی نوعیت کے پہلے تحقیقی کارنامے کی ترتیب پر ڈاکٹر خلیق انجم اور اس کی اشاعت پر غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ہر طرح مبارک باد کی مستحق ہے۔

غالب کے خطوط' غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ غالب شناس اس کتاب کی وہ قدر کریں گے جس کی یہ مستحق ہے۔

جناب رشید حسن خاں

ڈاکٹر خلیق انجم نے اب سے کئی سال پہلے اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اور یہ خاکہ بنایا تھا کہ غالب کے سب اردو خطوں کو چار جلدوں میں مرتب کیا جائے۔ ان کے مجوزہ سلسلے کی پہلی جلد اب چھپ کر سامنے آئی ہے جس کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے اور آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات لکھ رہا ہوں کہ خلیق انجم صاحب نے بہت دل لگا کر اور نظر جما کر اس کام کو انجام دیا ہے۔ انھوں نے بہت صبر و تحمل کے ساتھ کئی سال صرف کیے متن کی تصحیح پر اور بہت سا وقت خرچ کیا متن سے متعلق حواشی لکھنے پر۔ انھوں نے ضروری مصادر اور ماخذ کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ قیاس نہیں، میں یہ بات ذاتی معلومات کی بنا پر لکھ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ انھوں کے تلاش و جستجو کا حق ادا کرنے کی ایماندارانہ کوشش کی ہے

اور جدید اصول تدوین کی روشنی میں متن کو مرتب کیا ہے۔

خلیق انجم صاحب ہم سب کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس داغِ رسوائی کو دھویا ہے کہ اردو میں خطوطِ غالب کا کوئی مکمل مجموعہ مرتب نہیں ہو سکا تھا۔ میں توقع کرتا ہوں کہ اس سلسلے کی باقی جلدیں بھی، اس پہلی جلد کی طرح، ترتیبِ متن کے تقاضوں کو پورا کریں گی اور اس طرح غالبیات کے ذخیرے میں ایک قابلِ ذکر اضافہ ہوگا۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی

مرزا غالب اردو کے عظیم شاعر ہی نہیں، بہت بڑے صاحبِ طرز نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بہت قابلِ قدر کام ہوئے ہیں لیکن نثر کا حق ابھی تک ادا نہیں ہوا تھا اس سلسلے میں سب سے اہم اور بنیادی کام یہ ہے کہ "خطوطِ غالب" کے قیمتی سرمایے کو پورے آدابِ تحقیق کے ساتھ مرتب کیا جائے۔ اس سلسلے میں مولوی مہیش پرشاد، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور غلام رسول مہر نے جو ابتدا کی تھی اس کی تکمیل ڈاکٹر خلیق انجم کے ہاتھوں سے ہوئی ہے۔ انھوں نے برسوں کی محنت اور دیدہ ریزی کے بعد خطوطِ غالب کو چار جلدوں میں فراہم کیا ہے۔ غالبیات میں انھوں نے اب تک جو کام کیے تھے وہ بھی ان کی سرخروئی کے لیے کافی تھے لیکن اس کارنامے نے انھیں غالب شناسوں کی صفِ اول تک پہنچا دیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

خلیق انجم کی غالبیات کے تقریباً تمام گوشوں پر ان کی نظر ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اور برصغیر سے باہر برطانیہ میں بھی انھوں نے اردو کے علمی ذخیروں کو اچھی طرح دیکھا بھالا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان کی جملہ مطبوعات اور تحقیقی و تنقیدی مباحث ان کی نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ وہ برسوں سے غالب کے اردو خطوط کی نئی تدوین میں مصروف تھے۔ مولوی مہیش پرشاد، امتیاز علی خاں عرشی، غلام رسول مہر، مالک رام اور آفاق حسین آفاقی نے اس سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کے بعد بھی نئے خطوط دریافت ہوتے رہے ہیں اور نئی بحثیں اٹھتی رہی ہیں اس سارے علمی سرمائے کا ازسرِ نو تحقیقی جائزہ لینے اور خطوطِ غالب کو نئی سائنٹیفک تدوین کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی۔ بارے اس اہم ذمے داری کا بیڑا ڈاکٹر خلیق انجم نے اٹھایا ہے۔ پہلی جلد میں تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے جس میں "اردوے معلیٰ" اور "عود ہندی" کے اولین اڈیشنوں سے لے کر اب تک شائع ہونے والے اردو خطوط کے تمام مجموعوں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور خطوطِ غالب کے لسانی اور ادبی پہلوؤں سے بحث بھی کی گئی ہے۔ منصوبے کے مطابق چار جلدوں میں خطوط کا متن پیش کیا گیا ہے اور ماخذ کی تفصیل اور اختلافِ نسخ حواشی میں دیے گئے ہیں۔ ان جلدوں کی اشاعت غالبیات کی تاریخ میں بنیادی نوعیت کا کارنامہ ہے۔ بلاشبہ اس علمی اقدام کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم پوری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

جب غالب شناسی کا ذکر آتا ہے تو ہمارے سامنے مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم اور قاضی عبدالودود مرحوم کا نام سامنے آتا ہے اور اسی کے ساتھ مالک رام صاحب، خدا ان کو سلامت رکھے کا نام سرِفہرست ہے۔ ان اساتذہ کے نام کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم کا نام غالب شناسی میں سب سے نمایاں ہے اور یہ غالب کا فیضان ہے کہ اپنے ماہرین کا سلسلہ ختم نہیں ہونے دیتا۔

گزشتہ دس بارہ برس سے انجم صاحب غالب کے اردو خطوط مرتب کرنے میں مصروف تھے خدا کا شکر ہے کہ چار جلدوں میں یہ عظیم الشان تاریخی کام شائع کیا جا رہا ہے۔ غالب کے اردو خطوط ۱۸۶۹ء سے لے کر اب تک مختلف صورتوں میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن غیر معمولی سائنٹیفک انداز میں خطوطِ غالب کا تنقیدی اور تحقیقی اڈیشن پہلی بار مرتب کیا گیا ہے۔

فہرستِ کتب ڈاکٹر خلیق انجم

۱ : معراج العاشقین، ۱۹۵۷ء، مُرتبہ

۲ : تاراس بلبا، ۱۹۵۷ء، مترجم انگلش سے اردو (ناول)

۳ : مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط، ۱۹۶۰ء مترجم فارسی سے اُردو

۴ : غالب کی نادر تحریریں، ۱۹۶۱ء، مرتبہ

۵ : بڑھے چلو: قومی نظموں کا انتخاب

۶ : مرزا محمد رفیع سودا، ۱۹۶۵ء، مصنف

۷ : متنی تنقید، ۱۹۶۷ء، مصنف

۸ : کربل کتھا کا لسانی مطالعہ، ۱۹۷۰ء، مرتبین ڈاکٹر خلیق انجم و پروفیسر گوپی چند نارنگ

۹ : اصنافِ ادب، ۱۹۷۰ء، مرتبین ڈاکٹر خلیق انجم و پروفیسر قمر رئیس

۱۰ : افاداتِ سلیم، ۱۹۷۲ء، مرتبہ

۱۱ : ضبط شدہ نظمیں، مرتبین ڈاکٹر خلیق انجم و مجتبیٰ حسین

۱۲ : غالب اور شاہانِ تیموریہ، ۱۹۷۵ء،

۱۳ : ابن الوقت، ۱۹۸۰ء، مرتبہ

۱۴ : فیض احمد فیض تنقیدی جائزہ، ۱۹۸۴ء، مرتبہ

۱۵ : سید سلیمان ندوی، ۱۹۸۵ء، مرتبہ

۱۶ : مشفق خواجہ ایک مطالعہ، ۱۹۸۵ء، مرتبہ

۱۷ : غالب کے خطوط (اول)، ۱۹۸۴ء، مرتبہ

۱۸ : 〃 (دوم)، ۱۹۸۵ء، مرتبہ

۱۹ : 〃 (سوم)، ۱۹۸۶ء، مرتبہ

۲۰ : 〃 (چہارم)، ۱۹۹۳ء، مرتبہ

۲۱ : رسوم دہلی، ۱۹۸۵ء، مرتبہ

۲۲ : مولانا ابوالکلام آزاد، ۱۹۸۶ء، مرتبہ

۲۳ : دلّی کی درگاہ شاہ مرداں، ۱۹۸۸ء مرتبہ

۲۴ : دلّی کے آثارِ قدیمہ، ۱۹۸۸ء مرتبہ

۲۵ : انتخاب خطوطِ غالب، ۱۹۸۹ء، مرتبہ

۲۶ : محی الدین قادری زور، ۱۹۹۰ء مرتبہ

۲۷ : آثار الصنادید (تین جلدوں میں) ۱۹۹۰ء، مرتبہ

۲۸ : جوش ملیح آبادی (تنقیدی جائزہ)، ۱۹۹۲ء مرتبہ

۲۹ : اختر انصاری: شخص اور شاعر، ۱۹۹۰ء، مرتبہ

۳۰ : مولوی عبدالحق: ادبی اور لسانی خدمات، جلد اول ۱۹۹۲ء، مرتبہ

۳۱ : مرقع دہلی، ۱۹۹۳ء، مرتبہ

۳۲ : ڈاکٹر فرمان فتحپوری (شخصیت اور ادبی خدمات) ۱۹۹۲ء، مرتبہ

۳۳ : پروفیسر آل احمد سرور (شخصیت اور ادبی خدمات) ۱۹۹۲ء، مرتبہ

۳۴ : خواجہ احمد فاروقی (شخصیت اور ادبی خدمات) ۱۹۹۳ء مرتبہ

۳۵ : جگن ناتھ آزاد: حیات اور ادبی خدمات، ۱۹۹۳ء، مرتبہ

۳۶ : مولوی عبدالحق: ادبی اور لسانی خدمات (جلد دوم) ۱۹۹۳ء، مرتبہ

۳۷ : حسرت موہانی، ۱۹۹۴ء، مصنف

۳۸ : پنڈت آنند نرائن مُلّا کی ادبی خدمات، ۱۹۹۵ء، مرتبہ

۳۹ : انتخاب کلام حسرت موہانی، ۱۹۹۵ء، مرتبہ

۴۰ : قاضی عبدالغفار، ۱۹۹۵ء، مرتبہ

۴۱ : سرسید: ایک کثیر الجہات شخصیت، ۱۹۹۵ء، مرتبہ

۴۲ : فنِ ترجمہ نگاری، ۱۹۹۵ء، مرتبہ

۴۳ : مولوی عبدالحق (بچوں کے لیے)

زیرِ طبع کتابیں

۴۴ : اقبال اور تقسیم ہند

۴۵ : جوش کے خطوط

۴۶ : آصف علی ایک ادیب ایک سیاست داں

سوانحی خاکہ ڈاکٹر خلیق انجم

پورا نام بچپن میں غلام احمد نام تھا لیکن دوسری یا تیسری کلاس میں نام بدل کر خلیق احمد خاں کر دیا گیا۔ خلیق صاحب کا کہنا ہے کہ کلاس میں لڑکے "غلام" کہہ کہہ کر چھیڑتے تھے اس لیے والدین نے نام بدل دیا۔

وطن دلی ۔۔۔ دادا رام پور سے دلی کسی کام کے سلسلے میں آئے تھے پھر نہ جانے کن وجوہ سے یہیں سکونت اختیار کر لی۔

والد کا نام محمد احمد مرحوم

والدہ کا نام مرحومہ قیصر سلطانہ

دادا کا نام اصغر خاں ـــــ پر دادا کا نام ثمر خاں

بہن بھائی بھائی کوئی نہیں، پانچ بہنیں ہیں، طلعت سعید، ثریا اسلم، حمیدہ اختر رشید، ذکیہ ای۔ حق، عذرا انجم (انھیں خلیق صاحب کی والدہ نے گود لیا تھا۔) خلیق صاحب کے بہنوئیوں کے نام ہیں۔ احمد سعید، ڈاکٹر اسلم پرویز، اختر رشید، احسان الحق اور منصور احمد۔ **تاریخ ولادت** ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۵ء

تعلیم ہائی اسکول تک اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول دہلی، انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے ۱۹۵۵ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ ایم۔ اے ۱۹۵۷ء دلی یونیورسٹی۔ ڈپلوما ان لینگوسٹک ۱۹۶۰ء۔ ڈپلوما ان لائبریری سائنس ۱۹۶۱ء۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ۱۹۶۲ء (آخری تین ڈگریاں دلی یونیورسٹی سے حاصل کیں۔)

ملازمت ۱۹۵۷ء میں کروڑی مل کالج میں لکچرر مقرر ہوئے اور اس سے پہلے بہت سی چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کی تھیں۔ ۱۹۷۲ء کے اواخر میں وزارت تعلیم میں ڈپٹی ڈائرکٹر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور کچھ ہی دن بعد ڈائرکٹر بنا دیے گئے۔ ۱۹۷۴ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے اور ابھی تک اس عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ ۴ سال تک آل انڈیا ریڈیو میں دری (افغانستانی فارسی) کے مترجم اور براڈ کاسٹر رہے۔ ادبی تبصرے، سیکولر ڈیموکریسی، ہماری زبان اور اردو ادب کے اڈیٹر رہے۔ آخری دو رسالے کے اڈیٹر اب بھی ہیں۔ علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ سے نکلنے والے ایک ماہنامہ "جھلک" کے سب اڈیٹر بھی رہے تھے۔

انعامات حکومت اتر پردیش، ہندوستان کی مختلف اکیڈمیوں، دوسرے ادبی اداروں سے بارہ انعام مل چکے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا انعام پرویز شاہدی قومی انعام ہے جو ۱۹۸۵ء میں ملا تھا۔

شادی ۱۹۶۸ء میں شادی ہوئی تھی۔ ان کی بیگم ڈاکٹر پروفیسر موہنی انجم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈپارٹمنٹ آف سوشیالوجی میں پروفیسر ہیں۔

اولاد دو بچے ہیں۔ سیما انجم اور ثمر انجم۔

رکنیت بہت بڑی تعداد میں ایسی ادبی اور صحافتی تنظیمیں ہیں جن کے خلیق صاحب صدر، سکریٹری یا رکن ہیں۔